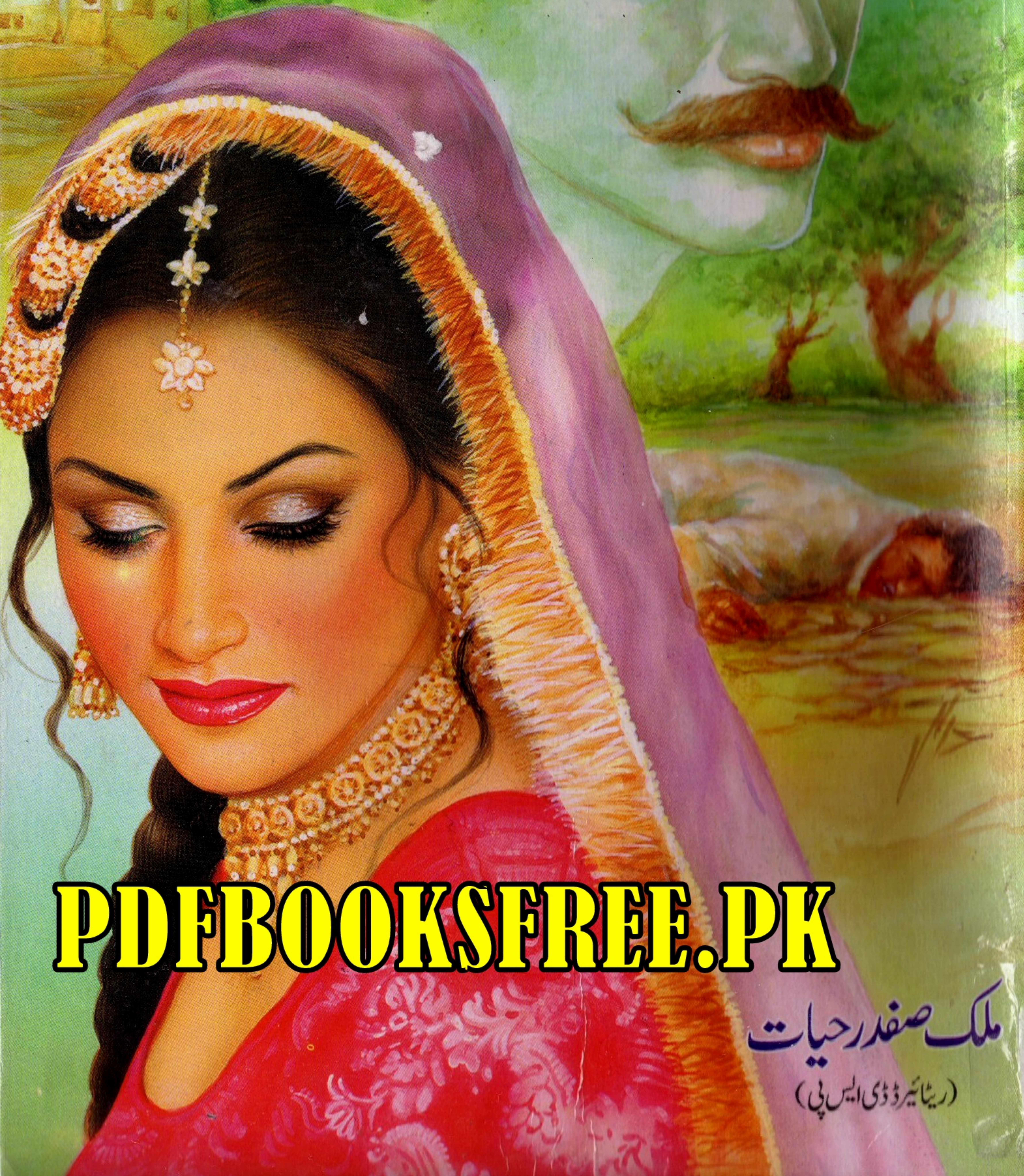
فریبِ حسن



ملک صفدر حیات
(ریٹائیرڈ ڈی ایس پی)

فریبِ حُسن

وہ دہرے قتل کی ایک لرزہ خیز واردات تھی! اطلاع ملتے ہی میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ مئی اختتام پر تھا۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ دوپہر اگرچہ ڈھل چکی تھی لیکن موسم کی شدت کے باعث یونہی محسوس ہوتا تھا، سورج سر پر ٹھہر گیا ہو!

دہرے قتل کی وہ واردات چودھری غنی کے ڈیرے پر ہوئی تھی۔ چودھری غنی کا تعلق موضع ٹبی سے تھا اور مذکورہ ڈیرا، گاؤں کے جنوب میں تا حدِ نگاہ پھیلے ہوئے کھیتوں کے درمیان واقع تھا۔ ان دنوں میں قصبہ نجیب آباد میں تعینات تھا۔ یہ قصبہ موضع ٹبی سے نزدیک ہی تھا۔ ہم ایک تانگے پر سوار ہو کر پہلے ٹبی آئے پھر چودھری غنی کے ساتھ اس کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔

وہ ڈیرا نیچی چھتوں والے تین کمروں اور ایک کشادہ صحن پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں مختلف زرعی آلات اور کچھ ناکارہ سامان بھرا ہوا تھا۔ دوسرا کمرا ٹیوب ویل کے لئے مخصوص تھا۔ جب کہ تیسرے کمرے کی سیٹنگ سے اندازہ ہوتا تھا، اسے بطور رہائش استعمال کیا جاتا تھا۔ کمرے میں ایک بڑی چارپائی کے علاوہ ایک چھوٹی میز اور دو کرسیاں بھی موجود تھیں ...... دونوں مقتولین کی لاشیں مذکورہ چارپائی پر پڑی تھیں۔ لاشوں کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا جو ایک طرف سے خون آلود تھی۔

میں چارپائی کی طرف بڑھا تو چودھری غنی اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ایک منٹ ملک صاحب!'' میں رک کر سوالیہ نظر سے چودھری کو دیکھنے لگا۔

اس ڈیرے پر نصف درجن سے زیادہ افراد جمع ہو گئے تھے اور مزید بھی آ رہے تھے۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس نے گاؤں میں ایک کھلبلی سی مچا دی تھی۔ چودھری نے وہاں موجود لوگوں کو کمرے سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

پلک جھپکتے میں کمرا خالی ہو گیا۔ صرف میں، چودھری اور کانسٹیبل ساجد اس کمرے میں

رہ گئے۔ چودھری نے کانسٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کاکا! تم بھی تھوڑی دیر کے لئے باہر جاؤ۔''

ساجد کی عمر بیس کے قریب تھی لیکن وہ اپنی صحت اور چہرے کی معصومیت کے باعث چودہ پندرہ سال کا لڑکا دکھائی دیتا تھا، اسی لئے چودھری غنی نے اسے کاکا بہ معنی بچہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

ساجد نے متذبذب نظر سے میری طرف دیکھا، پھر میری نگاہ میں تائیدی تاثر کو پا کر وہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ چودھری نے دروازے کے کواڑ بھیڑے اور میری جانب مڑتے ہوئے بولا۔

''دراصل ان دونوں کی حالت ایسی نہیں کہ کمرے میں تماشا لگایا جائے۔''

اس کا اشارہ چارپائی پر رکھی لاشوں کی سمت تھا۔ میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چارپائی کے نزدیک آ گیا۔ اسی لمحے چودھری غنی نے چادر کو ایک کونے سے پکڑ کر لاشوں کے اوپر سے کھینچ لیا۔

میری نگاہ ایک شرم ناک منظر سے متصادم ہوئی اور بے اختیار جھک گئی۔

وہ مرد و زن کی دو لاشیں تھیں، ایک دوسرے کے اوپر لدی ہوئی۔ ان کے جسم لباس سے عاری تھے۔ عقل مند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے تاہم ان کی کیفیت کو سمجھنے کے لئے کسی خاص عقل یا واضح اشارے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ فطری لباس میں وہ دونوں اپنی کہانی خود بیان کر رہے تھے۔

''میں نے اسی لئے مجمع کو باہر نکالا ہے!'' چودھری کی بوجھل اور دھیمی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کون ہیں یہ دونوں؟''

''مشتاق تو میرا نوکر ہے۔'' اس نے مرد کی لاش کی جانب اشارہ کیا۔ ''ادھر ڈیرے پر ہی ہوتا ہے'' پھر وہ عورت کے بارے میں بتانے لگا۔ ''یہ شگی ہے...... صغریٰ عرف شگی۔ بشارت کی بیوی۔''

''ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟'' بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

چودھری معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''آپ خود ہی دیکھ لیں۔''

میں گمبھیر انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

چودھری نے لوگوں کو جائے وقوعہ سے ہٹا کر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ واقعی مقتولین

کے منظر کو عام نمائش کے لئے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت میرا پورا بدن پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ یہ موسم کی شدت کا نہیں بلکہ حالات کی حدت کا نتیجہ تھا۔ بہرحال، موقع کی کارروائی بہت ضروری تھی اس لئے میں بڑے محتاط طریقے سے ان لاشوں کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔

پندرہ منٹ کے تنقیدی جائزے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مشتاق اور شگی کو ان کی بے خبری میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ یہ بے خبری ان کی بے گانگی اور ''خشوع و خضوع'' کا نتیجہ بھی ہو سکتی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان دونوں کے جسموں میں کسی پوری طرح بھرے ہوئے ریوالور کو خالی کر دیا گیا تھا۔ دونوں کے ابدان کے بالائی حصے خون میں نہائے ہوئے تھے۔ یہ واردات بادی النظر میں کسی شدید انتقامی کارروائی کا نتیجہ دکھائی دیتی تھی۔

شگی اور مشتاق کی خوں چکاں لاشوں کو دیکھ کر مجھے دلی افسوس ہوا۔ شگی اگرچہ اب زندگی سے بہت دور جا چکی تھی تاہم اس کے چہرے کے نقوش اسے غیر معمولی حسین ظاہر کرتے تھے۔ مشتاق بھی ایک وجیہہ و شکیل مرد تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ان دونوں کی لاشوں کو دوبارہ سفید، خون آلود چادر سے ڈھانک دیا۔

''یہ کس کا کارنامہ ہو سکتا ہے؟'' میں نے چودھری غنی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ اپنی ایک ٹانگ کو دباتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو آپ پتہ چلائیں گے جناب۔''

''آپ کا ذہن کیا کہتا ہے؟''

''میرا ذہن تو بشارت کی طرف جا رہا ہے۔''

''یعنی شگی کے شوہر کی طرف؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ دوبارہ اپنی ٹانگ کو مسلتے ہوئے بولا۔ ''ایسی غیرت مندی کی کارروائی کوئی شوہر ہی کر سکتا ہے ملک صاحب!''

''کیا بشارت سے اس بارے میں کوئی پوچھ گچھ کی گئی ہے؟''

''میں نے اس کی طرف بندہ دوڑایا تھا۔'' چودھری نے بتایا۔ ''لیکن وہ گھر پر نہیں ملا۔''

''اس کا مطلب ہے، بشارت کو ابھی تک اس واقعے کی اطلاع نہیں ملی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

چودھری بولا۔ ''ملک صاحب! اگر میرا ذہن صحیح خطوط پر سوچ رہا ہے تو پھر عین ممکن ہے بشارت خود ہی کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہو!''

چودھری نے معنی خیز انداز میں بات مکمل کی تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ وہ بشارت کو سنگی اور مشتاق کا قاتل سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''چودھری صاحب! آپ اس واردات کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔'' اس کا ہاتھ ایک مرتبہ پھر دائیں ٹانگ کی جانب چلا گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کی ٹانگ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟''

''ہاں، پچھلے دنوں سے یہ مسئلہ شروع ہوا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''حکیم اسے عرق النسا کہتا ہے۔'' پھر وہ بڑے بھونڈے انداز میں بولا۔ ''پتہ نہیں، کس کم بخت کا عرق مجھے تکلیف پہنچانے اس ٹانگ میں آ بیٹھا ہے۔ بہر حال......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس کے عامیانہ بیان پر جب کوئی تبصرہ نہ کیا تو وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

''میں تو ادھر اپنی حویلی میں آرام کر رہا تھا۔ مراد گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور بتایا کہ ڈیرے پر کسی نے مشتاق اور سنگی کو قتل کر دیا ہے۔ میں حویلی سے ڈیرے پر آیا اور ان دونوں کی لاشوں کو خون میں لت پت پڑے دیکھ کر پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، وہ کس ڈرامے کے کردار بنے ہوئے تھے۔ میں نے ہی مراد کو حکم دیا کہ وہ لاشوں کو چادر سے ڈھک دے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک بندے کو بشارت کی طرف دوڑایا۔ وہ گھر میں نہ ملا اور نہ ہی کھیتوں میں کہیں نظر آیا۔ میرا بھیجا ہوا بندہ ناکام لوٹ آیا۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پھر میں حویلی چلا گیا اور منظورے کو آپ کی طرف بھیج دیا تاکہ آپ موقع پر پہنچ کر قانونی کارروائی کر سکیں۔ اور ہاں ...... مشتاق کی بیوی کو بھی اطلاع دے دی گئی ہے۔ اس نے اپنے گھر میں رونا پیٹنا ڈال رکھا ہے۔ وہ ایک مرتبہ یہاں سے بھی ہو کر گئی ہے لیکن میری ہدایت کے مطابق مراد نے اسے کمرے میں نہیں گھسنے دیا۔'' پھر رک کر وہ مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''آپ ہی بتائیں، ایک بیوی کا اپنے شوہر کو اس حالت میں دیکھنا کیا مناسب ہے؟''

''قطعی مناسب نہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

چودھری بولا۔ ''بلقیس، مراد سے بحث و تکرار کرتی رہی لیکن وہ میری تاکید کے مطابق ایک ہی بات پر ڈٹا رہا کہ پہلے پولیس اپنی ضروری کارروائی کرے گی پھر کسی کو لاشوں تک

جانے دیا جائے گا۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا؟''

''آپ نے جتنا کیا، یہ بھی کافی ہے۔'' میں نے چودھری غنی کے خاموش ہونے پر کہا پھر پوچھا۔ ''کیا مراد نامی وہ بندہ باہر موجود ہے؟''

وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''نہیں جناب! وہ اس وقت ادھر گاؤں میں ہے۔'' پھر ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! آپ وقوعہ کی کارروائی سے فارغ ہو کر میری حویلی میں آ جائیں۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ میں عرق النسا کی وجہ سے بہت پریشان ہوں اس لئے مجھے اجازت دیں۔ میں حویلی میں جا کر آرام کروں گا۔''

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! آپ جائیں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

چودھری ڈیرے سے رخصت ہوا تو میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ساجد کو میں نے کمرے کے دروازے پر متعین کر دیا تاکہ میری اجازت کے بغیر کوئی اس کمرے میں داخل نہ ہو۔ باہر موجود آٹھ نو افراد اندر آنے اور لاشوں کا نظارہ کرنے کے لئے بے چین تھے۔ اس بے چینی کو میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنے فطری تجسّس سے مجبور تھے۔ اس پر مستزاد واردات کی نوعیت تھی جو ان کے اشتیاق کو بڑھانے کا باعث تھی۔ تاہم میں نے انہیں ڈیرے کے صحن تک محدود کر دیا۔

لاشوں کا میں تفصیلی معائنہ کر چکا تھا لہٰذا پہلی فرصت میں انہیں ضلعی ہسپتال پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ مشتاق اور سنگی کی لاشیں اگر جائے وقوعہ سے ہٹ جاتیں تو وہاں موجود لوگوں کی بے چینی اور تجسّس کو بھی قرار آ جاتا، وہ صبر کر کے بیٹھ جاتے۔ سرکاری ہسپتال کے آپریشن تھیٹر تک ان کی رسائی ممکن نہیں تھی۔

جو شے رسائی میں نہ ہو اس پر صبر آ ہی جاتا ہے!

میں نے کانسٹیبل ساجد کو بھی لاشوں کے ساتھ ہی ہسپتال بھیج دیا۔ ساجد ایک ذہین اور معاملہ فہم اہل کار تھا۔ اس کی پولیس سروس کا عرصہ چند سال پر محیط تھا لیکن مجھے اس سے بڑی امیدیں تھیں۔ مجھے یقین تھا، وہ آگے جا کر بہت ترقی کرے گا۔ بر سبیلِ تذکرہ ...... بعد میں ساجد تھانہ انچارج بننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں اس کمرے کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ وہ بارہ ضرب پندرہ فٹ کا ایک عام سا نیچی چھت والا کمرا تھا۔ جس میں دروازے کے علاوہ دو پٹ والی ایک کھڑکی بھی موجود تھی۔ مذکورہ کھڑکی کمرے کی عقبی جانب کھلتی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر کا جائزہ

لیا۔ کمرے کی عقبی سمت دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ نظر آتا تھا۔ ڈیرے سے چند گز کے فاصلے پر ایک نہر گزرتی تھی جو بل کھاتی ہوئی شمال کی سمت چلی جاتی تھی۔ میں چند لمحات تک وہ قدرتی اور فطری منظر دیکھتا رہا پھر کھڑکی کو بند کر دیا۔ مذکورہ کھڑکی کا سائز تین ضرب پانچ فٹ رہا ہو گا اور اس میں کسی قسم کی آہنی سلاخیں یا جالی وغیرہ نصب نہیں تھی۔

اس کمرے کے مزید جائزے میں مجھے صرف دس منٹ لگے۔ جس چارپائی پر سے مشتاق اور سُگی کی لاشیں اٹھائی گئی تھیں اس پر کوئی بستر وغیرہ نہیں بچھا ہوا تھا لہٰذا وہ چارپائی بھی جا بجا خون آلود ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ کمرے کا کچا فرش بھی، چارپائی کے نیچے خون آلود تھا۔ تاہم وہاں گرنے والا خون جم کر خشک ہو گیا تھا۔ آلۂ قتل کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ اس کمرے سے اور بھی کوئی ایسی چیز دستیاب نہ ہوئی جو اس واردات پر روشنی ڈال سکتی۔

میں اس کمرے میں ضروری کارروائی کے بعد باہر نکل آیا اور دروازے کو بند کر کے کنڈی لگانے کے بعد دوسرے کمروں کی جانب بڑھ گیا۔ صحن میں موجود لوگوں کے چہرے تجسّس سے چمک رہے تھے۔ انداز و اطوار میں بے چینی پائی جاتی تھی اور آنکھوں میں سنسنی آمیز سوالات جھلکتے تھے۔ میں نے ان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور ایک پکی عمر کے شخص کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ مجھے ایک سمجھ دار اور بردبار آدمی لگا تھا اور اسی معقولیت کے باعث میں نے اس کا انتخاب بھی کیا۔

مذکورہ شخص میکانکی انداز سے میرے قریب پہنچا اور با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''چاچا! تمہارا نام کیا ہے؟''

''جی رحمت ...... رحمت علی!'' اس نے جواب دیا۔

''رحمت علی! تم پر اللہ کی رحمت ہو۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم بھی موضع ٹبی ہی میں رہتے ہو؟'' میں نے اپنی آواز کو حتیٰ الامکان دھیما رکھا تھا۔

''جی سرکار!'' اس نے اپنی آنکھوں کو اثباتی جنبش دی۔

''کرتے کیا ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب وہی سب کچھ کرتے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرے بیٹے کہتے ہیں، ابا آرام کرو اور خوب گھومو پھرو۔ کام ہم کریں گے۔''

''خوش قسمت ہو چاچا رحمت۔'' میں نے فرطِ جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔ ''ایسی فرمانبردار اور صالح اولاد تو کسی کسی کے نصیب میں آتی ہے۔''

''بس جی، اللہ کا کرم ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''بزرگوں نے اولاد کے سلسلے میں ایک

ہی ٹوٹکا بتایا تھا۔ اس ٹوٹکے پر عمل کیا ہے اور نتیجہ سو فیصد پایا ہے۔''

''چاچا! وہ ٹوٹکا مجھے بھی بتا دو۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ بھی بچوں والے ہیں؟'' اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''شادی تو ہو گئی ہے ناں؟''

''اس زمانے میں، میں غیر شادی شدہ تھا چنانچہ میں نے رحمت علی کے جواب میں ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور کہا۔

''شادی نہیں ہوئی تو ہو بھی جائے گی ...... اور شادی کے بعد ظاہر ہے، بچے بھی ہوں گے۔ لہٰذا تم مجھے وہ مفید ٹوٹکا بتا ہی دو ...... اگر سمجھ میں آ گیا تو نیک اور صالح اولاد پیدا کرنے کے لئے اس پر عمل بھی کروں گا۔''

''وہ ٹوٹکا اتنا سادہ اور آسان ہے کہ سب کی سمجھ میں نہیں آتا!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز میلوں دور سے آ رہی ہو۔ ''اور ...... آپ کے سامنے زبان کھولتے ہوئے مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے۔''

رحمت علی بہت گہرا شخص تھا۔ ہمیں دھیمے لہجے میں باتیں کرتے دیکھ کر وہاں موجود دیگر افراد بڑی بے کلی کا شکار نظر آتے تھے لہٰذا میں نے اس مشکل کا حل نکالتے ہوئے رحمت علی سے کہا۔

''چاچا رحمت! تم میرے ساتھ آؤ۔''

پھر میں نے دوسرے کمرے کی سمت قدم بڑھا دیئے۔ رحمت بھی میری تقلید کرتے ہوئے اس کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ اس کمرے میں مختلف نوعیت اور استعمال کے زرعی آلات کے علاوہ ناکارہ سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے کمرے کا معائنہ اور آلۂ قتل کی تلاش جاری رکھتے ہوئے رحمت علی سے پوچھا۔

''چاچا! بڑی عجیب بات کی ہے تم نے۔ جب وہ ٹوٹکا اتنا سادہ ہے تو پھر لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟'' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور سب سے پہلے تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ میرے سامنے زبان کھولتے ہوئے تم خوف زدہ کیوں ہو؟''

میرے دوستانہ رویے نے اس کی ہمت بندھائی اور وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''وہ ...... دراصل آپ پولیس والے ہیں ناں!''

''پولیس والا ہوں ...... تو؟'' میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں نے سنا ہے، پولیس والوں کو اوپر کی بہت آمدنی ہوتی ہے!"

"اللہ کا شکر ہے، میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں۔"

اس نے حیرت اور بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں چاچا!"

"تو پھر مجھے نہیں ڈرنا چاہئے۔"

"ہاں، ہاں ...... بولو؟"

رحمت علی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرے بزرگوں نے نصیحت کی تھی کہ بیوی اور بچوں کو ہمیشہ رزقِ حلال کھلانا، میں نے تو ساری زندگی اسی سادہ سے ٹوٹکے پر عمل کیا ہے اور اللہ کا شکر ہے، بڑھاپا بڑے آرام وسکون سے گزر رہا ہے۔"

میں نے بے ساختہ کہا۔ "تمہارا بڑھاپا اور تمہاری اولاد کی جوانی!"

رحمت علی نے ایک آفاقی حقیقت بیان کی تھی جس سے انکار کرنے والا معقولیت کے دائرے سے باہر کھڑا نظر آتا ہے۔ میں خود ذاتی طور پر اس حقیقت کے عملی تجربے سے گزرا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ کرم ہے کہ اس وقت نانا اور دادا جیسے ٹائٹل سنبھالے بیٹھا ہوں مگر مجال ہے، مجھے اولاد کی طرف سے اور ان کی اولاد کی طرف سے کسی پریشانی کا سامنا ہو۔ اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش پیدا نہیں کی جاسکتی کہ حصولِ رزقِ حلال عین عبادت ہے!

میری تلاش اور جستجو دوسرے سے تیسرے کمرے میں پہنچی مگر وہاں بھی مجھے کوئی کامیابی نہ مل سکی۔ مذکورہ کمرے میں ٹیوب ویل کے انجن، تیل والے ڈرم اور انجن کے مختلف پُرزہ جات کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم پوری تیاری کے بعد تھانے سے روانہ ہوئے تھے۔ میرے دستی تھیلے میں ہتھکڑی اور دیگر ضروری اشیاء کے علاوہ ایک سرکاری تالا بھی موجود تھا۔ میں نے اس کمرے پر سرکاری تالا ڈال دیا جہاں سے مقتولین مشتاق اور شگی کی ناقابل تبصرہ لاشیں ملی تھیں۔ اس سرکاری مُہر کے بعد کوئی اس دروازے کو کھولنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے موقع پر موجود افراد سے پوچھ تاچھ کی لیکن کام کی کوئی بات سامنے نہ آسکی۔ رحمت علی کو میں نے آخر کے لئے رکھا تھا۔ ڈیرے پر ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں رحمت علی کے ساتھ موضع ٹبی کی طرف چل پڑا۔ وہ ڈیرا گاؤں سے بہ مشکل دس منٹ کے پیدل فاصلے پر تھا۔

ڈیرے سے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے میں نے رحمت علی سے درجن بھر اہم سوال کئے جن کے اس نے تسلی بخش جواب دیئے۔ اس سے میری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ میں آگے چل کر یہ انکشاف مناسب مواقع پر کرتا جاؤں گا۔ آپ اسے کہانی نویسی کا تقاضا سمجھ لیں!



چودھری غنی نے مجھ سے کہا تھا کہ جائے واردات سے فارغ ہونے کے بعد میں سیدھا حویلی میں آؤں لیکن میں نے پہلے بشارت کی "خبر گیری" ضروری سمجھی۔ چودھری ہی کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ بشارت گھر میں موجود تھا اور نہ ہی کھیتوں میں کہیں دکھائی دیا تھا...... بہرحال، پوچھتے پاچھتے میں بشارت کے گھر تک پہنچ گیا۔

بشارت کا گھر لگ بھگ گاؤں کے وسط میں واقع تھا اور اس کے دروازے پر پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اندر بہت سے لوگ موجود ہیں۔ میں نے متعدد افراد کے آپس میں تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں سنی۔ میری دستک کے جواب میں درمیانے قد کے ایک شخص نے دروازہ کھولا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ گھبرا گیا۔ اس کے ردِّعمل نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"کیا بشارت تمہارا ہی نام ہے؟" میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

میں یہی سمجھا تھا، بشارت گھر آ گیا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والی گھبراہٹ بھی اسی جانب اشارہ کرتی تھی۔ اس شخص نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"میں فرمان ہوں جی ...... بشارت کا سانڈو۔ (ساڑھو)۔"

"بشارت کو باہر بھیجو۔" میں نے فرمان سے کہا۔ "کیا وہ گھر میں ہے؟"

بشارت کے ہم زلف نے جواب دیا۔ "وہ تو ابھی گھر نہیں پہنچا۔ ہم بھی اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"وہ ادھر کھیتوں میں بھی نہیں۔" میں نے فرمان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلا گیا ہے وہ؟"

"ہمیں کچھ خبر نہیں اس کی۔" وہ سراسیمہ نظر سے دائیں بائیں گلی میں دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "آپ اندر آجائیں جناب! تھوڑی دیر آپ اور یہاں کھڑے رہے تو گلی میں میلہ لگ جائے گا۔"

"تمہارے ساڑھو نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ میلہ تو لگنا ہی ہے نا۔" میں نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا، بشارت ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔" تھوڑی دیر بعد میں بشارت کی بیٹھک میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ میرے علاوہ فرمان اور اس کی بیوی کبریٰ بھی وہاں موجود تھے۔ اپنے تین بچوں کو انہوں نے گھر کے اندرونی حصے تک محدود کر دیا۔ میری آمد سے قبل اس گھر کے اندر جو پاس پڑوس والے جمع تھے فرمان نے انہیں رخصت کر دیا۔

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ "میں قصبہ نجیب آباد کا تھانہ انچارج ہوں۔ آپ لوگوں کا گاؤں موضع ٹبی میرے تھانے کی حدود میں آتا ہے۔"

فرمان نے بڑے سنجیدہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولا مگر اس کی بیوی کبریٰ خاموش نہ رہ سکی۔ وہ احتجاجی لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوئی۔ اس کی آواز میں گہرا دکھ رچا بسا تھا۔

"تھانے دار صاحب! آپ نے قانونی کارروائی میں اتنی جلدی کیوں کی؟ کم از کم بشارت کے آنے کا انتظار تو کر لیتے۔ لاشیں تو بعد میں بھی ہسپتال بھجوائی جا سکتی تھیں۔ میں تو اپنی بہن کا منہ بھی نہیں دیکھ سکی۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"بے وقوفی کی باتیں نہ کر کبریٰ!" فرمان نے بڑے نرم انداز سے اسے سرزنش کی۔ "کوئی شرم حیا ہے کہ نہیں۔ اس حالت میں تم شگی کا منہ دیکھ کر کیا کرتیں؟"

ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ حالات کی نزاکت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ میں کبریٰ کے دکھ کو سمجھ رہا تھا۔ کچھ بھی تھا، بہرحال صغریٰ عرف شگی اس کی چھوٹی بہن تھی جو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔

"یہ ایسا واقعہ ہے کہ مقتولین کی لاشوں کو زیادہ دیر تک جائے واردات پر رکھ کر تماشا نہیں بنایا جا سکتا تھا۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اوپر سے شدید گرمی کا موسم بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا بہرحال......"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کبریٰ کی طرف دیکھا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "فکر نہ کرو، پوسٹ مارٹم کے بعد مقتولین کی لاشیں ان کے ورثاء کے حوالے کر دی جائیں گی۔ پھر تدفین سے پہلے تم جی بھر کر اپنی بہن کا منہ دیکھ لینا۔"

"تھانے دار صاحب! ہم ادھر چودھریوں کے ڈیرے پر بھی گئے تھے۔" کبریٰ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "لیکن اس نامراد، مراد نے ہمیں کمرے کے اندر نہیں جانے دیا۔ خدا کا غضب ہے، میری چھوٹی بہن قتل ہوگئی اور مجھے اس کی لاش تک جانے سے روکا جا رہا ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کبریٰ!" فرمان نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم اس وقت بہت جذباتی ہو رہی ہو۔ شگی نے تو ہماری ناک کٹوا دی ہے۔ شور شرابا مچا کر تم باقی کی کسر پوری کرنا چاہتی ہو!"

فرمان کا آخری جملہ تلخی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی باتوں سے مجھے ایک معقول اور سمجھ دار آدمی لگا۔ حالات کی نزاکت کو اس نے بڑی گہرائی سے محسوس کر لیا تھا اسی لئے ایک ایک جملہ ناپ تول کر ادا کر رہا تھا۔

میں نے کبریٰ کی تشفی کی خاطر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بی بی! میں کوئی تم لوگوں کا دشمن نہیں ہوں۔ مراد کو چودھری غنی ہی نے وہاں متعین کیا تھا۔ مقتول مشتاق کی بیوی بلقیس بھی اپنے شوہر کا منہ دیکھنے وہاں پہنچی تھی۔ لیکن آپ لوگوں کی طرح مراد نے بلقیس کو بھی کمرے کے اندر قدم نہیں رکھنے دیا۔" پھر میں نے فرمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا شوہر عقل مند ہے۔ یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم جذبات میں بہنے کی بجائے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں سب سے زیادہ بدنامی آپ ہی لوگوں کی ہے۔"

پتہ نہیں، میری بات اس کی عقل میں بیٹھی کہ نہیں ...... بہرحال، وہ خاموش ہو کر گاہے گاہے نفی میں سر ہلانے لگی۔ فرمان میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"ملک صاحب! آپ کی باتوں سے میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ اس دہرے قتل کے سلسلے میں بشارت پر شک کر رہے ہیں؟"

"کیا میں بشارت پر شک کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں؟"

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا تو وہ جزبز ہو کر رہ گیا۔ خجالت آمیز انداز میں بولا۔ "مم...... میرا مطلب ہے، بشارت اتنا...... بہادر نہیں ہے......"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ "بہادر" کی بجائے لفظ "غیرت مند" استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن کبریٰ کی موجودگی کے سبب اس نے جملے میں رد و بدل کر دیا تھا۔ شگی کے لاابالی کردار کے بارے میں رحمت علی نے بھی مجھے بہت کچھ بتایا تھا اور اب فرمان کے

روپے سے بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی سالی کی حرکتوں سے خوش نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''فرمان! بیوی کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ بزدل سے بزدل انسان بھی غیرت کے جوش میں ٹارزن بن جاتا ہے۔ اگر بشارت اس دہرے قتل کی واردات میں ملوث نہیں تو پھر وہ کہاں غائب ہے؟''

''یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی!'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''میں نے خود بھی کھیتوں میں جا کر اسے دیکھا ہے۔ وُہ مجھے اپنی زمین پر دکھائی دیا اور نہ ہی اس کی بیل گاڑی کہیں نظر آئی۔''

''بشارت کی زمین کس طرف واقع ہے؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

فرمان نے جواب دیا۔ ''ادھر مغرب کی طرف۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مذکورہ سمت میں اشارہ بھی کیا۔ ''کوئی پندرہ منٹ کے پیدل فاصلے پر بشارت کی پانچ ایکڑ اراضی ہے۔ وہ آج بیل گاڑی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ کہہ رہا تھا، واپسی پر اپنے اور میرے جانوروں کے لئے سبز چارا لے آئے گا مگر ابھی تک وہ لوٹ کر نہیں آیا۔''

اس کے بعد وہ اپنے اور بشارت کے پالتو جانوروں کی تفصیل بتانے لگا۔

کبریٰ نے کہا۔ ''ہم بھی بشارت کے انتظار میں اپنا گھر چھوڑ کر ادھر بیٹھے ہیں۔ چھوٹے بچے کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔''

''کون چھوٹا بچہ؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''سُگی کا ایک ہی تو بچہ ہے.....نوید۔'' کبریٰ نے بتایا۔ ''میں اسی معصوم کی بات کر رہی ہوں۔ اب نوید کو کس کے آسرے پر چھوڑ کر اپنے گھر جائیں۔ فرمان کہتا ہے، نوید کو اپنے ساتھ لے چلو، وہ دن میں بھی تو ادھر ہی رہا ہے۔ لیکن میں بشارت کا انتظار کرنا چاہتی ہوں۔''

کبریٰ کی باتیں انکشاف انگیز تھیں۔ میں نے بشارت کے بیٹے نوید کے سلسلے میں کرید کرید کر اس سے سوال کئے تو مزید حقائق نکل کر سامنے آ گئے۔ کبریٰ نے میرے استفسارات کے جواب میں بتایا کہ آج دوپہر کو جب سُگی، بشارت کے لئے کھانا لے کر کھیتوں کی طرف جانے لگی تو اس نے ننھے نوید کو اس کے گھر چھوڑ دیا تھا۔ نوید کی عمر کم وبیش پانچ سال تھی اور وہ اپنی خالہ کے گھر میں خوشی خوشی رہ جاتا تھا۔ کبریٰ کا گھر اسی گلی میں، دو گھر چھوڑ کر واقع تھا۔ کبریٰ کے تین بچے تھے جن کی عمریں علی الترتیب دس، آٹھ اور پانچ سال تھیں۔ اسماعیل اور ارسلان بڑے تھے جب کہ رابعہ، نوید کی ہم عمر تھی۔ نوید اسی کے

ساتھ زیادہ گھل مل کر کھیلتا تھا۔

میں نے کبریٰ سے پوچھا۔ ''سُگی کتنے بجے نوید کو تمہارے پاس چھوڑ کر گئی تھی؟''

''میرا خیال ہے اس وقت ساڑھے بارہ بجے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''اس نے جاتے وقت کوئی خاص بات کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ سوچنے والے انداز میں بولی۔

''کیا وہ روزانہ اسی وقت بشارت کا کھانا لے کر کھیتوں میں جاتی تھی؟''

''ہاں جی، لگ بھگ اسی وقت وہ بشارت کو کھانا دینے جاتی تھی۔'' اس کے لہجے میں تذبذب جھلکنے لگا۔ ''اور ادھر جاتے ہوئے وہ نوید کو ہمارے گھر ہی میں چھوڑتی تھی۔''

''کیا بات ہے کبریٰ!'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی اندرونی بے چینی کو بھانپ لیا۔ ''تم مجھے الجھی ہوئی نظر آ رہی ہو۔ کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتاؤ؟''

''وہ جی، میں ایک بات بتانا بھول گئی۔'' وہ کشمکش کی سی کیفیت میں بولی۔ ''پتہ نہیں، اس کی کوئی اہمیت بھی ہے یا نہیں!''

''اہم اور غیر اہم کا فیصلہ میں خود کر لوں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم بتاؤ، بات کیا ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''سُگی نے کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ آج اسے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''مجھے کیا پتہ تھا۔'' وہ گلوگیر انداز میں بولی۔ ''کہ سُگی کو اتنی دیر ہو جائے گی کہ وہ پھر کبھی واپس نہیں لوٹ سکے گی۔''

بات ختم کرتے ہی وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ میں اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ چھوٹی بہن کی شرمناک موت نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن قانون کے تقاضے پورے کرنا بھی ضروری تھا لہٰذا میں نے دو منٹ کے توقف کے بعد کرید اور پوچھ تاچھ کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔

''کبریٰ بی بی! سُگی نے اپنے دیر سے واپس آنے کی کوئی وجہ بھی تو تمہیں بتائی ہو گی؟''

''جی.....'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور غم ناک لہجے میں بولی۔ ''اس نے کہا تھا، بشارت کو کھانا کھلانے کے بعد وہ چودھریوں کی حویلی جائے گی۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''وہ چودھریوں کی حویلی کیوں جانا چاہتی تھی؟''

''چودھری غنی نے اسے کسی کام سے بلایا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کس کام سے؟''

''یہ تو اس نے مجھے نہیں بتایا'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ''اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے زیادہ پوچھا بھی نہیں۔ چودھری غنی صاحب تو اس پنڈ کے مالک و مختار ہیں۔ وہ کسی کو بھی اپنی حویلی میں طلب کر سکتے ہیں۔''

اگرچہ کبریٰ نے چودھری غنی کے بلاوے کے بارے میں مجھے بہت سادگی سے بتایا تھا لیکن میرے ذہن میں ایک عجب سا کھٹکا آ بیٹھا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جائے وقوعہ پر چودھری غنی سے میری بات ہو چکی تھی اور میں نے اس سے شگی اور مشتاق کے بارے میں کئی سوالات کئے تھے۔ اگر چودھری غنی نے آج دوپہر میں شگی کو اپنی حویلی میں بلایا تھا تو وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتا ...... اور اگر چودھری نے دانستہ اس پہلو کی پردہ پوشی کی تھی تو پھر میرے اندیشوں کی دیوار کی قامت میں اضافہ ممکن تھا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مجھے چودھری کی حویلی کی طرف ہی جانا تھا۔ چودھری سے گفتگو کا مواد حاصل کرنے کے لئے میں پوری طرح کبریٰ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''شگی تک یہ اطلاع کس نے پہنچائی کہ چودھری غنی نے اسے حویلی پر بلایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ماسی مختاراں آئی تھی شگی کو بتانے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ ماسی مختاراں کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟''

''ماسی مختاراں چودھری غنی کی نوکرانی ہے۔'' کبریٰ نے جواب دیا۔ ''وہ ادھر حویلی ہی میں رہتی ہے۔''

میں نے ماسی مختاراں کے نام پر دائرہ لگا کر اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اس سے پہلے تین اور نام بھی دائروں میں بند، میرے ذہن میں محفوظ ہو چکے تھے اور وہ نام تھے ...... چودھری غنی، بشارت اور مراد۔ میرے خیال میں ان چار افراد سے پوچھ گچھ کافی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی۔ مزید چند سوالات کے بعد میں نے کبریٰ اور اس کے شوہر کو فارغ کر دیا۔ میں نے ان دونوں سے مشتاق کے بارے میں بھی گھما پھرا کر کئی سوالات کئے۔ انہوں نے جواب میں کھلم کھلا اس کی مخالفت نہیں کی۔

بشارت کے گھر سے نکلنے کے بعد میں نے آس پڑوس کے تین چار افراد سے بھی مختصر گفتگو کی۔ اس دوہرے قتل کے ذمہ دار پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکا۔ تاہم ڈھکے چھپے الفاظ

میں انہوں نے شگی کی غیر نصابی سرگرمیوں کا جو نقشہ کھینچا، وہ رحمت علی سے حاصل ہونے والی معلومات کی تائید کرتا تھا۔ شگی تسلی بخش کردار کی مالک نہیں سمجھی جاتی تھی!

میں چودھری غنی کی حویلی کی طرف جانے لگا تو کبریٰ کا شوہر فرمان بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ اسی وقت ایک گورا چٹا معصوم سا بچہ دروازے میں نمودار ہوا اور فرمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''خالو...... میری اماں اور ابا کب آئیں گے؟''

مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ بشارت کا بیٹا نوید تھا۔ میں نے اس بچے کی عمر کا اندازہ پانچ اور چھ سال کے درمیان قائم کیا۔ اس کے مختصر اور سادہ سے سوال میں دنیا جہاں کی تشویش رچی بسی تھی۔ اس معصوم صورت کو دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ اس نے اپنی ماں اور باپ کے بارے میں بڑی چاہت سے استفسار کیا تھا۔ اس کے ننھے سے ذہن اور نازک سے دل کو کیا معلوم کہ اس کی ماں اب کبھی واپس نہیں آئے گی اور باپ اگر اس واردات میں ملوث ہے تو پتہ نہیں وہ کتنے شب و روز جیل کی سنگلاخ اور بے رحم دیواروں کے پیچھے گزارے گا۔

ماں باپ کے افعال و اعمال میں ننھے نوید کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ مگر اس افعال و اعمال کے نتائج سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نوعیت کے معاملات میں قدرت کی مصلحتوں کو سمجھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر ایمان میں کوئی کجی یا کمزوری موجود ہو تو ایسے مواقع پر انسان کو گمراہ ہوتے ہوئے ایک لمحہ نہیں لگتا۔

میں بے اختیار آگے بڑھا اور نوید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! ہم تمہارے ابا اور اماں کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔ تم اندر جا کر اپنی خالہ کے بچوں کے ساتھ کھیلو۔''

میں اس موقع پر اس سے زیادہ اسے اور کیا تسلی دے سکتا تھا۔ اس نے سرتاپا میرے سراپا پر ایک گہری نظر ڈالی اور بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

''اماں ابا کہاں گم ہو گئے ہیں؟''

''ہم پتہ چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں نے گول مول انداز میں کہا۔

''آپ پولیس ہیں؟'' اس کی ویران آنکھیں مجھ پر ٹک گئیں۔

اس کے سوال سے مجھے اندازہ ہوا کہ گھر کے اندر میری آمد کے بعد پولیس کا تذکرہ ضرور ہوا ہو گا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر نوید کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور اس کے سوال کے جواب میں اسی کے انداز سے کہا۔

''جی بیٹا، میں پولیس ہوں۔''

''مجھے تو آپ سے بالکل ڈر نہیں لگ رہا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آپ تو بہت اچھے ہیں۔ لوگ پولیس سے کیوں ڈرتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''لوگ پاگل ہیں۔''

اس سے پہلے کہ نوید مجھ سے معصومیت بھرا کوئی اور سوال کرتا، فرمان نے اسے آنکھیں دکھائیں اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''نوید! تم سے کہا ہے ناں، اندر جاؤ!''

''لوگ پاگل ہیں ...... لوگ پاگل ہیں۔'' وہ تالی بجا کر میرے کہے ہوئے جملے کو دہراتے ہوئے گھر کے اندر غائب ہو گیا۔

یہ اس کی ایک غیر ارادی اور بچگانہ حرکت تھی لیکن غور و فکر کرنے والا ذہن اسے معاشرے پر ایک گہرے طنز سے تعبیر کر سکتا تھا۔ بچپن کتنا بے فکرا ہوتا ہے۔ نوید کا معصوم ذہن اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا تھا کہ حالات کی ایک سفاک کروٹ نے اس کے نازک اور گداز قدموں کے سامنے کون سی پُر خار راہ بچھا دی ہے!

فرمان میرے ساتھ چودھری غنی کی حویلی تک آیا۔ میں نے رخصت کرتے وقت اسے ہدایت کی۔

''تم بشارت کے گھر ہی میں رہنا اور جیسے ہی وہ واپس آئے فوراً مجھے مطلع کرنا۔ میں ادھر چودھری کی حویلی ہی میں بیٹھا ہوں۔''

''ٹھیک ہے سرکار! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔''

''اور نوید کا بہت زیادہ خیال رکھنا۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''وہ بہت معصوم اور پیارا بچہ ہے۔''

''جی، وہ میرے اپنے بچوں جیسا ہی ہے۔''

''فی الحال شگی کے قتل کا ذکر اس کے سامنے کرنا مناسب نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سلسلے میں تم اپنی بیوی کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا!''

''آپ فکر نہ کریں جناب!'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔ ''ادھر کے معاملات کو میں سنبھال لوں گا۔''

میں مطمئن ہو گیا۔

❀❀❀

چودھری غنی نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا اور مجھے ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم

میں لا بٹھایا۔ گاؤں دیہات میں ڈرائنگ روم کو بیٹھک کہا جاتا ہے۔ چودھری غنی کی بیٹھک آرائش اور سجاوٹ کے اعتبار سے ایسی عالی شان تھی کہ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا، چودھری غنی واقعی وہاں کا مالک و مختار ہے۔

''آپ کی ٹانگ کا اب کیا حال ہے چودھری صاحب؟'' میں نے دریافت کیا۔

اس نے اپنی دائیں ٹانگ پر اس طرح ہاتھ پھیرا جیسے میرے یاد دلانے سے اسے یاد آیا ہو کہ اس کی مذکورہ ٹانگ کسی ''مرض'' میں مبتلا ہے۔ ''تھوڑا آرام ہے!'' اس نے سرسری انداز میں کہا، پھر مجھ سے پوچھا۔ ''آپ بتائیں، بندہ قابو آیا کہ نہیں؟''

''کون سا بندہ چودھری صاحب؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''ملک جی، میں بشارت کی بات کر رہا ہوں!''

''اوہ! اچھا وہ۔'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا پھر بتایا۔ ''ابھی تک تو وہ واپس نہیں آیا۔ ویسے میں نے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ وہ جیسے ہی گاؤں میں قدم رکھے گا، مجھے اس کی خبر ہو جائے گی۔''

چودھری نے میرے بندوبست کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں ملک صاحب! پولیس کا مخبری کا نظام بڑی تیزی سے کام کرتا ہے!''

میں نے بھی اس کے بیان کردہ مخبری کے نظام پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پوچھ لیا۔ ''وہ آپ کا ملازم مراد کہاں ملے گا؟ مجھے اس سے بھی چند باتیں پوچھنا ہیں۔''

''مراد تھوڑی دیر پہلے ہی تو حویلی سے گیا ہے!''

''کہاں گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اُدھر، ڈیرے پر۔''

''یہ عجیب اتفاق ہے چودھری صاحب!'' میں نے چودھری غنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ادھر ڈیرے پر مراد کے بارے میں استفسار کیا تو وہ یہاں گاؤں میں تھا اور اب میں یہاں پہنچا ہوں تو وہ ادھر سے چلا گیا ہے!''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''واقعی، یہ ایک اتفاق ہی ہے۔'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''وہ بات دراصل یہ ہے ملک صاحب! کہ مراد اور مشتاق کی ڈیوٹی میں نے ڈیرے پر لگا رکھی تھی۔ مشتاق گھر بار والا تھا اس لئے رات کو وہ اپنے گھر آ جاتا تھا مگر مراد رات کو ادھر

ڈیرے پر ہی رہتا ہے۔ مراد چھڑا چھانٹ ہے، کہیں بھی رہے اسے کوئی فرق تو نہیں پڑتا۔ آج تو میں نے منظورے کو بھی اس کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ منظورا ابھی رات کو ڈیرے پر ہی رہے گا۔''

چودھری غنی نے اپنے تئیں مراد کے اِدھر سے اُدھر ہونے کی وضاحت کر دی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں، میرا ذہن اس وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''منظور اور مراد سوئیں گے کہاں؟ رہائشی کمرے کو تو میں نے سیل بند کر دیا ہے۔''

منظور عرف منظورا وہی شخص تھا جو دہرے قتل کی اس واردات کی اطلاع دینے میرے پاس تھانے پہنچا تھا۔ چودھری نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جناب! مجھے خبر ہے کہ آپ نے اس کمرے پر سرکاری تالا ڈال دیا ہے۔ لیکن وہاں ڈیرے پر دو اور کمرے بھی ہیں۔ ویسے آج کل موسم اتنا گرم ہے کہ یہ لوگ احاطے ہی میں سوتے ہیں۔''

اِدھر چودھری کی بات ختم ہوئی، اُدھر بیٹھک کے دروازے میں ٹرے بردار ملازم نمودار ہوا۔ اس نے جو کنگ سائز ٹرے اٹھا رکھی تھی وہ سامانِ خورد و نوش سے لدی پھندی دکھائی دیتی تھی۔ چودھری کا اشارہ نما اجازت نامہ پا کر اس ملازم صورت شخص نے وہ تمام تر اشیاء میرے سامنے رکھی میز پر سجا دیں اور وہ جب ادب و احترام کے ساتھ بیٹھک میں داخل ہوا تھا اسی کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

''ملک صاحب...... کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔'' چودھری میز کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس حویلی کو اپنا ہی گھر سمجھیں۔''

میرے لاکھ انکار کے باوجود بھی جب اس کے کروڑ اصرار میں کمی واقع نہ ہوئی تو مجھے اپنے ہاتھوں اور منہ کو زحمت دینا پڑی۔ اپنی ضد پر ڈٹے رہنے سے کفرانِ نعمت کا خدشہ تھا۔

''آپ اِدھر بشارت کے گھر میں کافی وقت گزار کر آئے ہیں۔'' چودھری نے کہا۔ ''اس دہرے قتل کے سلسلے میں کوئی نکتہ ہاتھ آیا؟''

چودھری کا انداز ٹٹولنے والا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، ایک سرا ہاتھ تو لگا ہے لیکن پتہ نہیں اس سے کچھ حاصل بھی ہوتا ہے یا نہیں!''

چودھری غنی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کس سرے کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب؟''

میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''چودھری صاحب! میں نے جو سرا پکڑا ہے اس کے دوسرے کنارے پر آپ کھڑے ہیں!''

''آپ کھل کر کہیں، کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' وہ بے حد محتاط لہجے میں بولا۔

میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے، شگی کو آج دوپہر کے وقت آپ نے حویلی میں طلب کیا تھا!''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا مگر ٹھوس لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

''آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟''

''پہلے آپ تصدیق یا تردید کریں، پھر میں اطلاع کنندہ کا نام بتاؤں گا۔''

''میں اس بات کی بھرپور تردید کرتا ہوں۔'' وہ خاصے دبنگ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''آج دوپہر جب شگی، بشارت کا کھانا لے کر کھیتوں کی طرف جانے لگی تو اس نے اپنا بیٹا نوید، بڑی بہن کے حوالے کرتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ اسے واپس آنے میں دیر ہو جائے گی۔ اس کی بہن کبریٰ نے جب تاخیر کا سبب پوچھا تو شگی نے اسے بتایا کہ ماسی مختاراں اس کے پاس آئی تھی اور اس سے کہا ہے کہ چودھری غنی نے اسے اپنی حویلی میں بلایا ہے لہٰذا......''

''بدبخت نے بہت بڑا جھوٹ بولا ہے۔'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی چودھری نے غیظ بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ شگی کے کرتوتوں سے شاید واقف نہیں ہیں ملک صاحب! یہ عورت...... یہ عورت......'' وہ بولتے بولتے رکا اور نفی میں سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''خیر چھوڑیں...... مرنے والی کی برائی کرنے سے کیا فائدہ۔ ہر آدمی کا اعمال نامہ اس کے ساتھ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چودھری صاحب! میں پہلے شگی کے کردار سے واقعی واقف نہیں تھا مگر اب اس سلسلے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر چکا ہوں، بہرحال......'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''آپ تو اس بات سے انکاری ہیں ناں کہ آج دوپہر کو آپ نے شگی کو ماسی مختاراں کے ذریعے اپنی حویلی میں بلایا تھا؟''

''میں سو فیصد انکاری ہوں ملک صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''اور میں اس بات کو ابھی آپ کے سامنے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ ماسی مختاراں اس وقت میری حویلی میں موجود ہے۔ میں اسے بلا کر آپ کا سامنا کراتا ہوں۔ آپ کو جو کچھ بھی

پوچھنا ہے اس سے پوچھ لیں۔"

اگلے دس منٹ میں یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ چودھری غنی نے ماسی مختاراں کو فوراً بیٹھک میں طلب کیا۔ وہ پچپن اور ساٹھ کے درمیان لگتی ہوئی ایک دھان پان عورت تھی۔ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بتاتا تھا، وہ جوانی میں بہت تیز طرار رہی ہوگی۔ بہرحال، مختاراں نے چودھری کے دعوے کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے تو پچھلے تین دن سے شگی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔

مجھے اس کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ ویسے اس بات کا امکان تھا کہ شگی نے اس سلسلے میں واقعی دروغ گوئی کا سہارا لیا ہو!

ماسی مختاراں بیٹھک سے رخصت ہوگئی تو چودھری ناگواری سے بولا۔ "ملک صاحب! آپ کو اندازہ نہیں یہ شگی کس قسم کی عورت تھی۔ جھوٹ اور چھل فریب تو اس کی نس نس میں بسا ہوا تھا۔ جو عورت اپنے شوہر کی ہو کر نہ رہے، اس سے اور کوئی کیا توقع کر سکتا ہے...... بس، اللہ معاف کرے!"

بات کے اختتام پر اس نے ایسا منہ بنایا جیسے اس کے دانتوں تلے اچانک کوئی کڑوا بادام آ گیا ہو۔ میں نے بدستور کرید کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے چودھری صاحب! یہ تو آپ نے ثابت کر دیا کہ آج آپ نے مقتولہ شگی کو اپنی حویلی میں نہیں بلایا تھا لیکن میرے سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ گاہے گاہے آپ کی حویلی کا چکر لگاتی رہتی تھی۔"

وہ بڑی رعونت سے بولا۔ "ملک صاحب! میری حویلی میں تو پتہ نہیں، کون کون چکر لگاتا رہتا ہے۔ بہرحال، یہ سچ ہے کہ شگی ہفتے میں ایک آدھ چکر ادھر ضرور لگاتی تھی اور اس کا بھی ایک خاص سبب ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رکا۔ میں سوالیہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا رہا تاہم شگی کی حویلی میں آمد کے بارے میں کوئی استفسار نہ کیا۔ چودھری خود ہی بتانے لگا۔

"آپ سے کیا پردہ ملک صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی نرگس کے جسم کا زیریں حصہ مفلوج ہے۔ حکیم جی نے ایک خاص تیل بنا کر دیا ہے اور تاکید کر رکھی ہے کہ ہفتے میں ایک مرتبہ جسم کے متاثرہ حصے پر اس تیل کی مالش ضرور ہونی چاہئے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے پتہ چلا کہ شگی کے ہاتھوں میں غضب کا جادو ہے۔ وہ اتنی دل جمعی سے مالش کرتی ہے کہ بہ قول شخصے، اگر خدا کا حکم ہو تو مُردے میں

جان ڈال سکتی ہے۔ میں اپنی بیوی کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ جب مجھے شگی کی صلاحیت کے بارے میں پتہ چلا تو میں نے سوچا، کیوں نہ اس کے فن سے فائدہ اٹھایا جائے۔ امرِ ربی کے لئے میں دعا کرتا رہا اور مُردے میں جان ڈالنے کے لئے شگی کو مامور کر دیا۔ بس، یہ ہے سارا قصہ جناب ملک صاحب!"

اس نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے چودھری صاحب!" میں نے بھی ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو اپنے فرائض سے مجبور ہوں اس لئے آپ سے ہر قسم کے سوال کئے ہیں۔ اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو تو......"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ملک صاحب!" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی ذمہ داریوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ آپ کو میری حویلی کے دروازے ہمیشہ کھلے ملیں گے۔ آپ کسی بھی قسم کی پوچھ پرتیت کے لئے ادھر آ سکتے ہیں۔" ایک لمحے کے لئے خاموش رہنے کے بعد اس نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ ماشاء اللہ ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ پولیس آفیسر ہیں۔ اتنی سی بات تو آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ شگی نے اپنے آشنا کی آشنائی حاصل کرنے کے لئے حویلی آنے والا جھوٹ بولا تھا!"

میں نے اس کے اظہارِ خیال پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کہا۔ "آپ اتنا کام ضرور کریں گے چودھری صاحب! کہ کل صبح آپ مراد کو میرے پاس تھانے بھیج دیں۔ میں اس کا تفصیلی بیان لینا چاہتا ہوں۔ وہ مقتول مشتاق کے ساتھ ڈیرے پر رہتا تھا اس لئے اس کے حالات و واقعات اور معاملات سے بہ خوبی واقف ہو گا۔ مجھے امید ہے، ان سوال و جواب کے نتیجے میں کوئی مفید بات ضرور سامنے آئے گی۔" بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ضرور...... ضرور!" وہ میری تقلید میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں کل مراد کو آپ کی طرف بھیج دوں گا...... اور آپ دو منٹ بیٹھیں، میں آپ کے لئے سواری کا بندوبست کرتا ہوں۔ شام ہو رہی ہے، آپ کہاں پریشان ہوتے پھریں گے۔"

ٹھیک دس منٹ بعد میں چودھری غنی کے مہیا کئے گئے تانگے میں سوار ہو رہا تھا۔ چودھری کی حویلی گاؤں کے جنوبی کنارے پر واقع تھی۔ مجھے اپنے تھانے کی طرف جانے کے لئے گاؤں کے اندر سے گزرنا پڑتا اور یہ میرے لئے اچھا ہی تھا۔ اس طرح میں ایک مرتبہ پھر بشارت کو جھانک سکتا تھا۔ اس کا گھر گاؤں کے وسط میں تھا۔ ابھی میں بشارت کے

گھر سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھا کہ ایک عورت اچانک ایک گھر سے نکل کر ہمارے تانگے کے سامنے آ گئی۔

کوچ بان کو ہنگامی انداز میں تانگہ روکنا پڑا۔ وہ عورت اتنی سرعت سے گھوڑے کے سامنے آئی تھی کہ اگر کوچ بان کو لگام کھینچنے میں لمحہ بھر کی تاخیر ہو جاتی تو تانگے میں جتا ہوا گھوڑا اسے اپنے سموں تلے روند چکا ہوتا۔ اس عورت کا انداز ایک طرح سے خودکشی جیسا تھا لیکن ہوا میں اٹھے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اس بات کا اعلان کرتے تھے کہ اس نے تانگے کو روکنے کی کوشش میں وہ حرکت کی تھی۔

کوچ بان نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ ''اس کا خصم تو حرام موت مارا گیا۔ پتہ نہیں، یہ کیا چاہتی ہے۔''

کوچ بان کی خفگی نے پلک جھپکتے میں مجھے بتا دیا کہ اس کا اشارہ مقتول مشتاق کی طرف تھا۔ آج اس گاؤں کا برننگ ٹاپک شگی اور مشتاق کا قتل ہی تھا۔ میں نے کوچ بان رمضان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ مشتاق کی بیوی بلقیس ہے؟''

''جی، یہ اسی نامراد مشتاقے کی بیوی ہے۔'' رمضان نے جواب دیا۔

اتنی دیر میں بلقیس سنبھل کر میرے قریب آ گئی اور احتجاجی لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! مجھ سے پوچھیں، میں کیا چاہتی ہوں۔'' اس کے احتجاج میں گہرے غم کا عنصر شامل تھا۔ ''رمضانی نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ مجھے موت چاہئے۔ جب مشتاق نہیں رہا تو میں جی کر کیا کروں گی۔ ڈائن کھا گئی میرے خاوند کو!'' بات ختم کرتے کرتے اس کا گلا رندھ گیا۔

ڈائن کا لفظ بلقیس نے یقیناً شگی کے لئے استعمال کیا تھا۔ بلقیس کو دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے مشتاق کی لاش کا بغور معائنہ کیا تھا۔ وہ ایک وجیہہ اور دراز قامت مرد تھا جب کہ بلقیس مجھے اس کا نیگٹو لگی۔ وہ تیس بتیس سال کی ایک پستہ قامت اور سیاہ رو عورت تھی۔ اس کے جسمانی خطوط اور چہرے کے نقوش میں بھی کوئی توازن نہیں تھا۔ وہ ایک سو ایک فیصد بے جوڑ میاں بیوی تھے۔

اس وقت تک سورج غروب ہو چکا تھا لیکن ابھی اندھیرا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ بلقیس کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ اگر میں اس سے چند باتیں کر لوں تو اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی اور ممکن ہے اس دہرے قتل کے سلسلے میں مجھے بھی کوئی مفید بات معلوم ہو جائے۔

میں تانگے سے نیچے اتر آیا اور بلقیس سے پوچھا۔ ''بی بی! کیا تمہارا گھر ادھر آس پاس

ہی کہیں ہے؟''

''میں اس گھر میں رہتی ہوں۔'' اس نے ایک دروازے کی سمت اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ''میں تم سے اس ڈائن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں جو تمہارے خاوند کو نگل گئی ہے۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی جگہ ہے یا یہیں پوچھ گچھ کر لوں؟''

میرے منہ سے شگی کے لئے ڈائن کا لفظ سن کر اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ یہ میرے الفاظ کا ایک نفسیاتی اثر تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''آئیں جی تھانے دار صاحب...... اندر آ جائیں۔''

ایک منٹ بعد میں مقتول مشتاق کی بیٹھک میں بیٹھا بلقیس سے باتیں کر رہا تھا۔ کوچ بان رمضانی عرف رمضان کو میں نے تھوڑی دیر باہر ہی ٹھہرنے کا کہا تھا۔ بلقیس اس بات پر بہت برہم تھی کہ اسے مشتاق کی لاش تک جانے سے روک دیا گیا تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تو تھوڑی دیر میں وہ شانت ہو گئی۔

''تم نے شگی کو ڈائن کہا۔ واقعی وہ کسی ڈائن سے کم نہیں تھی۔'' میں نے اس کے جلتے ہوئے ارمانوں پر ہمدردی کا مرہم پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے بتاؤ، ان دونوں کے درمیان کب سے یہ چکر چل رہا تھا؟''

اس کی آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے۔ ''میں بہت دکھی عورت ہوں تھانے دار جی!''

''مجھے اندازہ ہے۔'' میں نے پرسہ دینے والے انداز میں کہا۔

وہ سسک پڑی۔ ''میں جانتی ہوں، میں کالی کلوٹی ایک عام سی عورت ہوں۔'' وہ اس وقت شدتِ جذبات سے بری طرح مغلوب تھی۔ ''مشتاق کو مجھ سے زیادہ اچھی اور گوری چٹی خوب صورت عورتیں مل سکتی تھیں۔ میں تو اس کا پاسکو (پاسنگ) بھی نہیں ہوں۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں گھائل ارمانوں کو آشکار کرتی چلی گئی۔ ''میں نے کئی مرتبہ مشتاق سے کہا بھی تھا کہ وہ کسی خوبصورت عورت سے دوسری شادی کر لے، میں نوکرانی بن کر اس گھر میں پڑی رہوں گی اور ان دونوں کی خاطر خدمت کرتی رہوں گی۔ لیکن وہ کبھی دوسری شادی پر تیار نہیں ہوا۔ مجھے کیا پتہ تھا......'' اس کی آواز بھیگ گئی۔ ''مجھے کیا پتہ تھا وہ گھر سے باہر کیا گل کھلاتا پھر رہا ہے!''

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا اور اس سے پوچھا۔ ''بلقیس! اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے شوہر کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر لوں تو تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، مشتاق اور شگی کے درمیان یہ کھچڑی کب سے پک رہی تھی؟''

"میں تو جی شگی ہی کو اپنے خاوند کا قاتل سمجھتی ہوں۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے خالصتاً عورتوں والے انداز میں بولی۔ "باقی جہاں تک ان دونوں کے تعلقات کی بات ہے تو یہ معاملہ کچھ عرصہ پہلے ہی میرے علم میں آیا تھا۔"

"کتنا عرصہ پہلے؟" میں نے کرید جاری رکھی۔

"کوئی ایک مہینہ پہلے۔" اس نے بتایا۔

"تمہیں یہ بات کس کے ذریعے پتہ چلی تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "مجھے مراد نے ان کے تعلقات کے بارے میں بتایا تھا۔"

مراد کے نام نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ "اچھا! اس نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"مراد نے کہا تھا، میں اپنے خاوند پر نظر رکھا کروں۔" بلقیس نے جواب دیا۔ "اس کے مطابق مشتاق اور شگی میں کوئی چکر چل رہا تھا۔ مراد نے مجھے یہاں تک بھی بتایا کہ شگی مشتاق سے ملنے ڈیرے پر بھی جاتی رہتی ہے۔"

بلقیس بڑے اہم انکشافات کر رہی تھی۔ میں نے اس کی باتوں میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔ "پھر تم نے مشتاق پر نگاہ رکھی کہ نہیں؟"

"نہیں جی۔" وہ سادگی سے بولی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مراد کی بات کا یقین ہی نہیں آیا تھا۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ "دراصل شگی کے لچھن ایسے تھے کہ اس کے ساتھ منسوب کر کے کسی کو بھی بدنام کیا جا سکتا ہے لیکن......" اس کا لہجہ یک دم بے حد کڑوا ہو گیا۔ "آج والے شرم ناک واقعے نے مراد کی بات کو سچ کر دکھایا ہے!"

میں نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔ "بلقیس! مشتاق تمہارا خاوند تھا، تمہارا مجازی خدا اور سر کا سائیں تھا۔ مراد نے تمہیں ان دونوں کے تعلقات کے بارے میں بتایا تو کم از کم اس سے تصدیق تو کر سکتی تھیں؟"

"میں نے مشتاق سے اس لئے بات نہیں کی کہ مراد نے مجھے قسم دے رکھی تھی۔"

"کیسی قسم بلقیس؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ "مراد نے کہا تھا، بھابی! اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہیں آنا چاہئے۔ مشتاق سے میری دوستی ہے۔ خواہ مخواہ ہمارے درمیان کھٹائی پڑ جائے گی۔"

"اس بات میں تو مجھے کسی قِسم کی کوئی قسم نظر نہیں آ رہی۔"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "وہ جی...... بات دراصل یہ ہے کہ اگر میں شگی والے معاملے میں مشتاق سے پچھ پرتیت کرتی تو وہ فوراً پوچھتا، مجھے کس نے بتایا ہے؟ بتائیں، میں اس سے کیا جھوٹ بولتی؟ مجھے مجبوراً مراد کا نام لینا پڑتا اور پھر گڑبڑ ہو جاتی۔"

بلقیس کی بے وقوفی نما سادگی پر میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی فرمانبرداری اور مشتاق کی خیانت پر دلی افسوس بھی ہوا۔ دراصل بلقیس اور مشتاق کی جوڑی میں اتنی دوری حائل تھی کہ بلقیس اس تفاوت کی بناء پر شوہر پرستی میں حد سے آگے گزر گئی تھی۔ ہر شے میں اعتدال بہت ضروری ہے۔ حد سے متجاوز شوہر پرستی ہو یا بیوی پر اندھا اعتماد، یہ ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

انسانوں کو انسانوں سے نمٹنے اور نباہ کرنے کے لئے آنکھوں کو کھلی رکھتے ہوئے عقل کو بھی استعمال میں لانا چاہئے۔ اللہ نے انسان کو جو بھی صلاحیتیں دے رکھی ہیں انہیں درخورِ اعتنا نہ جاننا صحت مندانہ اقدام نہیں۔ انسانیت کے تقاضے نبھانا ضروری ہیں۔

صرف خدا ہی کی ایک ایسی ذات ہے جس پر اندھا اعتماد کیا جا سکتا ہے!

"تم لوگوں کے کوئی بچے وچے نہیں ہیں؟" میں نے اس گھر پر طاری سناٹے اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بلقیس نے بتایا۔ "نہیں جی، ہم ابھی تک بے اولاد ہیں۔"

"بے اولاد ہو!" میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ بے اولاد نہیں، بدقسمت ہو۔ "شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟" میں نے استفسار کیا۔

"پانچواں سال لگا ہے۔" اس نے بتایا۔

"تمہیں کسی پر شک ہو تو بتاؤ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں شگی اور مشتاق کو کون قتل کر سکتا ہے؟"

وہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "تھانے دار جی! مجھے مر کر اپنی قبر میں اترنا ہے۔ میں خواہ مخواہ کسی کا نام لے کر اپنی مٹی گندی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"میں تو اپنی تباہی اور بربادی کی ذمے دار صرف اور صرف شگی ہی کو سمجھتی ہوں۔"

اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ ان دونوں کا قاتل جو کوئی بھی رہا ہو، بہرحال مشتاق کو شگی کی وجہ سے موت آئی تھی!

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو بلقیس! میں تمہارے شوہر کے قاتل کو جلد از جلد

گرفتار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس دوران اگر تمہیں قاتل کے بارے میں کوئی خاص اور اہم بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ میری دلی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ یقین جانو، مجھے تمہارے شوہر کی الم ناک موت کا بڑا دکھ ہوا ہے۔"

مشتاق اپنے کردار اور افعال میں جیسا بھی تھا لیکن بلقیس جیسی عورت کے لئے وہ کسی عظیم خزانے سے کم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ مشتاق کی موت نے بلقیس کا سب کچھ چھین کر اسے تہی دست و داماں کر دیا تھا۔

"مشتاق کی لاش کب تک مجھے مل جائے گی؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا۔ "ہسپتال سے جیسے ہی مقتولین کی لاشیں تھانے پہنچیں گی، میں تمہیں خبر کر دوں گا۔ تم میرے پاس آ جانا۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں مشتاق کی لاش تمارے حوالے کر دوں گا۔"

وہ منہ سے کچھ نہ بولی، محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

میں اس کے گھر سے نکلا اور تانگے میں بیٹھ کر بشارت کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر مجھے فرمان کی زبانی معلوم ہوا کہ بشارت ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ اس وقت ساڑھے سات بجے تھے۔ رات نے اپنی سیاہ گھنیری زلفیں کھول دی تھیں اور ماحول کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا تھا۔

"وہ عموماً کب تک گھر آ جاتا ہے؟" میں نے فرمان سے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ "ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ رات ہو جائے۔ وہ دن کی روشنی میں واپس آ جاتا ہے۔"

بشارت کی خلافِ معمول پراسرار روپوشی اس کی ذات کو شکوک وشبہات کی دبیز چادر میں لپیٹ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہم زلف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"فرمان! میں واپس تھانے جا رہا ہوں اور تمہارے ذمے ایک کام لگا کر جا رہا ہوں۔"

وہ پوری توجہ سے مجھے سننے لگا۔

میں نے مزید کہا۔ "جیسے ہی تمہارا ساڑھو واپس آئے، تم مجھے اطلاع دو گے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے جناب!" فرمان نے فرمانبرداری سے اثبات میں گردن ہلائی اور پورے اعتماد سے بولا۔ "آپ فکر نہ کریں جناب! میں بشارت کو کان سے پکڑ کر سیدھا آپ کے پاس لے آؤں گا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے جناب! میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا، بشارت اس دہرے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو آج تک ایک مچھر نہیں مارا، دو جیتے جاگتے انسانوں کو گولیوں سے بھوننا اس کے بس میں کہاں؟ پھر یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ وہ پستول وغیرہ کہاں سے لایا ہوگا۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میں سوچ لوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور ...... اس بات کا فیصلہ بھی میں ہی کروں گا کہ وہ کتنا قصور وار ہے اور کتنا بے گناہ!"

"جو حکم سرکار!" فرمان نرمی سے بولا۔

میں فرمان سے ہاتھ ملا کر ایک مرتبہ پھر تانگے میں آ بیٹھا۔

***

میں رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد عشاء کی نماز کے لئے جائے نماز پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔ اس دستک کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ تھانے میں کوئی ایمرجنسی پیش آ گئی تھی۔ میں نے اپنے عملے کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی بھی ضروری کام کے لئے مجھے رات کے کسی پہر بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ چھوٹے موٹے معاملات وہ خود ہی نمٹا لیا کرتے تھے اور جو مسئلہ ان کے بس سے باہر ہوتا، اس کے لئے مجھے زحمت دیا کرتے تھے۔

میں نے صحن عبور کر کے جب دروازہ کھولا تو مجھے کانسٹیبل آفتاب کی صورت نظر آئی۔ میرے استفسار سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ "ملک صاحب! بشارت آ گیا ہے۔"

کانسٹیبل اس وقت مجھے ایک نہایت ہی اہم اطلاع فراہم کر رہا تھا۔ بشارت کی تلاش اور انتظار میں، میں نے موضع ٹبی میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

"کیا وہ اکیلا ہی ہے؟"

میں نے فرمان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ بشارت کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آئے۔ کانسٹیبل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "بشارت کے ساتھ اس کا سانڈو (ساڑھو) فرمان بھی ہے۔ وہ دونوں چارے سے لدی ہوئی ایک بیل گاڑی پر تھانے پہنچے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ انہیں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔"

"جی ملک صاحب!" کانسٹیبل یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

میں نے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ فریضۂ صلوٰۃ ادا کیا اور عوامی لباس ہی میں، میں

اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے بشارت اور فرمان کو میرے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میں نے فرمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بیٹھ جاؤ!''

وہ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری اس سے کوئی بات ہوئی ہے؟'' میرا اشارہ بشارت کی جانب تھا۔

''باتیں تو بہت ہوئی ہیں جناب۔'' فرمان نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہی بات جو میں نے کہی تھی، مشتاق اور سُگی کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔''

''ہوں!'' میں نے گہری نظر سے بشارت کو گھورا۔ ''اس کا مطلب ہے، تم شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔'' میں نے اسے ڈرانے کے لئے خالص تھانے دارانہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے ساتھ کوئی دوسرا طریقہ ہی آزمانا پڑے گا۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے دروازے کی طرف منہ کر کے حوالدار کو آواز دی۔

''چمن شاہ! ذرا ادھر آؤ۔''

بشارت کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ پہلے ہی بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ میرے جارحانہ انداز نے اسے اور بھی خوف زدہ کر دیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''جناب ...... میں نے کچھ نہیں کیا ...... ایک تو میری بیوی قتل ہو گئی......'' اس کا انداز رو دینے والا تھا۔ ''اوپر سے الٹا آپ مجھے ہی دبا رہے ہیں ...... یہ کون سا قانون ہے......؟''

''سارے قانون اور قاعدے تمہیں ابھی پڑھا دیئے جائیں گے۔'' میں نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم آسانی سے چھوٹنے والے نہیں ہو۔''

بشارت کی عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ ایک پستہ قامت اور دُبلا پتلا شخص تھا۔ چہرے پر اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ چھوڑی تھی۔ شناختی علامات کے سلسلے میں وہ بڑا خود کفیل تھا۔ ایک چھوڑ، تین تین مستند شناختی علامات تھیں اس کے پاس۔ چہرہ چیچک زدہ، بائیں آنکھ کا چراغ گل اور بائیں ہی ٹانگ میں واضح لنگ۔ یہ لنگ غالباً بچپن میں ہونے والے پولیو کا تحفہ تھا۔

تکنیکی اعتبار سے مقتولہ سُگی اور بشارت میں کوئی تال میل نہیں بنتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لحاظ سے مس میچ جوڑا تھے۔ کچھ یہی کیفیت مشتاق اور بلقیس کے جوڑے کے ساتھ بھی تھی۔ دہرے قتل کی اس واردات نے بڑا ظلم ڈھایا تھا۔ ایویں سی شخصیت کے مالک بشارت کی حسین و جمیل بیوی، بلقیس جیسی عورت کے وجیہہ و شکیل شوہر کے ساتھ ملوث ہو کر

دنیا سے اٹھ گئی تھی اور اس اٹھان میں یہ دنیا دو خوب صورت انسانوں سے خالی ہو گئی تھی!

حوالدار چمن شاہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے فرمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ادھر باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں اندر بلا لوں گا۔''

وہ کسی معمول کی مانند کمرے سے رخصت ہو گیا تو میں بشارت کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بھئی تیس مار خان! تم نے کیا سوچا ہے؟ ازخود سچ بولو گے یا تمہارے اندر سے سچ کو نکالنے کے لئے ہمیں محنت کرنا ہو گی؟''

وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔''

میں نے اپنی تسلی کی خاطر اس سے پوچھ لیا۔ ''تم یہ تو جان گئے ہو نا، ادھر چودھری غنی کے ڈیرے پر کیا واردات ہوئی ہے یا میں تمہیں اس کی تفصیل بتاؤں؟''

''مجھے پتہ چلا ہے، ڈیرے پر کسی نے میری بیوی اور چودھری صاحب کے نوکر مشتاق کو قتل کر دیا ہے۔'' وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اور آپ ان کے قتل کا شک مجھ پر کر رہے ہیں۔''

اس کے چہرے پر جھلکتی شرمندگی اور خجالت نے مجھے بتا دیا کہ فرمان اسے سُگی اور مشتاق کی لاشوں کی کیفیت سے مکمل طور پر آگاہ کر چکا ہے لہٰذا میں نے اسے مزید ندامت سے بچانے کے لئے اس برہنہ موضوع کو نہیں کھولا اور سخت لہجے میں کہا۔

''شک تم پر نہیں تو کیا کالے چوروں پر کروں گا میں؟''

وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''جناب! میرے پاس سے تو وہ دوپہر کو بالکل ٹھیک ٹھاک اور تندرست گئی تھی۔ مجھے کیا پتہ ...... مجھے کیا پتہ کہ......'' جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے گردن جھکا لی۔

گردن کا یہ جھکاؤ شرمندگی اور ذلت و رسوائی کے اس بوجھ کے باعث تھا جو سُگی نے اس پر ڈال دیا تھا۔ ان لمحات میں بشارت مجھے ایک مجبور اور بے بس شخص نظر آیا۔ ایک ایسا لاچار شخص جو دل میں بڑے خشوع و خضوع سے موت کی دعا مانگ رہا ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے میں نے دھیرے دھیرے اسے کریدنا شروع کیا۔

''سُگی کھانا لے کر تمہارے پاس کب پہنچی تھی؟''

میرے لہجے میں پیدا ہونے والی لچک کو محسوس کر کے اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بتایا۔ ''اس وقت دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔''

''وہ کتنی دیر تک تمہارے پاس کھیتوں میں رکی تھی؟''

''کوئی بیس پچیس منٹ۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ بجے رخصت ہوگئی تھی؟''

''جی ہاں، اس وقت ڈیڑھ ہی بجا ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا آج تم نے شگی کے رویے میں کوئی خاص بات نوٹ کی تھی؟''

اس نے بڑی سادگی سے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''نہیں جناب!''

''شگی کے جانے کے بعد تم کھیتوں میں کیا کرتے رہے؟''

''میں اپنے اور فرمان کے جانوروں کے لئے پٹھے (چارا) کاٹتا رہا تھا۔''

''تم عموماً سورج غروب ہونے سے پہلے واپس گھر آ جاتے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''آج کدھر غائب ہو گئے تھے؟''

''میں لنگر وال چلا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ادھر لنگر وال میں بسنے والے شفیع محمد سے میں نے کچھ رقم لینا تھی۔ میں اسی سلسلے میں لنگر وال گیا تھا اور یہ بات میں نے دن میں شگی کو بھی بتا دی تھی کہ آج رات کو میں دیر سے گھر آؤں گا لیکن شگی......''

وہ ایک مرتبہ پھر جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے دروغ گوئی کی بُو نہیں آتی تھی۔ میں نے حوالدار چمن شاہ کو کمرے سے رخصت کر دیا تاکہ بشارت زیادہ آزادی سے گفتگو کر سکے۔ چمن شاہ کی موجودگی میں وہ خاصا سہما کھڑا تھا۔

''کرسی پر بیٹھ جاؤ!'' حوالدار کے جاتے ہی میں نے بشارت کو حکم دیا۔

وہ میرے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ تو بہت اچھے تھانے دار ہیں جناب!''

''اب تم بھی ایک بندے کے پُتر کی طرح میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''اگر میں نے محسوس کیا کہ تم کوئی گڑبڑ کر رہے ہو تو میں چمن شاہ کو واپس بلا لوں گا، پھر وہ تمہیں نچوڑ کر رکھ دے گا!''

چمن شاہ ایک کرخت صورت، تنومند اور چاق و چوبند حوالدار تھا۔ اس کی جھلک نے بشارت کو اچھا خاصا ''متاثر'' کیا تھا، جلدی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

''نہیں جناب! کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ آپ جو بھی پوچھیں گے، میں ٹھیک ٹھیک

بتاؤں گا...... سوہنے رب دی سوں!''

''قسم کھانے کی ضرورت نہیں!'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ تم جس کام سے موضع لنگر وال گئے تھے، وہ ہوا کہ نہیں؟''

''نہیں جی۔ شفیع محمد نے ٹال دیا ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''خواہ مخواہ اتنا انتظار بھی کروایا اور پھر سوکھا ہی ٹرخا دیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم لنگر وال جانے کے لئے اپنے کھیتوں سے کتنے بجے روانہ ہوئے تھے؟''

''لگ بھگ چار بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''بشارت!'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔ میں تمہارے بیان کی تصدیق کے لئے اپنے کسی بندے کو شفیع محمد کے پاس لنگر وال بھی بھیجوں گا۔''

''آپ جیسے چاہیں تصدیق کریں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔''

میں نے اچانک دھیمی آواز میں دریافت کیا۔ ''کیا تمہیں شگی اور مشتاق کے تعلقات کا علم تھا؟''

اس نے چونکتے ہوئے انداز میں پلٹ کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا اور تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' میں نے اس کی کیفیت کے پیش نظر دوستانہ انداز میں کہا۔ ''یہ باتیں صرف ہم دونوں تک محدود رہیں گی۔ اس لئے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرو۔''

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار جی! میں نے آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ یقین کریں، مجھے اس بارے میں واقعی کوئی خبر نہیں تھی۔''

میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''بشارت! شگی سے تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

وہ اُلجھن زدہ نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لگ بھگ سات سال ہو گئے ہیں۔''

''پھر تو تم اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھتے ہو گے!''

یہ سوال میں نے بڑے مبہم اور معنی خیز انداز میں کیا تھا۔ وہ مزید الجھ گیا اور سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جی!''

"دیکھو، میری بات کا برا نہیں منانا۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "ہمیں تفتیش کے دوران ہر قسم کا سوال پوچھنا پڑتا ہے تاکہ کیس کو جلد از جلد اور صحیح خطوط پر حل کیا جا سکے۔" میں نے تھوڑا توقف کیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہاری بیوی سنگی کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں وہ اطمینان بخش نہیں ہیں۔ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

وہ پلک جھپکتے میں میرے سوال کی تہ میں پہنچ گیا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ "آپ نے کچھ زیادہ غلط نہیں سنا۔"

اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا کرب سمٹ آیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا یہ الفاظ اس کی زبان سے نہیں بلکہ زخمی دل سے خارج ہوئے ہوں۔ ان لمحات میں وہ مجھے بہت ہی بے چارہ نظر آیا۔ میرے ہمدردانہ اور دوستانہ رویے نے اس کا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ میں اس کی کتابِ دل کے اس باب تک پہنچ گیا جو سراسر سنگی کی بے وفائی اور کج ادائی سے متعلق تھا۔ وہاں مجھے آبلے ہی آبلے دکھائی دیئے۔ وہ تمام کا تمام باب ایک ایسے ناسور کی شکل اختیار کر چکا تھا جس میں سے لحہ بہ لحہ مجبوری اور بے بسی کا خون قطرہ قطرہ ٹپکتا رہتا ہے۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم تو اس کے شوہر تھے۔ تمہارا فرض بنتا تھا، اسے سمجھاتے۔" یہ بات میں نے اس حوالے سے یقین ہونے کے بعد کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی پراسرار سرگرمیوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس طرح میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے اختیارات کے راستے میں ایسی کون سی مجبوری تھی جو وہ ایک طویل عرصے سے خاموش بیٹھا سب کچھ سہہ رہا تھا!

یہ سچ ہے کہ ہر شخص کو رونے کے لئے ایک کندھا درکار ہوتا ہے۔ کسی کو اس کی ضرورت کے عین مطابق کب اور کہاں وہ کندھا میسر آ جائے یہ الگ بات ہے۔ ان لمحات میں، میں بشارت کا کندھا بن گیا تھا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین کرنا پڑا کہ آج تک اس کے مسئلے کے بارے میں کسی نے اس سے ایسی سنجیدگی اور اپنائیت سے بات نہیں کی تھی۔ میرا سہارا پا کر اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اس نے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیچھے چھپا لیا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں اسے کیا اور کیسے سمجھاتا۔ اس پر تو کبھی میرا بس نہیں چل سکا۔"

"تم اس کے مجازی خدا تھے!" میں نے محسوس کر لیا کہ لوہا گرم ہے۔ اس وقت لگائی جانے والی چوٹیں بڑی کارآمد اور نتیجہ خیز ثابت ہوں گی۔ "اس پر تمہیں پورا اختیار حاصل

تھا۔ تم زبردستی سے کام لے سکتے تھے۔"

"دنیا یہی سمجھتی ہے، میں اس کا مجازی خدا...... اس کا خاوند تھا......" وہ روہانسا ہو گیا۔

"تو...... تو کیا ایسا نہیں تھا؟" میں نے نرم انداز میں کرید جاری تھا۔

وہ پھٹ پڑا۔ "آج تک سنگی نے مجھے اپنے قریب نہیں آنے دیا!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں چونک اٹھا۔

"آپ سیانے ہیں...... مطلب سمجھ سکتے ہیں......" وہ نحیف آواز میں بولا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا بشارت!" میں نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم پانچ سالہ نوید کے باپ ہو۔"

وہ بڑے جگر پاش لہجے میں گویا ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز موت کے کنوئیں میں سے آ رہی ہو۔ "تھانے دار صاحب! قسمت میں اولاد لکھی ہو تو وہ مل ہی جاتی ہے۔ کبھی باپ کی کوشش سے اور کبھی ماں کے طفیل۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔ اسے اگلنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا کہ نگلنا...... شاید اسی لئے اسے دودھ میں مکھی سے تمثیل کیا جاتا ہے۔ میں استعجابیہ نظر سے اپنے سامنے بیٹھے بشارت کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑی خوش سلیقگی سے جگر خوں کیا تھا۔ بات ختم کرتے ہی وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔

میں نے اسے جی بھر کر رونے دیا تھا کہ اس کے دل کا غبار ڈھل جائے۔ سنگی کے باغیانہ رویوں اور نافرمانی کی روش نے اس کے من کے آئینے کو ملگجا دیا تھا۔ صنم خانۂ دل بڑی عجیب نگری ہے۔ اس کی ویرانی اور سناٹا ہولا دینے والا ہوتا ہے۔ نارسائی اور کج ادائی کی منہ زور آندھیاں جب اس میں چکراتی ہیں تو در و دیوار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ پھر کرب ناک چیخوں کو روکنا اور مجروح جذبات کے سامنے ضبط کا بند باندھنا کارِ دشوار ہو جاتا ہے۔ آنسوؤں کا سیلاب ہر بندش کو تہ و بالا کرتے ہوئے ایسے خوف ناک انداز میں چنگھاڑتا ہے کہ انسانی ذات اس طوفان کے سامنے ایک تنکے کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

بشارت بھی ان لمحات میں ایک حقیر تنکے سے زیادہ ہلکا ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ ہچکیوں اور سسکیوں سے روتا رہا اور اس رونے کے درمیان ہی میں وہ مجھے اپنی داستانِ غم بھی سناتا رہا۔ وہ افسوس بھری شرم ناک داستان جو صغریٰ عرف سنگی نے اپنے جوتے کی نوک سے بشارت کے قرطاسِ دل پر رقم کی تھی۔

بشارت اور سنگی میں بظاہر کوئی ہم آہنگی دکھائی نہیں دیتی تھی اور ان کی خلوت بھی اس

ناہمواری کی تفسیر تھی۔ بشارت اول روز ہی سے اس کے رعبِ حُسن میں آ گیا۔ وہ جب گھور کر اسے دیکھتی تو اس کا پتا پانی ہو جاتا۔ وہ بھول جاتا کہ شگی اس کی بیوی اور وہ اس کا شوہر ہے۔ ان لمحات میں وہ خود کو بیوی کا بے دام غلام سمجھنے لگتا۔ وہ اس کی بات ماننے اور اس کے اشاروں پر ناچنے کے لئے مجبور ہو جاتا۔ وہ شگی کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ کر پاتا۔ شاید یہ ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کا نفسیاتی اثر تھا۔ دوسری جانب بلقیس جس مجبوری اور بے کسی کا شکار تھی، ادھر وہی حالت بشارت کی تھی۔

وہ شگی کے حُسن و جمال کی تپش کے سامنے اس طور مرجھا کر رہ جاتا جیسے بادِ سموم میں گلوں کے غنچے پژمردہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس نے اپنی کمزوری اور شگی کی زور آواری کے سامنے خاموشی اور برداشت کا پردہ گرایا تو اس ڈھیل نے شگی کو بے مہار کر دیا۔ جب زندگی کے کسی بھی معاملے میں اعتدال اور توازن بگڑ جائے تو پھر ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں جیسا واقعہ چودھری غنی کے ڈیرے پر پیش آیا تھا۔

بشارت کی گھسائی سے میں نے یہ تو محسوس کر لیا کہ وہ دہرے قتل کے اس واقعے میں ملوث نہیں تھا لیکن اس کی بے گناہی کے لئے اس کے لنگر وال جانے والے بیان کی تصدیق ضروری تھی اور یہ کام کل صبح ہی ہو سکتا تھا۔

جب بشارت معتدل ہو گیا تو میں نے اس کے ہم زلف کو بھی کمرے میں بلا لیا اور بڑے واضح الفاظ میں کہا۔ ''یہ رات تو بشارت کو تھانے کی حوالات ہی میں گزارنا ہو گی۔ کل میں کسی پولیس اہل کار کو لنگر وال بھیج کر اس کے بیان کو چیک کروں گا۔ اگر اس کی بات درست نکلی تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔''

بشارت بڑے اعتماد سے بولا۔ ''ٹھیک ہے تھانے دار صاحب! مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔''

بشارت کی تائید کے بعد فرمان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ اپنے ساڑھو کو میرے پاس چھوڑ کر بیل گاڑی پر واپس چلا گیا۔ میں نے خصوصی ہدایات کے ساتھ بشارت کو چمن شاہ کے حوالے کیا اور خود اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ ان ہدایات میں سرِ فہرست یہ بات تھی کہ بشارت کو تھانے میں کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہئے۔

میں جب سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو میرا ذہن دہرے قتل کی اسی واردات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرا تجربہ تو یہی کہتا تھا کہ بشارت قاتل نہیں ہو سکتا لیکن دو انسان قتل تو ہوئے تھے۔ اگر یہ کام بشارت نے نہیں کیا تو پھر شگی اور مشتاق کا قاتل کون تھا؟ اس

خطرناک سوال کا جواب مجھے جلد از جلد سوچنا تھا۔

ذہن جب تجزیاتی مراحل سے گزر رہا ہو تو خود بہ خود جمع تفریق اور ضرب تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ اس امر میں کسی بھی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ مشتاق اور شگی کو ان کی بے خبری میں قتل کیا گیا تھا۔ وہ جس مصروفیت میں مشغول تھے اس میں کمرے کی کھڑکی اور دروازہ بند ہونے کا قوی امکان تھا۔ اس کا مطلب تھا، قاتل پہلے سے اس کمرے میں موجود تھا۔ اگر وہ باہر سے آ کر ان پر فائرنگ کرتا تو وہ اس حالت میں موجود نہیں رہ سکتے تھے جس میں پائے گئے تھے۔ باہر سے آنے والے کو کھڑکی یا دروازے کو کھولنا پڑتا اور ایسا ہوتے ہی مشتاق اور شگی کا چونک جانا لازمی تھا۔

فی الواقع چونکہ ایسا نہیں ہوا تھا جس سے یہ نتیجہ سامنے آتا تھا کہ ان پر بے دریغ فائرنگ کرنے والا اسی کمرے میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ بشارت کی ذات اس لئے بھی شک کے دائرے سے نکل جاتی تھی کہ شگی اسے کھانا کھلانے کے بعد ڈیرے کی طرف آئی تھی لہٰذا بشارت کا پہلے سے اس کمرے کے اندر کہیں چھپا ہونا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ میں انہی خیالات کی دنیا میں دوڑتا بھاگتا نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

❀❀❀

اگلے روز صبح ہی صبح ایک محکمہ جاتی ضروری کام سے ہنگامی حالات میں مجھے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر جانا پڑ گیا دوپہر کے بعد جب میں واپس آیا تو تھانے میں میرے لئے ایک اہم اطلاع موجود تھی۔ حوالدار چمن شاہ نے میرے کمرے میں آ کر پُر جوش انداز میں بتایا۔

''ملک صاحب! آلۂ قتل برآمد ہو گیا ہے۔''

''کون سا آلۂ قتل؟'' میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

وہ بولا۔ ''جناب میں اس ریوالور کی بات کر رہا ہوں جس سے شگی اور مشتاق کو قتل کیا گیا ہے۔''

''اوہ!'' میں اچھل پڑا۔ ''کہاں ہے وہ ریوالور...... اور کہاں سے ملا؟''

میرے استفسار کے جواب میں حوالدار نے بتایا کہ مذکورہ ریوالور کو دریافت کرنے کا سہرا فرمان کے سر جاتا تھا۔ صبح میرے جانے کے بعد وہ تھانے آیا اور بتایا کہ اس نے آج صبح جانوروں کو چارا ڈالنے کے لئے جب بیل گاڑی کا رخ کیا تو وہ ریوالور اس کی نظر میں آ گیا۔ رات گھر جانے کے بعد اس نے بیلوں کو کھول کر گاڑی کو صحن کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ گاڑی پر لدے ہوئے چارے کو ایک ڈھیر کی صورت میں گاڑی کے نزدیک

ہی چھوڑ دیا تھا۔ آج صبح جب وہ دروازے کے قریب پہنچ کر جانوروں کے لئے وہاں سے چارہ اٹھانے لگا تو اس کے اندر سے وہ ریوالور نکل آیا تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد حوالدار نے کپڑے میں لپٹے ہوئے ریوالور کو بھی میرے سامنے پیش کر دیا۔ میں نے بہ غور ریوالور کا جائزہ لینے کے بعد چمن شاہ سے پوچھا۔

''کیا یہ ریوالور اسی طرح کپڑے میں لپٹا ہوا ملا ہے؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! کپڑے میں تو اسے میں نے لپیٹا ہے، فرمان اسے ایسے ہی اٹھا لایا تھا۔''

''کیا فرمان اس وقت تھانے میں موجود ہے؟''

''نہیں جناب!'' حوالدار نے جواب دیا۔ ''وہ ریوالور مجھے دے کر واپس گاؤں چلا گیا تھا۔ بتا کر گیا ہے، دوپہر کے بعد آئے گا۔ ہو سکتا ہے، ابھی آ جائے۔''

''کیا اس ریوالور کے بارے میں تم نے بشارت سے پوچھ گچھ کی؟''

''نہیں جناب! ابھی تک اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔''

میں نے صبح ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر جاتے ہوئے کانسٹیبل ساجد کو بشارت کے بیان کی تصدیق کے لئے لنگر وال روانہ کر دیا۔ حوالدار سے میں نے اس کی واپسی کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ نہ صرف ساجد واپس آ گیا ہے بلکہ لنگر وال والے شفیع محمد نے بشارت کے بیان کی تصدیق بھی کر دی ہے۔ میں نے بشارت کے حوالے سے حوالدار کو حکم دیا۔

''ٹھیک ہے، تم اسے میرے پاس بھیج دو۔''

حوالدار کمرے سے رخصت ہو گیا۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ اٹھانے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اور عدالت بھی اس ثبوت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی۔ لیکن چونکہ وہ ریوالور بشارت کی بیل گاڑی میں چارے کے ڈھیر میں سے برآمد ہوا تھا لہٰذا اس سے پوچھ تاچھ ضروری ہو گئی تھی۔ وہ میرے کمرے میں پہنچا تو میں چند لمحات تک ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بشارت! آلۂ قتل برآمد کر لیا گیا ہے۔''

''کہاں سے؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''تمہاری بیل گاڑی پر لدے ہوئے چارے کے ڈھیر میں سے!''

وہ ہکلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''وہاں ...... کس نے ...... رکھا......؟''

''یہ تو تم ہی بتاؤ گے۔'' میں نے کپڑے میں لپٹے ہوئے ریوالور کی ایک جھلک اسے بھی دکھائی۔ ''تمہارے ساڑھو کی دریافت ہے۔ یا تو تم نے اس ریوالور کو چارے کے ڈھیر میں چھپایا تھا اور یا پھر یہ فرمان کا کارنامہ ہے۔''

''مم ...... میں نے تو نہیں چھپایا لیکن......''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ میں نے تحکمانہ انداز میں پوچھا

''لیکن ...... کے بعد تمہاری زبان کو بریک کیوں لگ گئے؟''

وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ ''میرے خیال میں یہ مراد کی شیطانی ہے!''

مراد کے نام نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''پتہ نہیں، میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔'' وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات مجھے کل رات یاد کیوں نہیں آئی۔''

''اب یاد آ گئی ہے تو فوراً مجھے بتا دو۔'' میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دماغ اسے پھر کہیں رکھ کر بھول جائے۔''

وہ اضطراری انداز میں بولا۔ ''جناب! اب میرا دماغ گڑبڑ نہیں کرے گا۔ مجھے اچھی طرح یاد آ گیا ہے، جب میں کٹی ہوئی گھاس کو اپنی بیل گاڑی پر رکھ رہا تھا تو مراد میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک دو باتیں کیں اور کہنے لگا، چاچا لاؤ، گھاس کو بیل گاڑی پر رکھنے میں، میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ میں نے جب کوئی اعتراض نہیں کیا تو وہ میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ اسی وقت مراد نے میری نظر بچا کر یہ ریوالور گھاس والے انبار میں کہیں چھپا دیا ہو گا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''فرمان تو اس قسم کی حرکت ہرگز نہیں کر سکتا۔''

بشارت کے انکشاف نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ مراد کی طرف سے میرے ذہن میں ایک کانٹا سا چبھا ہوا تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ابھی تک اس سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ میں اس کا تفصیلی انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔ وہ مقتول مشتاق کے ساتھ ڈیرے پر رہتا تھا لہٰذا اپنے ساتھی کے قتل پر وہ زیادہ بہتر انداز میں روشنی ڈال سکتا تھا۔

میں نے بشارت سے سوال کیا۔ ''مراد تمہارے پاس کتنے بجے آیا تھا؟''

''میرا خیال ہے اس وقت ساڑھے تین بجے تھے۔'' اس نے بتایا۔

بشارت مجھے بتا چکا تھا کہ وہ لگ بھگ چار بجے اپنے کھیتوں سے لنگر وال کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''جب بیل گاڑی پر گھاس لادنے میں مراد تمہاری مدد کر رہا تھا تو اس دوران تم دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟''

''کوئی خاص نہیں جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے اسی سے پوچھا کہ ڈیرے کی طرف سے میں نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی ہیں، اُدھر خیر خیریت تو ہے نا؟ اس نے جواب میں بتایا کہ پتہ نہیں، وہ تو نہر پار والی زمینوں کی طرف سے آ رہا تھا۔ وہ میرے پاس زیادہ دیر نہیں رکا۔ گھاس کو بیل گاڑی پر رکھوانے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا تو تھوڑی دیر بعد میں بھی لنگر وال کی طرف روانہ ہو گیا۔''

''یہ تم بالکل نئی بات بتا رہے ہو بشارت!'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ''کیا تم نے واقعی ڈیرے کی طرف سے فائرنگ کی آواز سنی تھی؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی، میں بالکل سچ بتا رہا تھا۔ پہلے پریشانی میں یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ اس لئے مراد کی آمد کی طرح یہ بات بھی میں آپ کو نہیں بتا سکا۔''

''تم نے فائرنگ کی وہ آواز مراد کے آنے سے کتنی دیر پہلے سنی تھی؟'' میرے ذہن میں اس وقت ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔

اس نے بتایا۔ ''کوئی ایک گھنٹہ پہلے جناب! لیکن ...... یہ میرا اندازہ ہے۔ دس پندرہ منٹ اوپر نیچے ہو سکتے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے اس نے مزید بتایا۔ ''بس یوں سمجھ لیں کہ گولیاں چلنے کی آواز مجھے سکی کے جانے اور مراد کے آنے کے درمیان سنائی دی تھی۔''

بشارت کے پہلے بیان کے مطابق، سکی اسے کھانا کھلانے کے بعد لگ بھگ ڈیڑھ بجے دوپہر کھیتوں سے رخصت ہو گئی تھی۔ مراد ساڑھے تین بجے بشارت کے پاس پہنچا تھا۔ اس حساب سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ سکی دو بجے ڈیرے پر پہنچی تھی اور تین سے پہلے پہلے اسے مشتاق کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ میرا ایک محتاط اندازہ تھا، ویسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی مشتاق اور سکی کی اموات کے وقت کا تعین کر سکتی تھی۔

میں بشارت سے پوچھ گچھ کر ہی رہا تھا کہ فرمان بھی تھانے پہنچ گیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حالات کی مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اس سے بھی متعدد سوالات کئے اور یہی سمجھ میں آیا کہ دوہرے قتل کی اس واردات کے سلسلے میں ان دونوں کے ہاتھ صاف تھے۔ میں نے اس تنبیہ کے ساتھ انہیں تھانے سے جانے کی اجازت دے دی کہ وہ میرے علم میں لائے بغیر گاؤں سے باہر ایک قدم بھی نہیں نکالیں گے۔

میں چاہتا تو قاتل کی گرفتاری تک بشارت کو اپنے تھانے کی حوالات میں بند رکھ سکتا تھا لیکن اس چھوڑنے کے لئے میرے پاس دو وجوہ تھیں۔ نمبر ایک، وہ واردات کے ممکنہ وقت کے دوران اپنے کھیتوں میں تھا۔ نمبر دو، وہ جیسا تیسا بھی سہی مگر ایک معصوم بچے کا باپ بھی تھا ...... وہ بچہ جو اچانک وقت کے سفاک تھپیڑوں کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کی ماں ہمیشہ کے لئے اس سے چھن گئی تھی اور باپ کو میں نے پچھلے کئی گھنٹوں سے اس سے جدا کر رکھا تھا۔ نوید کا بھولا بھالا چہرہ میرے تصور میں پھرتا تو مجھے اپنے دل میں ایک بے نام سا درد اُبھرتا محسوس ہوتا۔ وہ اپنے والدین کی کوتاہیوں سے واقف نہیں تھا۔ اس معصوم کو ملنے والی سزا میں کمی کرنا میرے اختیار میں تھا لہٰذا میں نے اس کے باپ کو اس تک پہنچا دیا۔

بشارت اور فرمان کے جانے کے بعد میں نے حوالدار چمن شاہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ گزشتہ روز موضع ٹبی سے رخصت ہوتے وقت چودھری غنی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلی صبح یعنی آج مراد کو میرے پاس بھیجے گا۔ چمن شاہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے اس سلسلے میں اس سے استفسار کیا۔

''وہ نا مراد ...... مراد آیا تھا؟''

چمن شاہ فوراً میرا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ اس کیس کی لمحہ بہ لمحہ جزئیات سے آگاہ تھا۔ جواب میں اس نے بتایا۔ ''نہیں ملک صاحب! چودھری غنی کا نوکر مراد ادھر پھٹکا بھی نہیں۔''

''اگر نہیں پھٹکا تو اب اس کے پٹخنے کا وقت آ گیا ہے۔'' میں نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

حوالدار ایک دم ریڈ الرٹ ہو گیا۔ ''آپ حکم کریں ملک صاحب!''

''حکم تو میں بعد میں کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے تم اس سورما کو یہاں تو لے کر آؤ۔''

''ابھی گیا اور ابھی آیا جناب!'' وہ بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو چٹکی بجانے کے سے انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔

میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''تمہیں سیدھا چودھری غنی کے ڈیرے پر پہنچنا ہے۔ مراد اس وقت وہیں ہو گا۔ اپنے ساتھ دو کانسٹیبلوں کو بھی لے جاؤ اور مراد کو گرفتار کر کے فوراً میرے

پاس لے آؤ۔"

میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر مزید کہا۔ "ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چمن شاہ! مراد چاہے جتنی بھی کوشش کر لے لیکن اسے چودھری سے نہیں ملنے دینا۔ تم سیدھا ڈیرے پر جاؤ اور مراد کو گرفتار کر کے سیدھا تھانے آ جاؤ۔"

"میں سمجھ گیا جناب، آپ کیا چاہتے ہیں۔" وہ سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔

حوالدار چمن شاہ کے رخصت ہونے کے بعد میں تازہ ترین حالات پر غور کرنے لگا۔ موجودہ نقشے میں مراد کی ذات انتہائی مشکوک ہو گئی تھی۔ میں نے اس واردات کی تفتیش کے سلسلے میں جن افراد کے ناموں کو دائروں میں بند کیا تھا ان میں سے یہی مراد بچا تھا، باقی سب سے میں نے حتیٰ الامکان پوچھ گچھ کر لی تھی ...... اور بشارت کے انکشافات کے بعد تو مراد کو ٹرائل روم میں لے جانا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے چمن شاہ، مراد کو گرفتار کر کے تھانے آیا۔ وہ اپنی گرفتاری پر بے حد گھبرایا ہوا تھا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود بھی وہ حوالدار کو بڑی بڑی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں نے چمن شاہ سے پوچھا۔

"اس سرکاری سانڈ کو گرفتار کرنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟"

"جناب! اس کی زبان درازی نے بڑی کھپ ڈال رکھی ہے۔" حوالدار نے اسے گھورتے ہوئے بتایا۔ "اپنی باتوں سے ظاہر کر رہا ہے جیسے کوئی بہت بڑا آدمی ہو۔ ایس پی اور ڈی ایس پی تک سفارشوں کی بات کر رہا ہے۔"

"تم نے اس کی زبان بندی کے لئے کوئی وظیفہ نہیں پڑھا؟" میں نے حوالدار کو چھیڑا۔

وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ "دو چار جھانپڑ تو رسید کر دیئے ہیں جناب! باقی آپ موقع دیں گے تو اگلی پچھلی ساری کسر نکال لوں گا۔"

چمن شاہ نے آخری جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ اس جملے کی معنی آفرینی مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ میں نے مراد کو نگاہ میں تولتے ہوئے حوالدار سے کہا۔

"فکر نہ کرو چمن شاہ! اس بندے کے تیور بتاتے ہیں یہ موقع تمہیں ضرور ملے گا۔" میں نے چمن شاہ کو تسلی دی۔ "اپنی زبان درازی کے بدلے اب اسے عمر درازی کی دعائیں مانگنا ہوں گی۔ یہ جو اچھل اچھل کر بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے نا، یہ اس کی ہڈی کا اثر ہے جو اس کا مالک گوشت بھنبھوڑنے کے بعد اس کے آگے ڈالتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے چمن شاہ! بادشاہ سلامت کا کتا، رعایا کو اپنی نظر میں بہت حقیر تصور کرتا ہے۔ اس میں مراد کا زیادہ قصور نہیں!"

"میرے لئے کیا حکم ہے ملک صاحب؟" چمن شاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم اسے تھوڑی دیر کے لئے میرے کمرے میں چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "میں اسے شرافت کی زبان سکھانے اور صداقت کا سبق پڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر اس نے دیانت کا استعمال کیا تو اچھی بات ہے، اس کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔ بصورتِ دیگر یہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ میں اپنی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد اسے تمہیں لوٹا دوں گا۔ پھر تم اپنے ارمان اور اس کی جان نکالنے کے لئے اس کے ساتھ جو جی چاہے سلوک کرنا۔"

میرے ان ڈھکے چھپے اور خطرناک جملوں نے مراد کے کان کھڑے کر دیئے۔ حوالدار کمرے سے نکلا تو میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مراد کی عمر پچیس کے اریب قریب ہو گی۔ وہ عام سی شکل و صورت کا مالک ایک تیز طرار بندہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی لومڑی جیسی مکاری بھری ہوئی تھی۔ اس نے میرے ساتھ تو وہ لب و لہجہ اختیار نہیں کیا جس کا مظاہرہ وہ حوالدار چمن شاہ کے سامنے کر چکا تھا تاہم خاصی برہمی سے اس نے مجھ سے کہا۔

"تھانے دار صاحب! مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہارا جرم بہت ہی سنگین اور خطرناک ہے مراد۔ اگر اپنی زبان سے اقرار کر لو گے تو اپنے اور ہمارے لئے خاصی آسانیاں پیدا کر دو گے ورنہ تم حوالدار سے ہونے والی میری گفتگو سن ہی چکے ہو۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے، چمن شاہ کس سفاک جلاد کا نام ہے۔"

میرے اٹل اور دو ٹوک الفاظ نے اسے دہلا دیا تاہم وہ پھر بھی ہٹ دھرمی کے مظاہرے سے باز نہ آیا اور مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔ "جب میں نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تو پھر اقرار کس بات کا کر لوں؟"

میں نے اپنی میز کی دراز میں سے کپڑے میں لپٹا ہوا وہ ریوالور نکال لیا جو بشارت کی بیل گاڑی والے چارے کے ڈھیر میں سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے بتیس بور کے اس ریوالور کی ایک جھلک مراد کو دکھائی اور اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کو پہچانتے ہو؟"

ریوالور کو دیکھ کر اس کی لومڑی جیسی آنکھوں میں ایک شاطرانہ چمک سی پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میری تجربہ کار نگاہ کو یہ سمجھنے میں

چنداں دشواری پیش نہ آئی کہ وہ اس ریوالور کو بڑی اچھی طرح پہچان گیا تھا۔

ایک لمحے کو گڑبڑانے کے بعد وہ سنبھل کر بولا۔ ''یہ ایک ہتھیار ہے ...... اور کیا؟''

''میں نے پوچھا ہے، کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' میں نے زور دے کر پوچھا۔

وہ ڈھٹائی میں ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ ''میں اسے کیوں پہچانوں؟ اس ہتھیار کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟''

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس ریوالور کا تمہارے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ شرافت سے ہر بات کا اقرار کر لو ورنہ بہت بڑی مصیبت منہ کھولے تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے۔''

''مم ...... میں کس بات کا ...... اقرار کر لوں؟'' اس کی اکڑ پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔

میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس بات کا اقرار کر لو کہ یہ ریوالور تم نے بشارت والی بیل گاڑی پر رکھے چارے کے اندر چھپایا تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' وہ تیز آواز میں بولا۔

میں نے کڑک کر کہا۔ ''یہ تھانہ ہے، تمہاری خالہ جان کا ویہڑا نہیں۔ زیادہ چیخو چلاؤ گے تو زبان کو گدی سے نکال کر باہر پھینک دوں گا۔''

میرے اچانک بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر اس کے جارحانہ پن میں اچھی خاصی کمی واقع ہوئی، معتدل لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں اس ریوالور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''یہ وہ ریوالور ہے جس سے تمہارے ساتھی مشتاق اور بشارت کی بیوی شگی کو قتل کیا گیا ہے اور یہ کام تمہارے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔''

اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ میرے ٹھوس اندازے نے اس کے پاؤں تلے سے گویا زمین کھینچ لی تھی۔ تاہم وہ مزاحمت سے باز نہ آیا اور بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ان دونوں کو میں نے قتل کیا ہے؟''

میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لئے سچ میں تھوڑا جھوٹ شامل کرتے ہوئے کہا۔

''سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ اس ریوالور پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ میں نے ریوالور کا فنگر پرنٹس ٹیسٹ کروایا ہے۔''

وہ میری چال میں آ گیا اور جلدی سے بولا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو......''

بولتے بولتے اچانک وہ رک گیا اور وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ایسی بات کہنے جا رہا تھا جو اس کے لئے پھانسی کے پھندے سے کم ثابت نہ ہوتی۔ میں نے چڑھائی کے انداز کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ اس لئے نہیں ہو سکتا نا کہ تم نے ریوالور کو چارے والے ڈھیر میں چھپاتے وقت اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیئے تھے؟''

''آپ تو مجھے پاگل کر دیں گے۔'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''پاگل تم ہو۔ میں تو تمہارا علاج کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بتاؤ، تم نے کس پاگل پن میں ان دونوں کو قتل کیا؟ انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟''

''میں نے کسی کو قتل وتل نہیں کیا جناب!'' اس کی ہٹ دھرمی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے، شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں حوالدار کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔ چمن شاہ کی تحویل میں پتھر بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور فرفر سبق سنانے لگتے ہیں۔''

''جناب! آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''میں تمہیں اور تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں مراد۔''

''آپ کو کوئی سنگین نوعیت کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔'' وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔

میں نے اسے ایک دبکا مارا۔ ''غلط فہمی کی اولاد! کیا یہ درست ہے کہ کل سہ پہر ساڑھے تین بجے تم کھیتوں میں جا کر بشارت سے ملے تھے اور بیل گاڑی پر چارا لدوانے میں تم نے اس کی مدد کی تھی؟''

وہ بڑے دھڑلے سے مکر گیا۔ ''میں نے تو کل سارا دن بشارت کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''

''تم جب اس کے پاس پہنچے تو اس نے تم سے پوچھا تھا، ادھر ڈیرے کی طرف فائرنگ کیسی ہوئی ہے۔'' میں نے اس کی لومڑی والی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اور تم نے جواب میں بشارت کو بتایا تھا کہ تمہیں فائرنگ کا علم نہیں، تم تو نہر پار والی زمینوں کی جانب سے آ رہے ہو؟''

''یہ بالکل جھوٹ ہے۔'' وہ رٹے رٹائے انداز میں بولا۔

''کیا جھوٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''فائرنگ کا ہونا ...... یا بشارت کا تم سے پوچھنا اور

تمہارا اس کو بتانا؟"

وہ بولا۔ "میں بشارت کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے نہ تو اس سے کسی قسم کی کوئی بات کی ہے اور نہ ہی ملا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے، دوسری بات درست ہے۔" میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ "فائرنگ واقعی ہوئی تھی؟"

"جی ہاں، فائرنگ کی آواز سن کر ہی تو میں ڈیرے کی طرف بھاگا تھا۔"

اس نے میری بچھائی ہوئی پٹڑی پر قدم رکھ دیا تو میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔ "جس وقت تم نے ڈیرے کی سمت فائرنگ کی آواز سنی، تم کہاں پر تھے؟"

"میں نہر کی پرلی طرف والی زمین میں کافی فاصلے پر موجود تھا۔" مراد نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "تم ڈیرے سے اتنی دور اس وقت کیا کر رہے تھے؟"

بشارت کے بیان کردہ حقائق کی یکسر تردید کر کے وہ اپنے جرم پر مُہرِ تصدیق تو ثبت کر ہی چکا تھا۔ اب زبانی اقرار کے لئے اسے گھیر گھار کر جال کی طرف لانا باقی تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

"کل دوپہر کو میں نے اور مشتاق نے ایک ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ہم کوئی ایک بجے کھانے سے فارغ ہوئے تو مشتاق نے مجھ سے کہا کہ میں نہر کی دوسری طرف پائی جانے والی چودھری غنی کی زمینوں میں چلا جاؤں۔ ادھر کچھ کام تھا۔ میں لگ بھگ دو بجے مذکورہ زمینوں میں پہنچا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ مجھے کام میں لگے ابھی کوئی آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ ڈیرے کی طرف سے 'ڈشواں، ڈشواں' فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ میں سارے کام چھوڑ چھاڑ کر ڈیرے کی جانب دوڑا۔ جب میں وہاں پہنچا تو مشتاق اور سنگی کو بڑی خراب حالت میں دیکھا۔ وہ ایک دوسرے پر پڑے، اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے تھے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا پھر سلسلۂ دروغ گوئی کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "انہیں اس شرم ناک حالت میں دیکھ کر میں ساری بات سمجھ گیا اور فوری طور پر میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ مشتاق نے مجھے ڈیرے سے ہٹانے کے لئے ادھر نہر کے پار والی زمینوں پر بھیجا تھا۔ اس کا سنگی کے ساتھ کوئی پروگرام طے تھا جو میری موجودگی میں ممکن نہیں تھا۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ...... ہاں، ایسی ہی بات تھی!"

وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ "مراد! تمہارے بیان سے تو یہ

محسوس ہوتا ہے کہ تم مشتاق اور سنگی کے باہمی ربط و ضبط سے واقف نہیں تھے؟"

"جی ہاں...... بالکل یہی بات ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "کل مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ مشتاق کتنا گہرا آدمی ہے۔ وہ مجھے پہلے بھی کام سے اِدھر اُدھر بھیجتا رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس وقت بھی وہ سنگی سے ملنے کے لئے مجھے ڈیرے سے ہٹانا چاہتا ہو۔ اللہ معاف کرے جناب!" اس نے توبہ کرنے والے انداز میں ہاتھوں سے اپنے دونوں کانوں کو چھوا اور بولا۔

"ان دونوں نے تو بے غیرتی کی انتہا کر دی۔ میں انہیں دیکھ کر چکرا گیا اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مین بھاگا بھاگا چودھری صاحب کے پاس پہنچا۔ انہیں ان دونوں بے حیاؤں کے بارے میں بتایا۔ چودھری صاحب میرے ساتھ ڈیرے پر آئے اور انہیں اس حال میں دیکھ کر تھو، تھو کرنے لگے۔ پھر انہی کی ہدایت پر میں نے مشتاق اور سنگی کی لاشوں کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔ بس، یہ ہے ساری کہانی۔"

"بڑی دلچسپ کہانی تیار کی ہے تم نے او نا مراد......!" میں نے اسے غصیلی نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کہانی کے دو اہم کرداروں کو تم نے سرے سے غائب ہی کر دیا۔"

"سب سے اہم کردار تو مشتاق اور سنگی ہیں جناب!" وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ "ان سے بھی زیادہ اہم کردار ان کے شوہر اور بیوی ہیں...... **یعنی مشتاق** کی بیوی **بلقیس** اور سنگی کا شوہر بشارت۔ تم نے بشارت کے بیان کی تردید کر دی ہے، **بلقیس** کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

"کیا بلقیس نے بھی میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟" وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔

"بہت کچھ کہا ہے۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔

"کیا...... کیا......؟" اس کی تشویش دو چند ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اس کے بیان کی پیشگی تردید کر چکے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب!" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنی زبان سے اقرار کیا ہے کہ مشتاق اور سنگی کے گفتہ اور ناگفتہ کسی بھی قسم کے تعلقات کا تمہیں علم نہیں تھا لیکن دوسری طرف تم بلقیس کو گاہے گاہے یہ پٹیاں پڑھاتے رہے ہو کہ وہ اپنے خاوند پر نظر رکھے کیونکہ اس کا سنگی کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے...... حتیٰ کہ سنگی مشتاق سے ملنے ڈیرے پر

بھی آتی رہتی ہے۔" ذرا رک کر میں نے زہریلے انداز میں اضافہ کیا۔ "تمہارے پاس جھوٹوں کا ذخیرہ ختم ہو جائے تو مجھے اشارہ کر دینا تاکہ میں تمہیں چمن شاہ کے حوالے کر دوں!"

"یہ...... یہ بات بالکل جھوٹی ہے۔" وہ نحیف سی آواز میں منمنایا۔ "میں نے کبھی بلقیس سے ایسی باتیں نہیں کیں۔"

اس کے لہجے کی شکستگی بتاتی تھی کہ وہ ہار ماننے کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بشارت جھوٹا ہے۔ بلقیس نے بھی تمہارے سلسلے میں غلط بیانی کی ہے لیکن میری ایک بات کو ذہن نشین کر لو کہ تم میرے ہتھے چڑھے ہو تو میں تھانے سے تمہیں سیدھا عدالت میں پہنچاؤں گا اور تمہارے ساتھ ساتھ استغاثہ کے ان دونوں گواہوں کو بھی ...... پھر بلقیس اور بشارت کی گواہی عدالت سے تمہیں سیدھا جیل بھجوا دے گی۔ اگر تمہارے ذہن میں کسی قسم کا کیڑا کلبلا رہا ہو تو اسے جھاڑ کر میری بات کو وہاں جگہ دو۔"

وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے تھیوری کے ساتھ ساتھ پریکٹیکل کی بھی ضرورت ہے۔ ہمارے تھانے کی ضیافت کا لطف اٹھائے بغیر وہ مانے گا نہیں۔ خاطر مدارات کو ضروری جانتے ہوئے میں نے حوالدار کو اپنے پاس بلا لیا اور کہا۔

"چمن شاہ! یہ تمہارا کیس ہے۔ میں اسے ایک رات کے لئے تمہاری حوالداری میں دیتا ہوں۔ تم بتا رہے تھے نا، تمہارے ہاتھ پاؤں میں ایک عجیب سی خارش ہو رہی ہے۔ یہ نا مراد ایک ایسا مرہم ہے جسے تم اپنی تکلیف دور کرنے کے لئے "استعمال" کر سکتے ہو!"

میں نے لفظ "استعمال" پر زور دیا تو چمن شاہ کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ مراد کو دھکیلتے ہوئے میرے کمرے سے لے گیا۔ میں نے مراد سے اقبالِ جرم کروانے کے لئے زمین تیار کر دی تھی۔ اوپر کا کام حوالدار خود کر لیتا۔

اندھیرا پھیلنے سے پہلے چودھری غنی تھانے پہنچ گیا۔ مراد کی گرفتاری کی خبر زیادہ دیر تک اس سے چھپی نہیں رہی تھی۔ وہ اس وقت خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔ وہ سیدھا میرے کمرے میں آیا اور چھوٹتے ہی بولا۔

"ملک صاحب! یہ آپ نے کیا اندھیر مچا رکھا ہے؟"

"کیوں، کیا ہو گیا چودھری صاحب؟" میں یکسر انجان بن گیا۔

وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "قاتل کو کھلا چھوڑ کر آپ نے ایک بے گناہ کو تھانے میں بند کر رکھا ہے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ تاہم بدستور انجان بنا رہا۔ "آپ کس قاتل اور بے گناہ کا ذکر کر رہے ہیں چودھری صاحب؟"

"میں بشارت اور مراد کی بات کر رہا ہوں۔" وہ پھٹ پڑا۔

"اچھا!" میں نے بے اعتنائی سے کہا۔ "تو آپ کے خیال میں بشارت قاتل اور مراد بے گناہ ہے؟"

"اس میں کیا شک ہے!" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

"آپ کے پاس بشارت کے جرم اور مراد کی بے گناہی کا کوئی ثبوت ہے؟"

وہ گھورتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ثبوت تو آپ کے پاس بھی کوئی نہیں!"

"یہ آپ کی غلط فہمی بلکہ خوش فہمی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں مذکورہ دونوں افراد کے سلسلے میں بہت سے ثبوت اکٹھے کر چکا ہوں۔ انشاء اللہ صبح تک دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

وہ مجھے اس چودھری غنی سے قطعی مختلف نظر آیا جس سے میں نے کل ملاقات کی تھی۔ اس وقت چودھری کا رویہ تعاون آمیز تھا اور اب انتہائی جارحانہ اور بدتمیزانہ۔ شاید یہ مراد کی گرفتاری کا نتیجہ تھا۔ مراد اس کا خاص بندہ تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں مراد کی گرفتاری سے چودھری غنی کی کوئی کور تو نہیں دب رہی؟

میرے انداز نے اس کی برہمی میں چار چاند لگا دیئے۔ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ یا تو آپ بشارت کو بھی بند کریں یا پھر مراد کو بھی چھوڑ دیں۔"

میں نے بھی اسی کے انداز کو اپناتے ہوئے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب آپ مجھے تھانے داری سکھائیں گے چودھری صاحب؟"

"آپ اچھا نہیں کر رہے ملک جی!" اس کے اس جملے میں سنگین دھمکی چھپی ہوئی تھی۔

میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، اچھی طرح سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں اور میں اپنے کام میں کسی کی بھی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

میرے اس انتہائی خشک اور سخت رویئے پر وہ چند لمحے معاندانہ نظر سے مجھے گھورتا رہا پھر پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا۔ "میں مراد سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"مراد اس وقت زیرِ تفتیش ہے۔" میں نے کہا۔ "سر دست آپ کی اس سے ملاقات نہیں ہوسکتی۔ آپ کل دن میں کسی وقت تشریف لائیں تو میں آپ کی درخواست پر ضرور غور کروں گا۔"

وہ پاؤں پٹخ کر جانے لگا تو میں نے پوچھ لیا۔ "چودھری صاحب! وہ آپ کے عرق النساء کا کیا حال ہے؟"

"میں آپ کو دیکھ لوں گا تھانے دار جی!" وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔

"چودھری صاحب! بتا کر دیکھنے آنا تاکہ میں تیار شیار ہو کر بیٹھوں۔"

"ہوں!" وہ مجھے تیز نظر سے گھور کر کمرے سے نکل گیا۔

میں نے اس کے جانے کے بعد حوالدار چمن شاہ کو اپنے پاس بلایا اور مراد کے بارے میں ضروری ہدایات دینے کے بعد کہا۔ "چودھری غنی یا اس کا کوئی بھی بندہ اگر حوالاتی سے ملنے آئے تو اسے حوالات کی جانب قدم بھی نہیں رکھنے دینا۔" میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور اگر کوئی زور زبردستی سے حوالاتی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے تو پورے قانونی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے اسے بھی بند کر دینا۔ چودھری کی کسی بھی دھونس دھمکی میں آنے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں ملک صاحب۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

اس کے بعد میں تھانے سے اٹھا اور اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

❋❋❋

اگلا دن بڑا ہنگامہ خیز گزرا!

صبح سرکاری ہسپتال سے مشتاق اور سگی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں آ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق وقوعہ کے روز مقتولین کی اموات دوپہر دو سے تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھیں۔ یہ رپورٹ میرے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے بتاتی تھی کہ مقتول مشتاق اور سگی کو ان کی بے خبری میں گولیوں سے بھون کر رکھ دیا گیا تھا۔ ان پر اتنی اچانک فائرنگ ہوئی کہ وہ سنبھل بھی نہ سکے اور جوں کے توں لقمہ اجل بن گئے۔ تفصیل کے مطابق، بتیس بور کی چار گولیاں مشتاق کے جسم میں اور دو گولیاں سگی کے بدن میں پیوست ہوئی تھیں اور مقتولین کی پیوستگی کو امر کر گئی

تھیں!

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد مقتولین کے ورثا کو تھانے بلا کر لاشیں ان کے حوالے کر دیں۔ اس مصروفیات اور افراتفری میں، میں مراد کی خبر نہ لے سکا۔ ذرا سر کھجانے کی فرصت میسر آئی تو میں نے چمن شاہ نے استفسار کیا۔

"ہاں بھئی شاہ جی! حوالاتی کا کیا حال ہے؟ اس نے زبان کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا یا تم اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں ملک صاحب؟" وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "آپ کا شاگرد ہوں سر جی! ناکام کیسے ہوسکتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے اس نامراد سے اقرارِ جرم کروالیا ہے۔"

"کیسے نہیں کراتا اقرارِ جرم!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میں نے اس کے منحوس جبڑوں پر جبر کا وہ زنبور آزمایا ہے کہ زبان کھولنا تو رہا ایک طرف، اس کی گز بھر زبان باہر نکل آئی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ بیان دینے پر تیار ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسے یہاں میرے پاس لے آؤ۔"

حوالدار اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تفتیش ایک پیچیدہ اور متضاد الخیال عمل ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ پولیس کی بربریت اور سفاکی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور بعض اسے انتہائی جائز قرار دیتے ہیں۔ میرے نزدیک نظریۂ ضرورت کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک ہوشیار اور تجربہ کار پولیس آفیسر کو یہ اندازہ ہونا چاہئے کہ کس ملزم سے زبانی کلامی دھمکی ڈراوے کی تفتیش کرنا ہے اور کون سا ملزم ٹرائل روم کی زینت بننے کا حق دار ہے۔ اس کی بہترین مثال بشارت اور مراد سے میرا برتاؤ ہے۔ میں نے دونوں کے ساتھ ان کی پوزیشن اور جرم کی نوعیت کے مطابق سلوک کیا تھا۔ پیشہ ور اور ڈھیٹ ہڈی والے مجرموں کو تفتیش کی چکی میں پیسنا لازمی ہو جاتا ہے ورنہ خطرناک ڈاکو اور اشتہاری مجرم اتنے شریف النفس نہیں ہوتے کہ دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر بڑی عاجزی سے کہیں۔

"تھانے دار صاحب! ہمیں ہتھکڑی پہنا دیں۔ ہم اپنے جرم کا اقبال کرتے ہیں!"

آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نے مراد کا اقبالی بیان نوٹ کر لیا۔ اس نے مشتاق اور سگی کے قتل کا اقرار کر لیا۔ میں سمجھ رہا تھا وجۂ قتل حسد اور رقابت ہو گی۔ لیکن مراد کے انکشاف

نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے مطابق اس نے یہ جرم چودھری غنی کے ایما پر کیا تھا۔

واقعات کی تفصیل کے مطابق سنگی اور چودھری غنی کے مابین کوئی چکر چلتا رہا تھا۔ اس چکر کا آغاز ان دنوں ہوا جب سنگی نے چودھری کی مفلوج بیوی کی مالش کرنے کے لئے ہفتے میں ایک مرتبہ حویلی جانا شروع کیا تھا۔ سنگی چودھری کی بیوی نرگس کی بہ نسبت چودھری کے زیادہ قریب ہوگئی۔ ان کے بیچ یہ کھیل بڑی کامیابی سے جاری تھا کہ چودھری کو پتہ چلا، سنگی اس کے ایک ملازم مشتاق سے بھی منسلک ہے۔ یہ انکشاف چودھری کے لئے ناقابلِ برداشت تکلیف کا باعث تھا۔

اس نے فرداً فرداً سنگی اور مشتاق کو ڈرانے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سنگی کو صرف خود تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ بظاہر یہی محسوس ہوا کہ وہ دونوں چودھری کے ڈرانے سے ڈر گئے ہیں لیکن ان کے بیچ ایک ایسی آتش بھڑک اٹھی تھی جس نے انہیں نڈر اور بے حد بہادر بنا دیا تھا۔ وہ چودھری کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس خطرناک کھیل کو کھیلتے رہے۔

چودھری نے انہیں ''راہِ راست'' پر لانے کے لئے مراد کے ذریعے ایک کوشش کی اور اس کی زبانی بلقیس کو کہلوایا کہ وہ اپنے شوہر پر نظر رکھے۔ اس سلسلے میں بلقیس انتہائی بودا مہرہ ثابت ہوا۔ بالآخر چودھری نے ان دونوں کا پتا صاف کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ مشتاق اور سنگی کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کے لئے اس نے مراد کا انتخاب کر لیا۔

وقوعہ کے روز مراد ہی نے ماسی مختاراں کو سنگی کے گھر بھیجا تھا اور کہا تھا کہ مشتاق نے دوپہر میں اسے ڈیرے پر بلایا ہے۔ چودھری کی حویلی جانے والی کہانی سنگی نے اپنی سیفٹی کے لئے خود ہی گھڑی تھی۔ اس بات میں بھی کسی حقیقت کا امکان نہیں کہ مشتاق نے مراد کو نہر پار والی زمین کی طرف بھیجا تھا۔ مراد جانتا تھا کہ سنگی بشارت کو کھانا کھلانے کے بعد سیدھی مشتاق سے ملنے ڈیرے پر آئے گی لہٰذا وقت کا حساب کتاب ذہن میں جوڑتے ہوئے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے خود ہی مشتاق سے کہا کہ وہ نہر پار والی زمینوں کی طرف جا رہا ہے۔ ان کے درمیان جب یہ بات ہوئی تو اس وقت مشتاق ٹیوب ویل والے کمرے میں موجود تھا۔ مراد نے چالاکی کا مظاہرہ کیا اور مشتاق کے سامنے ڈیرے سے نکل گیا لیکن ڈیرے کی عقبی سمت گھوم کر وہ رہائشی کمرے والی کھڑکی کے راستے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کمرے میں اس کی مستقل رہائش تھی لہٰذا وہاں کی ایک ایک شے سے وہ بہ خوبی آگاہ تھا۔ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک قدِ آدم چوبی تخت کھڑا تھا۔ یہ انتظام مراد نے خاص طور پر اس دن کے لئے کیا تھا۔ وہ مشتاق کے ٹیوب ویل والے کمرے سے

واپس رہائشی کمرے کی جانب آنے سے پہلے اس چوبی تخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ چھ گولیوں والا بتیس بور کا بھرا ہوا ریوالور اس کے پاس تھا۔ اس کے بعد تمام مراحل اس کی توقع اور پروگرام کے مطابق طے ہوتے چلے گئے۔

سنگی کی آمد پر مشتاق نے کمرے کا دروازہ اور کھڑکی بند کر لی۔ اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ مراد چار بجے سے پہلے واپس ڈیرے پر نہیں آئے گا۔ اس بے فکری نے ان دونوں کو زیادہ فعال بنا دیا۔ ویسے وہ ایک دوسرے کے حصول میں اب اتنے اندھے ہو چکے تھے کہ انہیں کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اپنی جبلی خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہوئے، مراد آہستگی سے چوبی تخت کے عقب سے نمودار ہوا اور اس نے بے دریغ فائرنگ کر کے انہیں انہی کے خون میں نہلا دیا۔ اس نے بتیس بور کا بھرا ہوا ریوالور ان دونوں کے جسموں میں خالی کر دیا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ مشتاق اور سنگی میں سے کوئی زندہ نہیں رہا تو اس نے چوبی تخت کو رہائشی کمرے میں سے نکال کر اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں دیگر ناکارہ اور غیر استعمال شدہ سامان پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو وہ تخت مجھے اس کمرے میں کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

ڈیرے کی ''سیٹنگ'' کے بعد مراد آلۂ قتل کو لے کر بشارت کے کھیتوں میں پہنچ گیا۔ وہ ریوالور کو چودھری کی پلاننگ کے مطابق بشارت کے سامان میں کہیں ڈالنا چاہتا تھا تاکہ بعد ازاں جب آلۂ قتل بشارت کے پاس سے برآمد ہو تو پولیس منطقی انداز میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ بشارت نے غیرت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کو اس کے آشنا سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ چودھری غنی نے میرا ذہن بھی اسی رخ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن چودھری اور مراد کی بدقسمتی کہ وقت کی ایک ہی کروٹ نے حالات کی بساط الٹ دی تھی۔

مراد کا اقبالی بیان بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس نے چودھری غنی کے ایماء پر سنگی اور مشتاق کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ قاتل اگرچہ وہی تھا لیکن اس دہرے قتل کا حکم دینے والا بھی اس سنگین جرم میں برابر کا شریک تھا۔ مشتاق کا اقرارِ جرم چودھری غنی کو جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پھینکنے کے لئے کافی تھا۔

چودھری کی گرفتاری اس کے شایانِ شان ہونا چاہئے تھی لہٰذا میں نے خود موضع ٹبی جانے کا فیصلہ کیا اور حوالدار چمن شاہ سے کہا۔ وہ اس وقت میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

مراد کو بیان کے بعد دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔

''میری غیر موجودگی میں تمہیں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اقبالِ جرم کے بعد حوالاتی مراد ہمارے لئے بہت زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ اس کی طرف سے محتاط رہنا۔ ویسے میں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔''

''آپ مطمئن ہو کر جائیں ملک صاحب!'' چمن شاہ نے پُر اعتماد میں کہا پھر پوچھنے لگا۔

''کیا آپ ادھر اکیلے ہی جائیں گے؟''

''میں کانسٹیبل آفتاب کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جناب! یہاں کے معاملات کو میں دیکھ لوں گا۔'' حوالدار نے کہا۔

اس روز کانسٹیبل ساجد تھانے میں موجود نہیں تھا۔ گزشتہ رات اس کی والدہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور میں نے اسے چھٹی دے دی تھی۔ حوالدار نے میرے لئے ایک تانگے کا بندوبست کر دیا اور میں آفتاب کے ساتھ اس تانگے میں بیٹھ کر موضع ٹبی کی سمت روانہ ہو گیا۔

بشارت کے تفصیلی بیان، آلۂ قتل کی برآمدگی اور تازہ ترین حالات کے پیشِ نظر میں یہ سوچنے پر تو مجبور ہو گیا تھا کہ شگی اور مشتاق کے قتل میں مراد کا غالب ہاتھ ہے۔ وجۂ قتل میرے ذہن میں یہ آ رہی تھی کہ شگی کے حوالے سے مراد، مشتاق سے حسد کرتا ہو گا۔ وہ دونوں چودھری غنی کے ملازم تھے اور شگی، مراد کو نظر انداز کر کے مشتاق پر مٹی جا رہی تھی۔ ممکن ہے، مراد نے اپنی نامرادی کا بدلہ لینے کے لئے انہیں نمونۂ عبرت بنا دیا ہو لیکن میری تحویل میں مراد نے جو سنسنی خیز بیان دیا، وہ چودھری غنی کے گھناؤنے کردار کو بڑے واضح انداز میں اُجاگر کرتا تھا۔ اس بدفطرت شخص کو کڑی سے کڑی سزا ملنا چاہئے تھی ...... اور میں اسی سلسلے میں موضع ٹبی جا رہا تھا۔

میرا تھانہ نجیب آباد میں واقع تھا اور اس قصبے سے ایک کچا راستہ ٹبی کی طرف جاتا تھا۔ ہم لگ بھگ گیارہ بجے دوپہر مذکورہ گاؤں پہنچ گئے۔ چودھری غنی کی حویلی گاؤں کے آخری سرے پر جنوبی سمت میں واقع تھی۔ مئی کے مہینے میں گیارہ بجے اچھی خاصی گرمی تھی، یوں محسوس ہوتا تھا سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔

ہمارا تانگہ ابھی حویلی سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھا کہ سامنے سے مجھے فرمان آتا دکھائی دیا۔ اس نے مجھے تانگے میں بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ وہ گلی میں ہی رک گیا۔ جب تانگہ اس کے قریب پہنچا تو میں نے کوچ بان سے تانگہ روکنے کو کہا۔

تانگہ رکتے ہی فرمان جلدی سے میرے قریب آ گیا اور سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! ہم نے سنا ہے آپ نے شگی کے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے؟''

مراد کی گرفتاری کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ میں نے فرمان کے سوال کے جواب میں کہا۔

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔''

''کیا اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے؟''

میں نے گول مول جواب دیا۔ ''ابھی تفتیش جاری ہے۔''

''پتہ نہیں، اس بدبخت کو شگی سے کیا دشمنی تھی۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''آج تک کسی قسم کی کوئی بدمزگی تو سننے میں نہیں آئی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے، شگی سے نہیں بلکہ مشتاق سے اسے کوئی پرخاش ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ اصل نشانے کی راہ میں کوئی اور آ جاتا ہے اور گندم کے ساتھ گھن بھی پسنے کے مصداق نشانے کی راہ میں آنے والا بھی بری طرح مارا جاتا ہے۔''

اس کیس کی صورتِ حال پوری طرح مجھ پر واضح ہو چکی تھی لیکن میں دانستہ فرمان کو قبل از وقت اس تفصیل سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوچنے والے انداز میں بولا۔

''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

''بس جی، شگی کے کفن دفن کے بندوبست میں لگے ہوئے ہیں۔'' وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ''ظہر کی نماز کے بعد اس کی میت اٹھے گی۔''

آج اس گاؤں میں دو جنازے اٹھنے والے تھے اور یہ دونوں افراد ایک جیسے باہمی اعمال کے باعث ایک جیسی موت کا شکار ہو کر اس دنیا سے اٹھے تھے اور ظاہر ہے، ان دونوں کو اسی گاؤں کے ایک ہی قبرستان میں دفن ہونا تھا۔ مستقبل کا کوئی مؤرخ ان دونوں کی قبروں کو دیکھ کر اور ان کے بارے میں جان کر جو کچھ بھی رقم کرے گا، وہ نہایت ہی عبرت ناک اور سبق آموز ہو گا، بشرط یہ کہ اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ حضرت انسان عموماً کسی غلطی سے عبرت پکڑنے کی بجائے اسے دہرانے کی کوشش کرتا ہے ...... اور وہ بھی اس زعم کے ساتھ کہ وہ ویسی غلطی نہیں کرے گا۔ ٹھیک ہے، وہ ویسی غلطی نہیں کرتا لیکن جیسی تیسی کیسی ایسی غلطی کرتا ضرور ہے!

میں نے فرمان سے پوچھا۔ ''ننھے نوید کا کیا حال ہے؟''

"بہت برا حال ہے۔ اس نے اپنی ماں کی موت کو محسوس کر لیا ہے۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "میت والے گھر میں کس کس بات کو چھپایا جائے۔ تعزیت کے لئے آنے والے حسب توفیق رونا پیٹنا بھی کر رہے ہیں۔ نوید کو سمجھانا اور سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اور ...... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے ماں کی صورت کہیں دکھائی نہیں دے رہی!"

میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "ہاں، اس ننھی سی جان پر اچانک بہت بڑی افتاد آن پڑی ہے۔ یہ واقعہ اس کی زندگی کا پہلا صدمہ ہے۔"

"میں اس کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں جی۔" وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آگے اللہ کی مرضی!"

میں نے نوید کے باپ اور منہ زور مقتولہ کے دبّو شوہر کے بارے میں فرمان سے استفسار کیا تو اس نے افسوس ناک انداز میں جواب دیا۔

"پتہ نہیں، کیا ہوا ہے جناب! بشارت کو ایک چپ سی لگ گئی ہے۔"

"فکر نہ کرو، رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

اس کے بعد ہمارا تانگہ چودھری غنی کی حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

جب ہم اس حویلی کے سامنے پہنچے تو وہ کہیں جانے کے لئے گھر سے نکل رہا تھا۔ حویلی کے باہر ایک سجا سجایا تانگہ کھڑا تھا۔ یقیناً مذکورہ تانگہ چوہدری ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ تانگے کی طرح چودھری نے خود کو بھی خوب بنا سنوار رکھا تھا۔ پتہ نہیں، وہ تانگے سے مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا یا گھوڑے سے!

اس نے مجھے تانگے سے اترتے دیکھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اگر ہمیں وہاں پہنچنے میں چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو یقیناً وہ عیار شخص کہیں روانہ ہو چکا ہوتا۔ میں چودھری کی گرفتاری کے تمام تر لوازمات کے ساتھ آیا تھا لیکن میرے جی میں آئی کہ اس سے تھوڑی تفریح لی جائے۔ ذرا یہ تو معلوم کیا جائے، وہ بن ٹھن کر کدھر جا رہا تھا۔

میں نے اس کے قریب آتے ہی پوچھا۔ "چودھری صاحب! خیریت تو ہے ...... صبح ہی صبح تیار شیار ہو کر کدھر کا ارادہ ہے؟"

"آپ کو یہ صبح ہی صبح نظر آ رہی ہے؟" وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چلیں، صبح نہ سہی، اکھر ہی سہی۔"

میں فل تفریح کے موڈ میں تھا۔ وہ چونکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ اکھر کیا ہوتی ہے؟"

"دوپہر کی چھوٹی بہن۔" میں نے لہجے کو حتی الامکان سنجیدہ رکھتے ہوئے کہا۔ "جیسے سہ پہر کی چھوٹی بہن دوپہر ...... اور ان سب کی اماں چار پہر!"

وہ ناپسندیدہ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "مجھے فضول گوئی قطعی ناپسند ہے۔"

"وہ تو آپ کے لہجہ مبارک سے ہی محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"میری حویلی پر کیا لینے آئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"پہلے آپ بتائیں، آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

وہ بڑی رعونت سے بولا۔ "میں اپنا پروگرام ہر کس و ناکس کے سامنے بیان نہیں کرتا۔"

"مگر میں ایسا کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ کی بہت یاد آ رہی تھی ...... اور سنائیں، آپ کے غرق النسا کا کیا حال ہے؟"

میں نے عرق النسا کو بگاڑ کر غرق النسا کہا تو چودھری نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے ابھی کچا چبا جائے گا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ پھنکار سے مشابہہ آواز میں بولا۔ "کیا آپ صرف میری ٹانگ کا احوال پوچھنے آئے ہیں؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے گزشتہ رات آپ کو خواب میں دیکھا تھا۔" میں نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے بہت پریشان نظر آئے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے آپ کے علاج سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ سب نے متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی متاثرہ ٹانگ کو کولہے کے مقام سے کاٹ دیا جائے اسی سبب میں نے عرق النسا کو غرق النسا سے تعبیر کیا ہے۔ یہ آپ کی غرقابی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ بہرحال، اب تو بتا دیں کہ کہاں جا رہے ہیں......؟"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بڑے کروفر سے بولا۔ "میں تو اس وقت ڈی ایس پی صاحب سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"اوہ! اس کا مطلب ہے، کوئی خاص مسئلہ درپیش ہے۔" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

"ملک صاحب! جن افسران کے دفتروں کے سامنے آپ کو اٹین شین کھڑے ہونا پڑتا ہے اور جنہیں سلیوٹ مارنا آپ پر لازم ہے، وہ میرے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔" اس کے لہجے کی رعونت انتہا درجے کو پہنچ گئی۔ "آپ کو اندازہ نہیں، چودھری غنی کس طاقت کا نام ہے۔"

وہ میری طرف سے کچھ زیادہ ہی تیار ہوا تھا۔ اس نے انتہائی بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے حویلی کے اندر لے جانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ اسے یہ بات قطعی پسند نہیں آئی تھی کہ میں نے اس کے ایک خاص بندے کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا تھا اور جسے وہ پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کا خواہاں تھا اسے میں نے آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ اس احمق چودھری کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ کوئی لمحہ جاتا تھا، میں اسے بھی حوالات میں بند کر کے اس شخص کا ہم پلّہ بنانے والا تھا جسے وہ سالہا سال سے اپنے قدموں میں بٹھاتا آیا تھا۔

''چودھری صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے ادھر تھانے میں آپ کے اثر و رسوخ اور طاقت کا بخوبی اندازہ کیا۔ تجربہ ہو چکا ہے۔'' میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''جناب! ادھر تھانے میں ایک بہت بڑے افسر کے بھیجے ہوئے بندے آئے بیٹھے ہیں۔'' میں نے اس ڈیڑھ ہوشیار چودھری کو فل ٹائم بے وقوف بناتے ہوئے کہا۔ ''شاید آپ نے کہیں بہت اوپر میری شکایت کر دی ہے۔''

مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اندھیرے میں چھوڑا ہوا وہ تیر ٹھیک نشانے پر جا کر بیٹھا تھا۔

''آپ نے بھی تو بہت زیادہ اندھیر مچا رکھی تھی!'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کی اس بات سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس نے میرے خلاف اوپر کہیں نہ کہیں زہر اگلنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ میں نے اسے ایک خوش فہمی میں مسلسل مبتلا رکھتے ہوئے کہا۔

''جناب! جو ہوا، سو ہوا۔ اب آپ میرے ساتھ تھانے چلیں۔ ڈی ایس پی صاحب سے بعد میں ملتے رہنا۔ پہلے مراد والا معاملہ نمٹاتے ہیں۔ میں تو اسے بند کر کے بہت پچھتا رہا ہوں۔''

میری اس چال نے بڑا کام دکھایا۔ وہ یہی سمجھا کہ اس کی کوئی سورس کام آ گئی ہے۔ میں جو کل اس سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہا تھا، آج خوشامدانہ انداز میں اسے اپنے ساتھ تھانے چلنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ میرے چکر میں آ گیا اور گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''وہاں تھانے میں کون آیا بیٹھا ہے...... کیا ایس پی صاحب نے کسی کو بھیجا ہے؟''

جوشِ جذبات میں وہ اپنے دل کا راز اگل بیٹھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس نے ایس پی صاحب سے میری شکایت کی ہو گی۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''جب ہم تھانے جا ہی رہے ہیں تو پھر یہاں کھڑے ہو کر گفتگو کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آئیں چودھری صاحب! آپ بھی ہمارے ہی تانگے میں تشریف لے آئیں۔''

وہ ایک لمحے کے تامل کے بعد بولا۔ ''ایسا کریں، آپ میرے تانگے میں بیٹھ جائیں۔''

''جیسے آپ کی مرضی چودھری صاحب!'' میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہہ دیا۔

اس کے بعد میں نے کانسٹیبل آفتاب کو اسی تانگے میں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی جس میں ہم وہاں پہنچے تھے اور میں چودھری والے تانگے میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں تانگے آگے پیچھے تھانے کی جانب روانہ ہو گئے۔

میں اگر چاہتا تو اسی وقت چودھری غنی کو اس کی حویلی کے سامنے گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لا سکتا تھا۔ اسے آہنی زیور پہنانے کے لئے میرے پاس بڑا مضبوط جواز تھا۔ مراد کی گواہی اسے نامراد کرنے کے لئے کافی تھی...... لیکن پتہ نہیں کیوں، اچانک ہی میرے ذہن میں یہ ترکیب چمکی کہ اس کی گرفتاری کو ڈرامائی ٹچ دینا چاہئے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد گرفتاری ہوتی!

میں چودھری کے ساتھ اس طرح لگ کر محتاط بیٹھا تھا کہ بالفرض اگر وہ اچانک اٹھ کر بھاگنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے قابو کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آتی۔ راستے بھر ہمارے درمیان ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی رہی۔ وہ یہ جاننے کے لئے بہت بے چین تھا کہ میں کس کے اثر سے رام ہوا ہوں۔ لیکن میں نے بھی اسے کچھ نہ بتانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

جب ہم ''ڈراما، ڈراما'' کھیل ہی رہے تھے تو پھر ڈراپ سین بھی تھانے میں پہنچنے کے بعد ہی ہونا چاہئے تھا۔ میری ترتیب دی ہوئی کہانی بلاشبہ ''لاسٹ لائن اسٹوری'' ثابت ہونے والی تھی۔

ہم تھانے پہنچے تو مجھے چودھری غنی سے بے تکلفانہ گفتگو کرتے دیکھ کر حوالدار چمن شاہ کو بے حد حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ جب میں اپنے کمرے میں آیا تو چمن شاہ کمرے کے باہر ہی رک گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے امید تھی، میرے اور چودھری کے درمیان ہونے والی باتیں من و عن چمن شاہ تک پہنچ جائیں گی۔

چودھری نے کمرے میں چاروں جانب متلاشی نگاہ دوڑائی اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھنے

کے بعد بڑے ٹھکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''وہ بندے کہاں ہیں جن کا ذکر آپ نے کیا تھا؟''

''بندے نہیں چودھری صاحب ...... بندہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''چلیں، بندہ ہی سہی۔ لیکن وہ ہے کدھر؟''

''افوہ!'' میں نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے افسوس ناک انداز میں کہا۔

چودھری غنی بڑے اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، آپ ہی بتائیں گے۔'' میں نے کہا۔

وہ پریشان ہو گیا، بولا۔ ''میرے ساتھ ایسا کیا ہو رہا ہے جناب؟''

''میں محسوس کر رہا ہوں، عرق النسا نے آپ کی بصارت کو بھی اچھا خاصا متاثر کیا ہے۔'' میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

وہ بھڑک اٹھا۔ ''یہ کیا بکواس ہے۔ عرق النسا یہاں بھی پہنچ گیا؟''

''یہ بکواس نہیں، ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے چودھری صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ عرق النسا تو آپ کو اب کسی ٹھکانے لگا کر ہی چھوڑے گا۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں! میں آپ کے سامنے یونیفارم پہنے بیٹھا ہوں اور آپ کہہ رہے ہیں، میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ میں......''

''میں اس بندے کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''وہ بندہ میں ہی ہوں۔'' میں نے بڑی رسانیت سے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''جیسے یہ ہو گیا ہے، ویسے ہی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چودھری صاحب! ایمانداری اور فرض شناسی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ صفات اگر ایک فٹ کانسٹیبل میں بھی ہوں تو وہ آئی جی، ڈی آئی جی سے زیادہ بھاری ہو جاتا ہے۔ میں تو پھر تین پھول والا ایک انسپکٹر ہوں۔''

''آپ مجھے دھوکا دے کر اپنے ساتھ لائے ہیں ...... کیوں؟''

''اس لئے کہ مجھے آپ کی اشد ضرورت ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں سنگی اور مشتاق کے قتل کے کیس کی تفتیش مکمل کر چکا ہوں۔''

''تو......؟'' اس نے بے اختیار با آواز بلند کہا۔

''تو یہ کہ ان دونوں افراد کو مراد نے قتل کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور مراد نے یہ کام آپ کے ایماء پر کیا ہے۔'' پھر میں نے اسے پوری تفصیل سنا دی۔

''یہ ...... یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' وہ یک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں کیا سن رہا ہوں۔''

میں بھی اپنی کرسی سے اٹھا اور کہا۔ ''یہ بے ہودگی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ مراد کے اقبالِ جرم کی صدا ہے۔ آپ کے اس ہڈی خور وفادار ملازم نے آپ کو اس مشن کا سرغنہ قرار دیا ہے۔ اس نے آپ کی پشت پناہی میں آپ ہی کے حکم پر سنگی اور مشتاق کو بڑی سفاکی اور بے رحمی سے شوٹ کیا ہے۔''

اس کے چہرے پر کالی گھٹا نے خیمہ گاڑ دیا۔ بپھرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''کیا ...... کیا مراد نے ...... میرے خلاف یہ سب جھوٹی باتیں کی ہیں ...... اس کی یہ مجال......؟''

بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز چیخ میں ڈھل گئی۔ میں نے کہا۔

''چودھری صاحب! آپ اس وقت خود کو زیرِ حراست سمجھو۔ مراد کے ساتھ ساتھ اب آپ بھی جیل کی تازہ اور صحت بخش ہوا کھاؤ گے۔''

میرے پے در پے سنسنی خیز انکشافات نے اسے آگ بگولا کر دیا۔ وہ طیش کے عالم میں پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔

''اس نامراد کی تو میں ابھی زبان کاٹتا ہوں......''

پھر وہ تیزی سے مڑا اور کھلے ہوئے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ اس وقت وہ غیظ و غضب کی انتہا پر کھڑا تھا۔ میں نے اپنی کرسی اور میز کے درمیان سے نکلتے ہوئے حوالدار کو آواز دی۔

''چمن شاہ! ذرا دیکھنا......''

چمن شاہ میری ہدایت سے پہلے ہی مستعد ہو چکا تھا لیکن ان لمحات میں چودھری غنی کسی بپھرے ہوئے زخمی سانڈ کی خصوصیات کا حامل ہو چکا تھا۔ حوالدار جیسے ہی دروازے میں نمودار ہوا، چودھری نے اسے ایک دھواں دھار دھکا رسید کیا۔

چمن شاہ چودھری کی جانب سے شاید ایسے ردِعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ چودھری تو اس وقت اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھا۔ اس کے ملازمین نے باری باری اس کی گت بنائی تھی پہلے مشتاق نے اس کے سفلی جذبات کو کیروسین آئل میں نہلا کر ماچس دکھائی تھی اور اب اس کا جوڑی دار مراد رہی سہی کسر پوری کر رہا تھا۔ چودھری کے لئے اپنے ''ادنیٰ'' ملازمین کا یہ

''اعلیٰ'' سلوک کسی بھی طور قابل برداشت نہیں تھا۔ اس شان دار سلوک نے اس کا دماغ خراب ردیا تھا۔ وہ بہت ہی خطرناک ہو رہا تھا۔

چمن شاہ، چودھری کا دھکا کھا کر ڈگمگا گیا اور جتنی دیر اسے سنبھلنے میں لگتی چودھری اس دوران کمرے سے نکل کر میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے چمن شاہ نے سنبھل کر اس کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔ میں کمرے میں کیونکر رک سکتا تھا۔

میں نے جیسے ہی دروازے سے باہر قدم رکھا، تھانے کی عمارت فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ آواز حوالات والے حصے کی طرف سے آئی تھی۔ یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلی تھیں۔ میں تیزی سے اس راہ داری کی سمت لپک گیا جو سیدھی حوالات کی جانب جاتی تھی۔

حتیٰ الامکان تیزی سے بھاگتے ہوئے جب میں حوالات کے سامنے پہنچا تو وہاں ایک کشتم کشتی کا عالم دیکھنے میں آیا۔ چمن شاہ نے جن جپھا ڈال کر چودھری غنی کو قابو کر رکھا تھا اور آفتاب اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیگر دو اہلکار بھی ان کی مدد میں مصروف تھے۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش کرنا ممکنات میں نہیں تھا کہ وہ دو فائر چودھری نے اسی پستول سے کئے تھے۔ بے اختیار میری نگاہ آہنی سلاخوں کے پار حوالات کے اندر پہنچ گئی۔

حوالات کے ننگے فرش پر مراد اوندھا پڑا تھا اور اس کے جسم کے سامنے والے حصے سے بھل بھل خارج ہونے والا خون بڑی تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ چودھری نے فرطِ غیظ کے ہاتھوں بے اختیار ہو کر مراد کا سینہ چھلنی کر ڈالا تھا۔

چودھری غنی نے کن حالات میں کیا حرکت کی، اس بحث میں پڑے بغیر بہرحال اس نے میرا کام نہایت ہی آسان کر دیا۔ اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے یا سالہا سال تک جیل کی بے رحم دیواروں کے پیچھے سڑانے کے لئے مجھے پہلے بھی خصوصی ہل بیل میں جوتنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مراد کا انگوٹھا ٹیک حلفیہ بیان چودھری کو فٹ کرنے کے لئے کافی تھا اور اب تو...... چودھری نے اس سے بھی کہیں آگے کی ایک حرکت کر ڈالی تھی۔

مراد حوالات کے برہنہ فرش پر ''خس کم، جہاں پاک'' کی تفسیر بیان کر رہا تھا اور اس کا ولی زحمت، پشت پناہ چودھری غنی بھی اپنی ننگی ذہنیت کے طفیل بہت جلد میرے ہاتھوں نشانِ عبرت بننے والا تھا!

سنگی دل فریب حُسن کی مالک ایک نادان عورت ثابت ہوئی۔ وہ اپنی خواہشات کے

حصول کی خاطر حد سے زیادہ بے پرواہ اور بے راہ روی کا شکار ہو گئی۔ اس کے حُسن کے فریب نے کئی ہنستے بستے گھروں کی خوشیاں چھین لیں۔ اندھے جذبات کی آگ نے خود اس کے گھر کو بھی چاٹ لیا۔ وہ گھر اب خاکستر تھا اور اس کی آتش بار راکھ میں ایک ننھا سا گلاب بھی کھلا ہوا تھا۔ اس واقعے کی تپش نے اسے کملا دیا۔

وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد وہ اپنی ماں کے بارے میں کیا سوچے گا؟''



یادش بہ خیر

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، میں اپنی بیٹی سے ملنے کراچی آیا ہوا تھا۔ ان دنوں میری نواسی کی شادی کے ہنگامے زوروں پر تھے اور میری آمد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ایک روز داماد صاحب شاپنگ کے لئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ہم لگ بھگ دو گھنٹے تک طارق روڈ پر مختلف قسم کی خریداری میں مصروف رہے۔ واپسی سے پہلے ہم ایک اسنیک بار میں جا بیٹھے۔ شاپنگ کوئی آسان کام نہیں۔ تھکاوٹ کے ساتھ ہی میں اچھی خاصی بھوک بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ طارق روڈ کراچی کا ایک معروف شاپنگ ایریا ہے۔ جس پر جا بہ جا کھانے پینے کے اسپاٹس ملیں گے جو وہاں شاپنگ کی غرض سے آنے والوں کی نفسیات اور ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کھولے گئے ہیں، اسی لئے خوب چلتے ہیں۔

ہم جس اسنیک بار میں بیٹھے تھے وہ بھی پوری طرح بھرا ہوا تھا بلکہ میں نے باہر کچھ لوگوں کو اس انداز میں اندر جھانکتے ہوئے پایا جیسے وہ کوئی میز خالی ہونے کا انتظار کر رہے ہوں اسی لئے جب ہم پیٹ پوجا سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنے داماد سے کہا۔

''اٹھو میاں، اب چلتے ہیں۔ لگتا ہے ہمارے اٹھنے کا بڑی شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے۔''

میرے داماد نے ویٹر کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بل کے بارے میں استفسار کیا تو وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''صاحب! آپ کیوں میری روزی پر لات مارتے ہو؟''

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ کسی ویٹر سے بل کے بارے میں استفسار کرنے کا اس کی روزی پر لات مارنے سے کوئی تعلق نہیں نکلتا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بیٹا! یہ تم نے کیسی بات کی ہے ..... ہم تمہاری روزی کے کیوں دشمن ہوں گے؟''

اس کی عمر اٹھارہ اور بیس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ مشکوک صحت کا مالک ایک عام سا نوجوان تھا۔ کھانے کے برتن سمیٹنے کے بعد اس نے میرے سوال کا جواب دیا۔

''بڑے صاحب! سیٹھ نے آپ سے پیسے لینے سے منع کیا ہے۔''

''کون سیٹھ؟'' بے اختیار میرے داماد نے پوچھا۔

ویٹر نے کاؤنٹر کی جانب اشارہ کر دیا۔

ہم اس وقت جس میز پر بیٹھے تھے وہاں سے کاؤنٹر ہمارے عقب میں پایا جاتا تھا، یعنی ہماری پشت اس سمت میں تھی۔ سیٹھ سے ویٹر کی مراد یقیناً اس اسنیک بار کا مالک تھا۔ میں فوری طور پر یہی سمجھا کہ سیٹھ سے میرے داماد کی کوئی شناسائی ہو گی اس لئے اس نے ویٹر کو بل لینے سے منع کر دیا ہو گا۔ اپنے داماد کی تقلید میں مُڑ کر میں نے بھی کاؤنٹر کی جانب دیکھا۔

لگ بھگ پچاس سال کی عمر کا ایک شخص کاؤنٹر پر بیٹھا ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس سے نظر ملتے ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ کہاں؟ یہ فوری طور پر یاد نہ آ سکا۔ میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ شاید اس سیٹھ کو میں نے اپنے داماد کے ساتھ کبھی دیکھا ہو۔

میرے داماد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آئیں انکل! اس سیٹھ سے بھی مل لیتے ہیں۔''

''کیا یہ شخص تمہارا شناسا ہے؟'' میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

اس کے جواب سے مجھے جھٹکا لگا۔ ''نہیں انکل! بالکل نہیں۔''

جب ہم کاؤنٹر پر پہنچے تو کہانی الٹی ہو گئی۔ وضع قطع سے سیٹھ نظر آنے والا وہ شخص ہمیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر بڑے والہانہ انداز میں کاؤنٹر سے باہر آیا اور بڑی گرم جوشی سے معانقے کے لئے میری سمت بڑھا۔ میں نے اس کے اخلاق اور جوش کو دیکھتے ہوئے معانقے کے لئے اپنے دونوں بازو وا کر دیئے۔ مجھ سے تسلی بخش بغل گیری کے بعد وہ میرے داماد کی جانب بڑھا اور اس بار اس نے محض مصافحے پر اکتفا کیا۔

اس شخص کا رویہ حیران کر دینے والا تھا۔ جب وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے اپنی الجھن دور کرنے کے لئے معذرت آمیز لہجے میں اس سے پوچھ لیا۔

''معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''ملک صاحب! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔'' وہ فرطِ مسرت سے بولا۔ ''آپ صفدر صاحب ہیں ناں؟''

''اوہ!'' میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

وہ بولا۔ ''ملک صاحب! میں نے آپ کو ہوٹل میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا لیکن فوری

طور پر کاؤنٹر چھوڑ کر آپ کے پاس نہ آ سکا۔ آپ یہ رش دیکھ رہے ہیں؟"

اس نے اسنیک بار کے اندر اور باہر موجود لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بات کو ادھورا چھوڑا تو میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "ماشاء اللہ! تمہارا یہ اسنیک بار خوب چلتا ہے۔" پھر پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ ابھی تک تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟"

شاید اس نے میرے سوال پر غور نہیں کیا، اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ اس کے لب و لہجے سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا، اس کا تعلق پنجاب کے کسی علاقے سے تھا لیکن باوجود کوشش کے بھی یاد نہ کر سکا کہ میں نے اس شخص کو پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے میری مشکل حل کر دی اور خاصے جذباتی لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! میں نے آپ کو دیکھتے ہی ایک نظر میں پہچان لیا تھا۔ آپ کا چہرہ ذرا سا بھی نہیں بدلا۔ نقش و نگار اپنی جگہ پر ہیں۔ البتہ بڑھتی ہوئی عمر نے بالوں میں چاندی بھر دی ہے۔ میں نے آپ کو چالیس، بیالیس سال پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت میری عمر نو، دس سال سے زیادہ نہیں ہوگی لیکن آپ کی صورت میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی۔ آپ نے ہم پر اتنا بڑا احسان کیا تھا کہ میں آپ کو کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ یہ تو احسان فراموشی والی بات ہوگی ناں!" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرا نام الطاف شیخ ہے۔ آپ کو میرے والد امتیاز شیخ کے قتل کا قصہ تو یاد ہوگا ناں جب ان کی لاش کو دریافت کرنا ایک مسئلہ بن گیا تھا اور یہ مسئلہ آپ ہی نے حل کیا تھا۔ میرا خیال ہے، آپ گھوڑے والے اس واقعے کو بھولے نہیں ہوں گے۔"

میرا ذہن مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے یہ تو محسوس کر لیا تھا جیسے اس صورت کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا، وہ کون تھا اور میں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ امتیاز شیخ کے قتل کا ذکر سن کر وہ تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے جن کا حوالہ الطاف شیخ دے رہا تھا۔

وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ میں نے کم و بیش چالیس سال پہلے الطاف کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ دس سال سے زیادہ کا نہیں تھا اور اب اپنی زندگی کی نصف صدی گزار چکا تھا۔ ہم کافی دیر تک ماضی کے اوراق الٹتے رہے۔ بوقت رخصت میں نے اس سے پوچھا۔

"میں تو تمہیں اور تمہاری والدہ خدیجہ بیگم کو تمہارے چچا کے سپرد کر آیا تھا۔ تم کراچی میں کب سے کاروبار کر رہے ہو؟"

"ملک صاحب! اس بے رحم دنیا میں کوئی کسی کا چاچا، ماما نہیں ہے۔" وہ یک دم افسردہ ہو گیا۔ "سب دولت کے طلب گار، ہوس کے پجاری ہیں۔"

اس کے لہجے کی زہریلی اُداسی نے مجھے بتا دیا کہ میں اس کی داستانِ غم سے جس قدر واقف تھا وہ مکمل نہیں تھی۔ حالات کی ستم ظریفی نے اسے اور بھی کڑے امتحانات سے گزارا تھا۔ میں نے جب ہمدردانہ لہجے میں اس سے استفسار کیا تو اس نے مختصر الفاظ میں مجھے اپنی داستان کا دوسرا حصہ بھی سنا دیا۔ اس کی زندگی کے اس حصے میں دکھ اور پریشانیوں نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا وہ بڑی ثابت قدمی سے حالات کے سامنے ڈٹا رہا۔ بالآخر اس کے دن پھر گئے اور اب وہ بڑے سکون اور راحت کی زندگی گزار رہا تھا۔

الطاف شیخ کی زندگی کے دونوں ادوار دلچسپی سے بھرپور ہیں لیکن میں یہاں پر ابتدائی دور کا احوال بیان کروں گا کیونکہ میں بہ نفسِ نفیس اس میں شامل رہا تھا۔

❋❋❋

موسمِ بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک روز میں تھانے پہنچا تو پتہ چلا، خدیجہ بیگم نامی کوئی عورت کافی دیر سے میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں نے مذکورہ عورت کو فوراً اپنے پاس کمرے میں بلا لیا۔ اس وقت ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ کافی دیر سے انتظار کرنے کا مطلب یہی تھا، وہ عورت علی الصباح ہی آ کر تھانے میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آمد سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا، وہ کسی پریشانی میں مبتلا تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک کانسٹیبل خدیجہ بیگم کو لے کر میرے کمرے میں آ گیا۔ وہ ایک خوبصورت اور دراز قامت عورت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ میں نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"بیٹھ جاؤ بی بی!"

وہ اپنی چادر کو سنبھالتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "مجھے بتایا گیا ہے تم کافی دیر سے یہاں میرے انتظار میں بیٹھی ہو۔ ابھی تک تم نے عملے کے کسی شخص کو اپنے مسئلے کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔ تمہارے ساتھ کیا پریشانی ہے؟"

ایک لمحے کے تامل کے بعد وہ گویا ہوئی۔ "میں آپ ہی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مسئلہ میرے خاوند کا ہے۔"

''تمہارے خاوند کو کیا ہوا ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''امتیاز رات کو گھر نہیں پہنچا۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

امتیاز یقیناً اس کے شوہر کا نام تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کہاں گیا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے گھر پہنچنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے دوپٹے کے پلّو سے اپنی آنکھوں کے نم گوشے خشک کئے پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ کل صبح فرید آباد گیا تھا اور یہ کہہ کر گیا تھا کہ رات کو ہر صورت واپس آ جائے گا لیکن ابھی تک ......'' اس کا گلا رندھ گیا۔

میں نے محسوس کیا وہ اندر سے خاصی دکھی عورت تھی۔ تسلی آمیز لہجے میں، میں نے اس سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے وہ رات کو وہیں رک گیا ہو اور آج واپس آ جائے۔ اس میں اتنا زیادہ فکرمند ہونے کی کیا بات ہے۔''

خدیجہ نامی اس عورت کا تعلق موضع قلعہ چھمن سنگھ سے تھا اور فرید آباد نامی قصبہ وہاں سے لگ بھگ آٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ان دونوں قصبہ جات کے درمیان گھنا جنگل پایا جاتا تھا جس کے بیچوں بیچ شرقاً غرباً ایک بڑی نہر بہتی تھی۔ یہ دونوں قصبے میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ قلعہ چھمن سنگھ کا اصل نام قلعہ لکشمن سنگھ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ لکشمن، چھمن میں بدل گیا تھا۔ اصل نام کو وہاں کے باسی یکسر فراموش کر بیٹھے تھے۔

خدیجہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''یہ ناممکن ہے کہ امتیاز رات کو فرید آباد رک گیا ہو۔'' اس کی آواز میں پھر نمی اتر آئی۔ ''اگر ایسا ہوتا تو اس کا گھوڑا واپس نہ آتا۔''

گھوڑے کے ذکر پر میں چونک اٹھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''امتیاز جس گھوڑے پر سوار ہو کر فرید آباد گیا وہ آج صبح ہی صبح اکیلا گھر پہنچا ہے۔ گھوڑے کی حالت کو دیکھ کر.....'' جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی۔

میں تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا اسے آنسو بہاتے دیکھتا رہا۔ اس کے دل کا غبار قدرے ڈھل گیا تو میں نے بڑے محتاط انداز اس سے چند ضروری سوال کئے جن کے جواب میں اس نے یہ بتایا۔

خدیجہ کا شوہر امتیاز شیخ گزشتہ صبح اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر موضع فرید آباد گیا تھا۔ فرید آباد میں اسے ارشاد احمد سے ملنا تھا۔ ارشاد، فرید آباد کا ایک متوسط زمیندار تھا۔ خدیجہ کے مطابق امتیاز نے ارشاد سے ایک بھاری رقم لے کر اسی روز شام کو گھر واپس آنا تھا۔ مذکورہ

رقم امتیاز کی تھی جو کچھ عرصہ پہلے ارشاد نے اس سے ادھار لی تھی۔ امتیاز بھی قلعہ چھمن سنگھ کا ایک چھوٹا زمیندار تھا تاہم اس کا دل بہت بڑا تھا۔ ہم پیشہ دوستوں سے رقم کے لین دین کے سلسلے میں اس نے کبھی کنجوسی یا تنگ دلی سے کام نہیں لیا تھا۔

پروگرام کے مطابق گزشتہ روز شام کو جب امتیاز واپس نہ آیا تو خدیجہ بیگم پریشان ہو گئی۔ وہ رات گئے تک اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہی لیکن امتیاز یا اس کی کوئی اچھی بری خبر اس تک نہ پہنچ سکی۔ گاؤں میں امتیاز کے دیگر رشتہ دار بھی بستے تھے لیکن خدیجہ کی اپنے سسرالیوں سے زیادہ نہیں بنتی تھی لہٰذا اس نے امتیاز کے بارے میں کسی سے استفسار کیا اور نہ ہی ان میں سے کسی کو اپنی فکرمندی کے بارے میں بتایا۔ آج صبح جب امتیاز کا گھوڑا زخمی حالت میں گھر پہنچا تو وہ اس صورتِ حال سے گھبرا گئی۔ پھر وہ سیدھی میرے پاس چلی آئی تھی۔ تھانے آتے ہوئے بھی اس نے کسی کو اپنے ساتھ لانا ضروری نہ سمجھا۔ وہ اپنے دس سالہ بیٹے الطاف کو گھر میں چھوڑ کر تھانے آئی تھی۔

اس کے خاموش ہونے پر میں نے استفسار کیا۔

''گھوڑے کے زخموں کی نوعیت کیا ہے؟''

''وہ بری طرح زخمی ہے تھانیدار صاحب!'' اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''اس کے جسم پر کسی تیز دھار آلے سے کئی کٹ لگائے گئے ہیں۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ وہ اس حالت میں گھر کیسے پہنچا۔'' بولتے بولتے اس کی آواز بھیگنے لگی۔ ''جب امتیاز کے گھوڑے کا یہ حشر ہوا ہے تو پتہ نہیں، میرے خاوند کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہوگا؟''

کسی زخمی گھوڑے کا اپنے سوار کے بغیر گھر پہنچنا تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مالک کو کوئی سنگین حادثہ پیش آ گیا ہے۔ خدیجہ کی زبانی مجھے جو حالات معلوم ہوئے ان کی روشنی میں فوری طور پر میں یہی اندازہ لگا سکا کہ امتیاز پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس حملے کا نتیجہ کیا رہا، فی الحال اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی تھی، بہرحال یہ خاصی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔

میں نے خدیجہ سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے، امتیاز شیخ فرید آباد ہی گیا تھا؟''

''اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''امتیاز جب بھی گاؤں سے باہر جاتا ہے تو مجھے اپنے پروگرام سے ضرور آگاہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کبھی مجھ سے غلط بیانی نہیں کی۔''

''اور تمہیں اس بات کا بھی یقین ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے

سوال کیا۔ ''کہ وہ فرید آباد میں ارشاد احمد سے ایک موٹی رقم لینے گیا تھا؟''

اس قسم کے سوالات میں اپنی تفتیش کا رخ متعین کرنے کے لئے پوچھ رہا تھا۔ خدیجہ نے میرے استفسار کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی تو میں نے مزید پوچھا۔

''یہ ارشاد احمد کس قسم کا بندہ ہے؟''

''میری کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' اس نے بتایا۔ ''امتیاز اس کی تعریف کرتا ہے۔''

''تمہارا خاوند، ارشاد سے کتنی رقم لینے گیا تھا؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

خدیجہ نے جواب دینے میں تھوڑا تامل کیا پھر بولی۔ ''تین ہزار روپے۔''

''اوہ!'' میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

اس زمانے میں تین ہزار ایک بڑی رقم شمار ہوتی تھی۔ جن دنوں سونا اسّی نوے روپے تولہ اور اعلیٰ درجے کی گندم پانچ روپے من فروخت ہوتی ہو، آپ تین ہزار روپے کی قدر و منزلت کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے علاوہ روپے پیسے کی عزت و توقیر بھی جاتی رہی ہے۔ شاید انقلاباتِ زمانہ اسی کو کہا جاتا ہے!

میں نے خدیجہ سے پوچھا۔ ''امتیاز کی کسی سے دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی؟''

''دیکھیں جی!'' وہ اپنی چادر درست کرتے ہوئے بولی۔ ''انسان کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن بھی ضرور ہوتا ہے ...... مگر آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''زخمی گھوڑا کہاں ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''گھوڑا ادھر گھر پر ہی ہے۔'' پھر اپنے سوال کو دہراتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''تھانیدار صاحب! آپ نے امتیاز کے دشمنوں کے بارے میں کیوں بات کی ہے۔ خدانخواستہ......''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر متوحش نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو خدیجہ بیگم! زخمی گھوڑے کا امتیاز کے بغیر اکیلے ہی گھر پہنچنا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمہارا شوہر کسی سنگین حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ اسی لئے میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے کوئی دشمنی تو نہیں پال رکھی تھی؟''

حادثے کا ذکر سن کر اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

''تھانے دار صاحب! آپ ڈرانے والی باتیں نہ کریں۔ میں امتیاز کے کسی ایسے بدخواہ کو

نہیں جانتی جو...... جو......''

وہ اپنے شوہر کو پہنچنے والے کسی نقصان کا ذکر کرتے ہوئے بے پناہ خوفزدہ تھی اسی لئے جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ میں نے اس کا ذہن بٹانے کی خاطر کہہ دیا۔

''تم فکر نہ کرو خدیجہ! میں تمہارے شوہر کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ فی الحال میں اس زخمی گھوڑے سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں جس پر سوار ہو کر امتیاز کل فرید آباد گیا تھا۔''

اس نے متذبذب انداز میں مجھے دیکھا اور بولی۔ ''گھوڑے سے ملاقات؟''

لفظ ''ملاقات'' نے شاید اس کے ذہن کو الجھا دیا تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے گھر جا کر زخمی گھوڑے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں!''

وہ جلدی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے، آپ آئیں میرے ساتھ۔''

میں نے خدیجہ کو باہر بیٹھنے کے لئے کہا اور اے ایس آئی مراد کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میں مراد کو اپنے ساتھ خدیجہ کے گھر تک لے کر جانا چاہتا تھا۔ وہ جب میرے پاس آیا تو میں نے اسے ضروری تیاری کی ہدایت کی۔ تھوڑی ہی دیر میں مراد نے روانگی کا بندوبست کر دیا۔

جب ہم تھانے سے باہر نکلے تو ہمارے لئے وہاں ایک تانگہ موجود تھا۔ اس تانگے کا انتظام اے ایس آئی مراد نے کیا تھا۔ میں اے ایس آئی کے ساتھ تانگے کے اگلے حصے میں سوار ہو گیا اور خدیجہ کو پیچھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ تانگے کے پائیدان پر قدم رکھتے ہوئے ٹھٹک گئی پھر ہراساں نظر سے ایک طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ایک تانگہ میری نظر میں آ گیا۔ خدیجہ یک ٹک اسی تانگے کو دیکھ رہی تھی جو مخالف سمت سے اب ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''خدیجہ! کیا بات ہے ...... تم تانگے پر سوار کیوں نہیں ہو رہیں؟''

''یہ لوگ یہاں بھی پہنچ گئے!'' اس نے بدستور دوسرے تانگے کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے سوال کیا۔ ''یہ کون لوگ ہیں۔ تم انہیں دیکھ کر رک کیوں گئی ہو؟''

مذکورہ تانگے میں دو افراد (کوچ بان کے علاوہ) سوار تھے۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''یہ میرا چھوٹا دیور ممتاز شیخ ہے۔ پتہ نہیں یہ یہاں کیا لینے آیا ہے۔''

''اسی سے پوچھ لیتے ہیں، تم کیوں فکر کرتی ہو؟'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

اس دوران مذکورہ تانگہ ہمارے تانگے سے پانچ گز دور رک چکا تھا۔ خدیجہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کا چھوٹا دیور ممتاز شیخ ہے۔ میں نہیں جانتا تھا ان دو افراد میں خدیجہ کا دیور کون ہے۔ تاہم تانگہ رکنے کے بعد ان میں سے ایک نیچے اترا اور تیزی سے خدیجہ کی جانب بڑھ گیا۔ وہ ایک خوش پوش اور جوان شخص تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہی خدیجہ کا دیور تھا۔

میں بھی اپنے تانگے سے نیچے اتر آیا۔ اے ایس آئی کو میری تقلید کرنا پڑی۔ ممتاز شیخ کا انداز بتاتا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لے کر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خدیجہ سے کوئی بات کرتا، خدیجہ نے ناپسندیدہ نظر سے اسے دیکھا اور نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''بھابی! آپ بھی کمال کرتی ہو۔ کسی کو ساتھ نہیں لیا اور اکیلی ہی تھانے چلی آئیں۔'' اس شخص نے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا۔

اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ خوش پوش جوان شخص خدیجہ کا دیور ممتاز شیخ ہی تھا۔ اس کے شکایتی استفسار کے جواب میں خدیجہ نے بڑے جارحانہ انداز میں کہا۔

''تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟''

اس منہ توڑ جواب پر ممتاز کھسیانا سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''ہاں جوان! تم کون ہو اور بی بی کو کیوں پریشان کر رہے ہو؟''

وہ گڑبڑا گیا اور جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب! یہ میری بھابی ہے ...... بھائی صاحب امتیاز کی بیوی۔''

خدیجہ واضح الفاظ میں مجھے بتا چکی تھی، اپنے سسرالیوں سے اس کا میل ملاپ نہیں تھا اور ممتاز کے ساتھ اس کا حالیہ رویہ بھی یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔ اسی تناظر میں، میں نے ممتاز شیخ کو لتاڑ ڈالا۔

''یہ اگر تمہاری بھابی ہے تو پھر؟''

''جناب! مجھے پتہ چلا ہے، بھائی صاحب رات کو گھر نہیں پہنچے اور صبح ہی صبح بھابی تھانے آ گئی ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا پھر دوبارہ خدیجہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''بھابی! آپ ہی بتاؤ، آخر یہ چکر کیا ہے؟''

میں نے محسوس کر لیا کہ خدیجہ، ممتاز سے کسی قسم کی کوئی بات کرنے کی روادار نہیں حتیٰ کہ ممتاز شیخ کا بار بار بھابی کہنا بھی اسے ناگوار گزر رہا تھا لہٰذا میں نے براہِ راست ممتاز سے کہا۔

''جوان! تم اپنی بھابی کو پریشان نہ کرو۔ وہ پہلے ہی تمہارے بھائی کے لئے بہت فکرمند ہے۔ اگر یہ چکر سمجھنا چاہتے ہو تو ہمارے پیچھے پیچھے اپنے تانگے کو لے آؤ۔ ہم اس وقت تمہارے گاؤں ہی جا رہے ہیں۔''

وہ الجھن زدہ نظر سے خدیجہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے خدیجہ سے کہا۔

''بی بی! تم بیٹھو تانگے میں۔ مجھے تھانے میں اور بھی بہت کام ہیں۔''

خدیجہ خاموشی کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گئی۔ میں بھی اے ایس آئی کے ساتھ تانگے میں آ بیٹھا اور کوچ بان سے تانگہ آگے بڑھانے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں تانگے آگے پیچھے موضع قلعہ چھمن سنگھ کی جانب رواں دواں تھے۔

ممتاز اپنے تانگے میں میری ہدایت کے مطابق ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ دونوں تانگوں کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو دوسرے تانگے میں نہیں سنی جا سکتی تھی۔

میں نے خدیجہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تم اپنے دیور سے شدید نفرت کرتی ہو؟''

''جس شخص سے ہمیشہ نقصان پہنچنے کا خطرہ رہے اس سے نفرت ہی کی جا سکتی ہے تھانے دار صاحب!'' وہ زہریلے لہجے میں بولی پھر کہا۔ ''آپ سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔''

''ہاں کہو، کیا بات ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''یہ نامراد میرے گھر میں قدم نہیں رکھے گا!''

اس کے اظہارِ خیال پر اے ایس آئی چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ خدیجہ کا کہا ہوا جملہ حسبِ منشا طنزیہ انداز میں اے ایس آئی پر بھی فٹ کیا جا سکتا تھا کیونکہ اے ایس آئی کا نام مراد تھا۔ لیکن خدیجہ کی نیت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے اے ایس آئی مراد پر کسی قسم کا کوئی طنز نہیں کیا تھا۔ وہ بے چاری تو اے ایس آئی کے نام سے بھی واقف نہیں تھی۔ ''نامراد'' سے اس کا سیدھا سیدھا اشارہ ممتاز شیخ کی طرف تھا۔

میں نے خدیجہ سے کہا۔ ''تم اپنے گھر کی مالک ہو۔ جس کو چاہو، اندر داخل ہونے کی اجازت دو اور جس کو چاہو، باہر ہی روک دو۔ یہ سب تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور احسان مندی سے بولی۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے اس سے استفسار کیا۔ ''خدیجہ بی بی! تم اپنے دیور ممتاز شیخ سے اس قدر خفا کیوں ہو؟''

''یہ ایک لمبی چوڑی داستان ہے جناب!'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔ ''پھر کبھی فرصت میں سناؤں گی۔ پہلے آپ میرے خاوند کا مسئلہ حل کریں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اداس لہجے میں بولی۔ ''بس اتنا سمجھ لیں تھانے دار صاحب! آج تک مجھے اپنے سسرال والوں سے کوئی سُکھ نہیں ملا۔''

میں خاموشی سے اس دکھی عورت کے بارے میں سوچنے لگا۔

بعض لوگوں کے چہرے ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھتے ہی ایسا لگتا ہے کہ وہ دوسروں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ ایسا ہو یا نہ ہو، تاہم ان کے چہرے سے یہی ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس قسم کے ازلی مظلوم چہروں کی بات الگ ہے۔ لیکن خدیجہ جیسی خوب صورت اور طرح دار عورت کو دکھی اور ملول دیکھنا واقعی بڑے دکھ اور افسوس والی بات تھی۔ ان لمحات میں، میں خدیجہ کے لئے اپنے دل میں بے پناہ ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔

***

خدیجہ کا گھر قلعہ کچھمن سنگھ کے عین وسط میں واقع تھا۔ ہمارا تانگہ جس جس گلی سے گزرا، لوگوں نے حیرت اور تشویش کے ملے جلے تاثرات سے دیکھا۔ میں اور اے ایس آئی مراد یونیفارم میں تھے۔ پولیس کی ویسے ہی بڑی دہشت ہوتی ہے اور ہم صبح ہی صبح اس گاؤں میں پہنچ گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا، جب تک ہم خدیجہ کے گھر تک رسائی حاصل کرتے، ممتاز شیخ والے تانگے میں دو تین اور افراد بھی سوار ہو گئے تھے۔

ہم گھر کے اندر داخل ہونے لگے تو پھر ایک مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ ممتاز کی کوشش تھی کہ وہ بھی اندر آئے گا لیکن خدیجہ نے اس کی شدید مخالفت کی چنانچہ مجھے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ممتاز کو باہر ہی روکنا پڑا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اے ایس آئی کو ضروری ہدایات دیں اور کہا۔

''مراد! تم ادھر ہی گھر کے باہر رکو اور میری اجازت کے بغیر کسی کو اندر نہ آنے دینا۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب!'' اے ایس آئی نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

خدیجہ کے گھر کے سامنے اچھے خاصے افراد جمع ہو گئے تھے۔ شاید یہ بات پورے گاؤں ہی کو معلوم ہو گئی تھی کہ وہاں پولیس آئی ہے۔ میں نے وہاں پر موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور میری تجربہ کار نظر نے پلک جھپکتے میں دو افراد کا انتخاب کر لیا۔ ان کے نام فرمان علی اور وحید اللہ تھے۔ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے معتبر دکھائی دیتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ لیا اور خدیجہ کے گھر میں داخل ہو گیا۔

وہ ایک آسودہ حال زمیندار کا گھر تھا۔ صحن کو میں نے خاصا کشادہ اور درخت دار پایا۔ میری خواہش پر خدیجہ مجھے اس کمرے تک لے گئی جو امتیاز شیخ کے گھوڑے کے لئے مخصوص تھا۔ مذکورہ کمرا بڑے سے گیٹ نما داخلی دروازے کے قریب ہی واقع تھا۔ خدیجہ کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے دیگر مویشی گھر کے عقب میں، باڑے میں رہتے تھے لیکن امتیاز اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گھر کے اندر ہی باندھتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے لئے ایک خصوصی کمرا بھی گھر میں تعمیر کرا رکھا تھا۔

میں نے خدیجہ سے پوچھا۔ ''اب تو بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ فضا میں اتنی خنکی نہیں رہی کہ جانوروں کو اندر باندھا جائے، پھر تم نے گھوڑے کو کمرے میں کیوں رکھا ہوا ہے؟''

''آپ اس کی حالت دیکھیں گے تو یہ بات خود ہی سمجھ میں آ جائے گی۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

میں نے جب مذکورہ گھوڑے کو دیکھا تو خدیجہ کی بات واقعی میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ سفید رنگ کا ایک جاذب نظر اور صحت مند گھوڑا تھا۔ اسی رنگت کے سبب اس کے زخم کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو کر نظر آ رہے تھے۔ وہ اس وقت کمرے کے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بدن کا بالائی حصہ زخموں سے چُور تھا۔ ان میں سے بعض خاصے تشویش ناک زخم تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ تیز دھار کلہاڑی کے زخم تھے۔ میں نے فرمان علی اور وحید اللہ کی مدد سے بمشکل گھوڑے کو اٹھ کر کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔

گھوڑے کی ٹانگیں کپکپائیں اور وہ کسی برفانی تودے کی مانند بے بسی سے فرش پر ڈھے گیا۔ اس لمحاتی مدت میں، میں یہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا کہ دیگر بدن کی بہ نسبت اس کی ٹانگیں خطرناک حد تک زخمی تھیں۔ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

''یہ بے زبان گھر تک پہنچا کیسے ہو گا؟''

''اسی بات کی تو مجھے بھی حیرت ہے!'' مجھے اپنے عقب میں خدیجہ کی آواز سنائی دی۔

پھر اس آواز سے ایک کرب جھلکنے لگا۔ ''پتہ نہیں، میرے خاوند کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

اس وقت میں براہِ راست اس مجبور و لاچار سفید گھوڑے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں، یہ میرا واہمہ تھا یا سچویشن کا اثر، بہرحال مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ گھوڑا مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ میں کافی دیر تک یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا لیکن ان محسوسات میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ کاش! مجھے جانوروں کی آنکھوں میں نمودار ہونے والے تاثرات کو پڑھنا آتا ہوتا تو میں یہ جاننے میں کامیاب ہو جاتا کہ وہ بے زبان مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے، وہ اپنے مالک امتیاز شیخ کے بارے میں کوئی اطلاع دینا چاہتا ہو!

اس گھوڑے کے لئے میرا دل ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ خاص طور پر جب میں نے اسے اٹھا کر کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ کسی معذور شخص کی طرح کانپتا لرزتا زمین بوس ہو گیا تھا۔ اس دکھی منظر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے ذہن نے اسی لمحے فیصلہ سنا دیا، مجھے فوری طور پر اس گھوڑے کو ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس دوران وہ مسلسل رحم طلب نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔

پانچ منٹ کی ہنگامی پوچھ گچھ کے بعد میں یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ قلعہ پچھمن سنگھ میں کوئی باقاعدہ شفاخانۂ حیوانات موجود نہیں ہے۔ اس جستجو سے بہرحال مثبت نتیجہ بھی سامنے آیا کہ ظہوری چاچا نامی ایک شخص بیمار اور زخمی جانوروں کا علاج معالجہ کرتا ہے۔ وہ شخص اس گاؤں میں ڈنگر ڈاکٹر کے نام سے مشہور تھا۔

میں نے ایک بندہ بھیج کر فوری طور پر ڈنگر ڈاکٹر ظہوری چاچا کو خدیجہ کے گھر سے بلوا لیا۔ ظہوری پینتالیس پچاس سال کا ایک لحیم شحیم اور قد آور شخص تھا۔ وہ مختلف قسم کے محلول، مرہم اور دیگر ادویات سے بھرا ہوا ایک تھیلا بھی ساتھ لایا تھا۔ میری نگرانی میں اس نے ''مریض'' کا تفصیلی معائنہ کیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میں ڈنگر ڈاکٹر کو گھوڑے کی مرہم کاری میں لگا کر خدیجہ کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے میں آ گیا۔ احتیاطاً میں نے فرمان علی اور وحید اللہ کو بھی اپنے ہمراہ رکھا۔ گھوڑے کی حالت اور زخموں کی نوعیت کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ فرید آباد سے قلعہ پچھمن سنگھ کی طرف آتے ہوئے امتیاز شیخ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ جب میں امتیاز کی تلاش میں نکلوں گا تو اس کی زخم زخم لاش سے سامنا ہو گا۔ تاہم، میں نے اپنے اس اندازے کے بارے میں خدیجہ کو کچھ نہ بتایا۔

گھر کے اندرونی حصے میں خدیجہ کے اکلوتے بیٹے الطاف سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ سانولے رنگ کا ایک دھان پان سا لڑکا تھا۔ الطاف اپنے والد کی پراسرار گمشدگی پر خاصا پریشان تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ دس سال رہی ہو گی۔ یہ ایسی عمر ہوتی ہے کہ بعض سنگین واقعات انسان پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان لمحات میں انسان جو سوچ رہا ہوتا ہے، جو محسوس کر رہا ہوتا ہے اسے بیان کرنے کی بھرپور صلاحیت نہیں رکھتا۔ الطاف بھی مجھے ایسی ہی کشمکش کا شکار نظر آیا۔

میں خدیجہ کے ساتھ اس کمرے میں آ گیا جہاں امتیاز شیخ رات کو سویا کرتا تھا۔ امتیاز کو پیش آنے والے واقعات کا مجھے تو اندازہ ہو چکا تھا مگر میں خدیجہ کے سامنے اپنے اندازے کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس کمرے میں کسی ایسی شے کو تلاش کرنے میں لگ گیا جس سے امتیاز کے کسی دشمن کا سراغ مل سکے لیکن باوجود کوشش کے بھی ایسا کوئی سرا ہاتھ نہ آ سکا۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی موجود تھی کہ امتیاز ایک موٹی رقم لینے فرید آباد سے روانہ ہوا تھا۔ کہیں اس مال و دولت نے اسے کسی مصیبت میں تو نہیں ڈال دیا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر خدیجہ سے کرید کرید کر امتیاز کے کسی دشمن کے بارے میں پوچھا۔ اس مرتبہ بھی اس کا جواب نفی ہی میں تھا۔ وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔

''تھانے دار صاحب! اگر میں اپنے خاوند کے کسی دشمن سے واقف ہوتی تو آپ کو اس کے بارے میں ضرور بتاتی۔ خدا کے واسطے آپ امتیاز کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔''

''میں اسی کوشش میں لگا ہوا ہوں خدیجہ بیگم!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو، میں بہت جلد اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

میں نے خدیجہ کو تسلی تو دے دی لیکن خود مجھے اپنا لہجہ کھوکھلا اور الفاظ بےمعنی محسوس ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے فارغ کر دیا اور وہاں سے رخصت ہونے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

خدیجہ نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! جیسے ہی میرے خاوند کا کوئی سراغ ملے، آپ مجھے ضرور بتائیں گے۔''

''ظاہر ہے، تمہیں ہی بتاؤں گا بی بی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہارا شوہر ہے۔''

''آپ اس معاملے میں میرے سسرال والوں کی کوئی مدد نہیں لیں گے۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''ٹھیک ہے، اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھوں

گا۔'' میں نے اس کی تسلی کے لئے کہہ دیا۔

وہ قدرے مطمئن ہو گئی۔ میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا، اپنے سسرالی رشتے داروں کو اپنے معاملے میں ملوث نہ کرنے میں اس کی کسی بد نیتی کو دخل نہیں تھا۔ وہ شدید نفرت اور ناپسندیدگی کے طفیل ان لوگوں کو اپنے ذاتی معاملات سے دور ہی رکھنا چاہتی تھی حالانکہ اس کا یہ رویہ انتہائی نامعقول اور غیر منطقی تھا۔ امتیاز شیخ صرف اس کا شوہر نہیں بلکہ کسی کا بھائی بھی تھا۔ ممتاز شیخ وغیرہ براہِ راست اس کے معاملے میں شریک ہو سکتے تھے۔ میں چونکہ خدیجہ کی پریشانی اور سوچ کو سمجھ گیا تھا اس لئے میں نے اس سلسلے میں اس سے کوئی ضد، بحث نہیں کی۔

جب میں اس گھر سے رخصت ہونے لگا تو ڈنگر ڈاکٹر ظہوری سے دوبارہ ملاقات ہو گئی۔ وہ گھوڑے کو ہنگامی ٹریٹ منٹ دے کر فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''کیا خیال ہے ظہوری! جوان کب تک اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے گا؟''

''چار پانچ دن تو لگ ہی جائیں گے جناب!'' وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور گھوڑے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔''

''اور یہ کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''جناب! یہ انسان نہیں، جانور ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''ادھر یہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوا، ادھر چلنا پھرنا اور بھاگنا دوڑنا شروع۔''

انسان کی بہ نسبت جانوروں میں قوتِ برداشت، قوتِ مدافعت اور قوتِ مزاحمت زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں جانور سے مراد حیوان ہے ورنہ ایک طرح سے انسان بھی جانور ہی تو ہے!

جانے سے پہلے میں نے ایک نظر اس گھوڑے کو دیکھنا ضروری سمجھا۔ پتہ نہیں کیوں، ایک لمحاتی ملاقات میں مجھے اس سے اچھی خاصی انسیت ہو گئی تھی۔ جب میں اس گھوڑے کے مخصوص کمرے میں پہنچا تو دوسری جانب بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پایا۔ مجھ سے نگاہ ملتے ہی وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ میرا شکر گزار ہو۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو وہ بڑے نحیف اور سریلے انداز میں ہنہنایا۔ یہ اس کی خوشی کا اظہار تھا۔

میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے ایسے مخاطب کیا جیسے وہ کوئی باشعور حیوانِ ناطق ہو۔ ''فکر نہ کرو جوان! تم بہت جلد دوبارہ چلنے پھرنے کے لائق ہو جاؤ گے۔''

وہ پہلے والے انداز میں دھیرے سے ہنہنایا اور اپنی دُم کو ہلانے لگا۔ میں اسے مزید تسلی دلاسہ دے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ظہوری میرے ساتھ ہی تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے تاکیدی لہجے میں کہا۔

''تم دن میں ایک مرتبہ ضرور اسے دیکھنے آؤ گے ظہوری!''

''جو حکم سرکار! اپنا تو کام ہی ڈھور ڈنگر کی خدمت کرنا ہے۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں خدیجہ کے گھر سے باہر نکل آیا اور اے ایس آئی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ وہ اپنے تانگے کے قریب، ممتاز شیخ کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ میں سبک قدموں سے چلتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گیا۔ ممتاز شیخ مجھے دیکھ کر چونکا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے ناں!''

''کیوں بھئی، میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کی ہے؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

''او جناب! خدیجہ نے تو کچھ نہیں بتایا لیکن اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ بھائی صاحب کہیں غائب ہو گئے ہیں۔'' اس کا اشارہ اپنے بڑے بھائی امتیاز شیخ کی طرف تھا۔ ''ان کا زخمی گھوڑا آج صبح یہاں پہنچا ہے۔ خدانخواستہ بھائی صاحب کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟''

''ممتاز شیخ! میں بھی تمہارے ہی انداز میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہارے ساتھ کیا زیادتی ہو رہی ہے؟''

''جناب! میرا بھائی گم ہو گیا ہے اور مجھے ہی اس معاملے سے الگ رکھا جا رہا ہے۔ آپ نے خدیجہ بھابی کا رویہ دیکھا ہے؟'' وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے!''

اس کا احتجاج جائز تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ممتاز شیخ! میں نہیں جانتا، خدیجہ سے تمہارے کیا اختلافات ہیں لیکن فکر نہ کرو، میں تمہیں امتیاز شیخ کی گمشدگی والے معاملے سے علیحدہ نہیں رکھوں گا۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب!'' وہ اطمینان بھری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''ذرا مجھے بھی بتائیں، بھائی صاحب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

اس سے پہلے کہ میں کسی بات کا جواب دیتا، وہ چوکنا نظر سے خدیجہ کے گھر کے گیٹ کی

جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے، یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا مناسب نہیں۔ اگر خدیجہ بھابی نے دیکھ لیا تو کوئی اور مصیبت کھڑی کر دے گی۔ وہ فتنہ فساد کی خاصی ماہر ہے۔''

اس نے اپنی بھابی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی کہ وہ بھی اپنے دل میں اس عورت کے لئے اچھے اور بھلائی کے جذبات نہیں رکھتا تھا۔ گویا بقول کسے، تالی دو ہاتھ سے بج رہی تھی جن میں ایک ہاتھ خدیجہ کا اور دوسرا ممتاز شیخ کا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تجویز پیش کی۔ ''کیا خیال ہے، پھر تھانے چلیں؟''

میرے انداز نے اسے گڑبڑا دیا۔ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے تھانے کیوں لے کر جانا چاہتے ہیں؟''

''تمہیں تھانے جاتے ہوئے خوف کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟''

''نن...... نہیں جناب! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''پھر ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔ تانگے میں آ جاؤ۔''

تھوڑے سے تامل کے بعد وہ تانگے پر سوار ہو گیا۔ تانگہ تھانے کی جانب بڑھ گیا۔

راستے میں، میں نے ممتاز شیخ کو اس کے بڑے بھائی امتیاز شیخ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ یہ تمام تر باتیں وہی تھیں جو خدیجہ کی زبانی مجھ تک پہنچی تھیں، یعنی امتیاز کا فرید آباد جانا، وہاں کے ایک زمیندار ارشاد احمد سے ملنا اور تین ہزار کی رقم کے ساتھ فرید آباد سے واپس قلعہ کچھمن سنگھ آنا۔ اس نے میری بات غور سے سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''میں محسوس کر رہا ہوں، بھائی صاحب کے ساتھ جو بھی سنگین واقعہ پیش آیا ہے وہ موضع فرید آباد اور قلعہ کچھمن سنگھ کے درمیان ہی رونما ہوا ہے۔ ہمیں اس علاقے کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہئے۔ مجھے یہ راہ زنی کی کوئی واردات معلوم ہوتی ہے۔ تین ہزار روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔''

میں نے کہا۔ ''ممتاز شیخ! میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ بتاؤ، تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

''آپ جو بھی حکم کریں۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

ہمارا تانگہ تھانے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ممتاز شیخ! میں چاہتا ہوں تم واپس گاؤں جاؤ اور دوپہر سے پہلے کوئی سے دو قابل اعتماد افراد کو لے کر میرے پاس تھانے آ جاؤ۔''

اس کے پلّے کچھ نہ پڑا، الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پھر؟''

''تو پھر یہ کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس دوران میں ایک پولیس پارٹی ترتیب دے لوں گا۔ تمہیں ہماری پارٹی کے ساتھ جنگل میں جانا ہوگا...... اپنے بھائی کی تلاش میں!''

''منظور ہے۔'' وہ سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔''

''لیکن ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ممتاز!'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''خدیجہ کو اس منصوبے کی بھنک نہیں ملنا چاہئے ورنہ وہ بھڑک کر ہتھے سے اکھڑ جائے گی۔ میں نے محسوس کیا ہے، وہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔''

''یہ اس کا پاگل پن ہے ملک صاحب!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو کبھی اس کی کوئی بکری نہیں چرائی۔ بہرحال!'' وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ کا حکم ہے تو میں اپنی سرگرمی کے سلسلے میں زبان بند ہی رکھوں گا۔''

''شاباش...... اب تم فوراً واپس چلے جاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس وقت تک ہمارا تانگہ تھانے کے سامنے پہنچ کر رک چکا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق ممتاز شیخ نے واپسی کی راہ لی اور میں اے ایس آئی کے ہمراہ چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔

اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! کیا واقعی آپ ممتاز شیخ کو متلاشی پارٹی میں شریک کرنا چاہتے ہیں؟''

''کیوں، کیا اس میں کوئی قباحت ہے؟'' الٹا میں نے اسی سے سوال کر ڈالا۔

''نن...... نہیں! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مراد! ایک بات ذہن میں رکھنا کہ یہ ممتاز شیخ بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہے۔ خدیجہ کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے، دونوں بھائیوں کے درمیان بھی خوشگوار تعلقات نہیں تھے۔ تمہیں مین یہ سب کچھ اس لئے بتا رہا ہوں کہ اس کی نگرانی بھی تم ہی کرو گے۔''

''نگرانی...... میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب!'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک فوری منصوبے کے تحت کہا۔ ''میں تو ایک کانسٹیبل کے ساتھ موضع فرید آباد جارہا ہوں۔ امتیاز کی تلاش کے سلسلے میں ارشاد احمد نامی اس شخص سے ملاقات بہت ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں وہاں سے مفید معلومات حاصل کر کے لوٹوں گا۔''

میں سانس لینے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کی جو پارٹی امتیاز شیخ کی تلاش میں جنگل کی طرف جائے گی اس کے لیڈر تم ہو گے۔ ممتاز شیخ دو قابلِ بھروسہ بندوں کو لے کر تھانے پہنچنے والا ہے۔ تم اپنی ضرورت کے مطابق دو تین کانسٹیبلو کو ساتھ لے لینا اور جنگل کی طرف روانہ ہو جانا۔ امتیاز شیخ کی گمشدگی کا سراغ تو لگانا ہی ہے، اس کے ساتھ ہی تمہیں ممتاز شیخ پر بھی کڑی نگاہ رکھنا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات اور ایک ایک روپے کو نوٹ کرنا ہے۔ کیا تم یہ کام کر لو گے؟''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں شام سے پہلے واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے، تم لوگ اس سے پہلے ہی کسی اچھی بری خبر کے ساتھ تھانے پہنچ چکے ہو گے۔ جب میں آؤں تو رپورٹ تیار ہونی چاہئے۔''

''اوکے سر!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اور ہاں، ممتاز شیخ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں فرید آباد جارہا ہوں۔ اگر وہ میرے بارے میں استفسار کرے تو تم کوئی بھی بہانہ کر دینا۔ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ کسی فوری کام سے مجھے ایس پی آفس جانا پڑ گیا ہے۔''

''میں اچھی طرح سمجھ گیا جناب!'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''آپ مطمئن ہو کر جائیں۔ یہاں کے معاملات کو میں سنبھال لوں گا۔ انشاء اللہ! آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

میں نے ایک ہوشیار قسم کے کانسٹیبل الٰہی بخش کو ساتھ لیا پھر ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر موضع فرید آباد کی جانب روانہ ہو گئے۔

❋❋❋

ارشاد احمد موضع فرید آباد میں چھوٹے چودھری کے نام سے مشہور تھا۔ وہ رشتے میں بڑے چودھری شمشاد احمد کا بھانجا لگتا تھا۔ زمینداری کے علاوہ اس نے اور بھی بہت سارے کاموں میں ٹانگیں پھنسا رکھی تھیں۔ غلّہ منڈی میں اس کی آڑھت کی ایک بہت بڑی دکان

تھی۔ علاوہ ازیں ایک ٹیکسٹائل فیکٹری میں بھی وہ نصف کا حصے دار تھا۔ ہم پوچھتے پاچھتے دوپہر کے وقت اس کی حویلی پہنچ گئے۔

موضع فرید آباد میں صرف دو ہی حویلیاں تھیں۔ ایک بڑی اور دوسری چھوٹی اور یہ دونوں حویلیاں اپنے ہم منصب چودھریوں سے منسوب تھیں۔ ہم چھوٹے چودھری ارشاد احمد کی حویلی پہنچے اور ایک ملازم صورت شخص نے کوٹھی کے اندر اپنی آمد کی اطلاع پہنچائی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گبھرو جوان حویلی کے گیٹ پر نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی جاگیردارانہ رعونت پائی جاتی تھی۔

اس جوان نے تنقیدی نظر سے ہمارا اور ہمارے گھوڑوں کا جائزہ لیا پھر استفسار کیا۔

''آپ کو ابا جی سے کیا کام ہے؟''

میں نے جس شخص کے ہاتھ اندر اپنی آمد کی اطلاع بھجوائی تھی اسے میں نے بتا دیا تھا، ہم ارشاد احمد سے ملنے آئے ہیں۔ اس نوجوان نے جس انداز میں سوال کیا اس سے واضح ہو گیا، وہ ارشاد احمد کا صاحب زادہ تھا۔

میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''برخوردار! کام تمہارے ابا جی سے ہے تو بتاؤں گا بھی اسے ہی۔ کیا ارشاد احمد حویلی میں ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''ہیں تو حویلی ہی میں لیکن اس وقت وہ آرام کر رہے ہیں۔''

''یہ کون سا آرام کا وقت ہے؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''وہ دراصل، بات یہ ہے کہ پچھلے تین چار روز سے ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''بخار تو اب نہیں آ رہا لیکن کمزوری بہت ہو گئی ہے۔''

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا برخوردار؟'' میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''مجھے چودھری دلشاد احمد کہتے ہیں۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''دلشاد احمد! میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ اور یہ ہے کانسٹیبل الٰہی بخش!'' میں نے اپنے ہمراہی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ہم ایک انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں تمہارے ابا جی سے ملنے آئے ہیں۔''

اس تعارف سے وہ قدرے متاثر نظر آنے لگا۔ اس کی کلف لگی گردن میں تھوڑی نرمی پیدا ہوئی اور وہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ اندر آ جائیں جناب! میں ابا جی کو آپ کے بارے میں بتاتا ہوں۔''

اس کی بات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ملازم کو اس نے ارشاد تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا۔ بہرحال، ہم اس کی معیت میں چلتے ہوئے حویلی کے اندر داخل ہو گئے۔ گیٹ والی دیوار کے ساتھ ہی اندرونی جانب ایک وسیع وعریض ہال نما بیٹھک بنی ہوئی تھی۔ دلشاد احمد ہمیں اس بیٹھک میں بٹھا کر حویلی کے اندرونی حصے میں غائب ہو گیا۔

ملازم صورت شخص نے دلشاد کے اشارے پر ہمارے گھوڑوں کی لگامیں تھام لی تھیں۔ بیٹھک کی طرف آتے ہوئے ہم نے اپنے گھوڑے اس شخص کے حوالے کر دیئے۔ یقیناً وہ شخص دانے پانی سے ہمارے گھوڑوں کی تواضع کرتا۔ وہ دونوں جانور اب چھوٹے چودھری کے ملازم کی میزبانی میں تھے۔

ارشاد احمد کی بیٹھک کی سجاوٹ سے اس کے ذوق اور شوق کا اظہار ہوتا تھا۔ ہم دونوں دبیز صوفوں پر بیٹھ کر وہاں کی آرائش وزیبائش کا جائزہ لینے لگے۔ پانچ منٹ بعد ارشاد احمد کا فرزند ارجمند دلشاد احمد ہمارے پاس آیا اور بولا۔

''ملک صاحب! آپ کو ابا جی نے اندر بلایا ہے۔''

''کیا وہ یہاں نہیں آ سکتے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''اگر آ سکتے تو ضرور آ جاتے۔ میں آپ کو ان کی طبیعت کے بارے میں بتا چکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے برخوردار! میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔''میں ہی ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔''

میری تقلید میں الٰہی بخش نے بھی نشست چھوڑ دی۔ دلشاد احمد اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''بادشاہو! آپ ادھر ہی بیٹھو۔ آپ کی خدمت شدمت یہیں پر کر دی جائے گی۔ ابا جی نے صرف تھانے دار صاحب کو بلایا ہے۔''

الٰہی بخش نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھا دیا کہ وہ بے فکر ہو کر بیٹھک میں صوفہ سنبھالے رکھے۔ میں ارشاد احمد سے ملاقات کر کے بہت جلد باہر آتا ہوں۔ وہ مطمئن ہو کر دوبارہ صوفے میں دھنس گیا۔ میں دلشاد کی رہنمائی میں حویلی کی اندرونی سمت بڑھ گیا۔

چودھریوں، وڈیروں اور سرداروں کی حویلیوں میں زنان اور مردان خانے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور اگر کسی غیر کو مجبوراً زنان خانے میں سے گزرنا پڑ جائے تو بڑے سخت پردے کا بندوبست پہلے کر دیا جاتا ہے۔ ارشاد احمد بھی اس وقت حویلی کے زنان خانے میں آرام کر رہا تھا لہٰذا میں مختلف نازک مراحل طے کرنے کے بعد اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ ایک بیڈ روم تھا اور ارشاد احمد ایک کشادہ بیڈ پر اونچے تکیے کی ٹیک لگائے دراز تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچپن اور ساٹھ کے درمیان لگایا۔ وہ اپنے جثے اور وضع قطع سے ایک صحت مند اور چاق و چوبند شخص نظر آتا تھا۔ تاہم اس چند روزہ بیماری نے اسے پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس بیڈ روم میں داخل ہونے کے بعد متوازن آواز میں ''السلام علیکم'' کہا۔

چھوٹے چودھری نے میرے سلام کا نحیف آواز میں جواب دیا اور اپنی مدد آپ کے تحت اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ اسے اس کوشش میں جزوی کامیابی ہوئی۔ تاہم دلشاد لپک کر آگے بڑھا اور سہارا دے کر باپ کو آہستگی سے بٹھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ارشاد کی پشت پر دو تین تکیے رکھ کر مکمل ٹیک فراہم کر دی۔

میں نے بڑی نرمی کے ساتھ ارشاد احمد سے مصافحہ کیا اور اس کرسی پر بیٹھ گیا جو غالباً میرے ہی لئے اس کے بیڈ کے پاس ڈال دی گئی تھی۔ دلشاد مجھے اپنے باپ کی خواب گاہ میں پہنچانے کے بعد واپس نہیں گیا بلکہ خاموش کھڑا رہا۔ ہمارے درمیان علیک سلیک ہو چکی تو اس نے بیٹے سے کہا۔

''جا پتر! ملک صاحب کے لئے چائے پانی کا بندوبست کر۔'' اس کے ایک ایک لفظ سے نقاہت ٹپکتی تھی۔''ہماری خوش نصیبی ہے کہ یہ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے ورنہ یہ تو اتنے مصروف بندے ہیں کہ بس......''

اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو دلشاد فوراً وہاں سے رخصت ہو گیا۔ چھوٹے چودھری ارشاد احمد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا، وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ دراصل میرا ہزاروں لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا اور ہزاروں لوگوں کا مجھ سے۔ کثیر التعداد لوگوں کے لئے کسی ایک شخص کو یاد رکھنا بہت آسان ہوتا ہے، بہ نسبت اس ایک شخص کے کہ وہ ہزاروں لوگوں کو یاد رکھے۔

میں نے گفتگو کا آغاز اس کی بیماری سے کیا اور پوچھا۔''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ کے صاحب زادے نے مجھے آپ کی علالت کے بارے میں بتایا ہے۔''

''اب تو کافی ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستگی سے بتایا۔''بس کمزوری باقی ہے۔ وہ تو آہستہ آہستہ ہی جائے گی۔''

میں نے کہا۔''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ یہ کمزوری بڑی ظالم شے ہے۔ گھوڑے کی رفتار سے آتی ہے اور جوں کی رفتار سے رخصت ہوتی ہے۔''

وہ اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے، کمزوری سے بھی زیادہ ظالم شے بیماری ہے۔ جس کے سبب یہ کمزوری انسان پر حملہ آور ہوتی ہے۔''

''بالکل ...... بالکل!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ تو ہے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ آپ نے بڑی ظالم شے کو پچھاڑ دیا ہے۔ یہ کمزوری تو آپ کے سامنے بچہ بچونگڑا ہے۔ دو چار دنوں میں آپ اسے چٹکیوں میں مسل کر رکھ دیں گے۔''

''انشاء اللہ!'' وہ نحیف سی آواز میں بولا پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''کچھ اپنے بارے میں بھی تو بتائیں ملک صاحب! آج اس طرف کیسے زحمت فرمائی؟ آپ یونیفارم میں نظر آ رہے ہیں۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، کارسرکار پر نکلے ہوئے ہیں!''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ارشاد صاحب!'' میں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک شخص کے بارے میں آپ سے ضروری معلومات حاصل کرنے آیا ہوں۔ وہ شخص آپ کا دوست ہے۔''

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب؟'' وہ چوکنا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''امتیاز شیخ ...... موضع قلعہ چھمن سنگھ والا!''

''اوہ ...... کیا ہوا ہے امتیاز شیخ کو؟''

''یہی تو پتہ نہیں چل رہا۔''

''کیا مطلب جناب؟''

چودھری ارشاد احمد کے اس سوال کے جواب میں، میں نے اسے مختصر الفاظ میں تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔ وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا۔ اس دوران اس کے چہرے کے تاثرات میں بڑی نمایاں تبدیلی ہوتی رہی۔ جب میں اپنی بات مکمل کر چکا تو اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''امتیاز کہاں جا سکتا ہے ملک صاحب؟''

''یہی معلوم کرنے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ متفکر انداز میں بولا۔ ''یہاں سے تو وہ بالکل صحیح سلامت گیا ہے۔ میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

میں نے اس کی صحت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بڑی آہستگی، بڑی نرمی سے اسے کریدنا

شروع کیا۔ ''چودھری صاحب! امتیاز کل کتنے بجے آپ کے پاس پہنچا تھا؟''

''میرا خیال ہے، اس وقت صبح یعنی دن کے دس بجے تھے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''اور آپ کے پاس سے وہ رخصت کتنے بجے ہوا تھا؟''

''اس نے میرے پاس لگ بھگ پانچ گھنٹے گزارے تھے۔'' ارشاد احمد نے جواب دیا۔ ''ہم نے دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھایا پھر ہمارے درمیان مختلف امور پر گفتگو ہونے لگی۔ وہ اس بار کافی دنوں کے بعد آیا تھا۔ ہمارے بیچ اچھی گپ شپ رہی۔ وہ تین بجے سہ پہر یہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔''

''وہ آپ کی حویلی سے تو رخصت ہو گیا لیکن اپنے گھر نہیں پہنچ سکا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے، بیچ راہ میں پڑنے والے جنگل نے اسے نگل لیا ہے۔''

چودھری تشویش بھرے انداز میں بولا۔ ''اس کے پاس تو اچھی خاصی رقم بھی تھی۔ مجھے تو یہ کسی ڈاکو، کسی راہ زن کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔''

میں نے ابھی تک رقم کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے تذکرہ چھیڑا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''ہاں، اس کی بیوی خدیجہ کوئی رقم وغیرہ کی بات تو کر رہی تھی۔ شاید وہ آپ کے پاس یہی رقم لینے آیا تھا۔'' میں سانس لینے کے لئے لمحہ بھر متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''وہ آپ سے کتنی رقم لے کر گیا تھا؟''

''پورے تین ہزار روپے!''

میں نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا اور اس پر ان تاثرات کا سکہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اتنی بڑی رقم!''

''جی ہاں، جی ہاں۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔''

''اوہ......'' میں گہری تشویش میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ''چودھری صاحب! یہاں فرید آباد میں اور کتنے افراد کو یہ بات معلوم ہے کہ امتیاز شیخ ایک بڑی رقم لے کر جا رہا تھا؟''

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر جواب دیا۔ ''کسی کو بھی اس بات کا پتہ نہیں۔ میرا خیال ہے، رقم کی لین دین والا معاملہ صرف ہم دونوں کے درمیان تھا۔''

''اس کا مطلب ہے یہاں سے کوئی شخص اس کے تعاقب میں نہیں گیا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب!'' ایک لمحے کے توقف سے اضافہ

کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مجھے تو یہ سیدھی سیدھی ڈاکوؤں کی واردات نظر آ رہی ہے۔ کیا آپ نے جنگل والے حصے کو چیک کیا ہے؟''

امتیاز شیخ کے لئے چودھری ارشاد احمد کی تشویش اور فکر مندی میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اس کے لئے اتنا ہی پریشان تھا جتنا کسی مخلص اور سچے دوست کو ان حالات میں ہونا چاہئے۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے ادھر آنے سے پہلے ایک پولیس پارٹی کو جنگل والے حصے کا گوشہ گوشہ چھاننے کے لئے روانہ کر دیا ہے۔ واپس تھانے پہنچوں گا تو اس تلاش کے نتائج سامنے آئیں گے۔ ویسے میں خود بھی جس راستے سے گزر کر آیا ہوں اس کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیا ہے۔ امید ہے، بہت جلد امتیاز شیخ کا کوئی سراغ ہاتھ آ جائے گا۔ آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

وہ دوستانہ انداز میں مستفسر ہوا۔ ''آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟''

''آپ کے لئے جو بھی ممکن ہو سکے۔'' میں نے گیند اسی کے کورٹ میں اچھال دی۔

''دیکھیں ملک صاحب!'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔ ''فی الحال فوری طور پر تو میں یہ کر سکتا ہوں کہ اپنے قابلِ اعتماد بندوں کو امتیاز کی تلاش میں فرید آباد، قلعہ چھمن سنگھ اور آس پاس کے علاقوں میں دوڑا دوں۔ وہ میرا سچا دوست ہے جناب! میں چاہوں گا، وہ جلد از جلد بازیاب ہو جائے۔''

''تلاش کا سلسلہ تو آپ فوری طور پر شروع کرا دیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ آپ مجھے امتیاز کے دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں بھی بتائیں گے۔ خاص طور پر فرید آباد میں پائے جانے والے دوست اور دشمن؟''

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے مگر نحیف لہجے میں بولا۔ ''امتیاز کو دشمن بنانے کا کوئی شوق نہیں تھا لہٰذا میں اس کے کسی ایسے دشمن کو نہیں جانتا جو اس حد تک جا سکتا ہو۔ کم از کم یہاں فرید آباد میں تو کوئی ایسا شخص وجود نہیں رکھتا۔''

''اور ادھر قلعہ چھمن سنگھ میں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں بھی میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔''

''چودھری صاحب! امتیاز کا گھوڑا جس حالت میں آج صبح قلعہ چھمن سنگھ پہنچا ہے اس سے تو یہی لگتا ہے، امتیاز کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کسی شدید دشمنی کا نتیجہ ہے۔ ایسے کارنامے دوست تو انجام نہیں دیا کرتے ناں!''

''وہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے مجھے جو حالات بتائے ہیں ان کی روشنی میں تو میرا دھیان صرف ڈاکوؤں، لٹیروں ہی کی طرف جاتا ہے۔ آپ اس بارے میں کیوں نہیں سوچ رہے؟''

''میں ہر زاویے سے سوچنے کا عادی ہوں چودھری صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جس پہلو کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، اگر وہ میری نظر میں نہ ہوتا تو میں پولیس پارٹی کو جنگل کی خاک چھاننے کے لئے روانہ نہ کرتا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اچانک پوچھا۔

''ویسے ممتاز شیخ اینڈ کمپنی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

وہ چونک کر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ممتاز، امتیاز کا چھوٹا بھائی ہے۔''

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے خدیجہ کے رویے میں اپنے دیور ممتاز کے لئے ایک خاص قسم کی نفرت اور سرد مہری پائی ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دونوں بھائیوں میں کافی عرصے سے چپقلش اور ناراضگی چل رہی ہے۔ ان کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی نہیں ہے۔ دراصل دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب تک والدین زندہ تھے، کسی نہ کسی طور نباہ ہوتا رہا۔ پھر ان میں ایسی جدائی پڑی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی۔ میں نے یہی محسوس کیا ہے، امتیاز، ممتاز کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں جبکہ......'' وہ اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر سانس ہموار کرنے کے لئے رکا پھر بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

''......جبکہ نظام پورہ والا فیاض شیخ، ممتاز شیخ سے قطعی مختلف ہے۔''

یہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ فیاض شیخ کون ہے چودھری صاحب؟''

''فیاض، امتیاز سے چھوٹا اور ممتاز سے بڑا بھائی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''وہ ان دونوں بھائیوں سے الگ تھلگ ادھر نظام پورہ میں رہتا ہے۔ ان دونوں ہی سے اس کے زیادہ گہرے مراسم نہیں ہیں۔ بس مل لیا تو مل لیا۔ نہیں تو نہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں فیاض شیخ سے پوچھ گچھ کے لئے نظام پورہ بھی جاؤں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''فی الحال، آپ مجھے ممتاز کے بارے میں بتائیں۔ کیا وہ اپنے بڑے بھائی کی اس پراسرار گمشدگی میں ملوث ہو سکتا ہے؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''بظاہر تو ایسا نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے، دونوں بھائیوں

کے درمیان معمولی نوعیت کے اختلافات ہیں۔ اسے دشمنی نہیں کہا جا سکتا!''

''چودھری صاحب! معمولی اختلافات ہی تو آگے چل کر دشمنی کی بنیاد بنتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ویسے میں نے ایسے آثار نہیں دیکھے جن کی بنیاد پر میں ان کے درمیان کسی دشمنی کی تصدیق کر سکوں۔''

''آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''خدیجہ کے ہزار منع کرنے کے باوجود بھی میں نے ممتاز کو امتیاز کی تلاش پر مامور کر دیا ہے۔ وہ اس پولیس پارٹی میں شامل ہے جو جنگل کی جانب روانہ ہوئی ہے۔ مجھے اس شخص پر گہرا شک ہے۔ میں نے اپنے ایک ہوشیار ماتحت کو اس پر کڑی نظر رکھنے کا فریضہ سونپ دیا ہے۔ انشاء اللہ! جلد ہی کوئی نتیجہ سامنے آ جائے گا۔''

''میری تو یہ دعا ہے ملک صاحب!'' وہ خلوصِ دل سے بولا۔ ''میرا یار امتیاز شیخ ہی نتیجہ بن کر منظر پر ابھر آئے!''

میں امتیاز کے لئے چودھری ارشاد احمد کے دلی جذبات کو سمجھ رہا تھا۔ زاویۂ گفتگو کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ ''آپ نے امتیاز کے کسی دشمن کی نشان دہی تو نہیں کی، کسی دوست ہی کی طرف اشارہ کر دیں۔ یہاں فرید آباد میں وہ آپ کے علاوہ اور کس کس سے ملتا تھا؟ ممکن ہے، کہیں اور سے کوئی اشارہ مل جائے!''

اس نے جواب دیا۔ ''وہ میرے علاوہ سودی شاہ سے ملتا تھا۔''

''یہ سودی شاہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور اس سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''اس بندے کا اصل نام تو مسعود علی ہے لیکن سودی شاہ کے نام سے مشہور ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ادھر منڈی بلال گنج میں ہوتا ہے۔ وہاں منڈی میں آڑھت کا کام کرتا ہے۔''

منڈی بلال گنج وہاں سے لگ بھگ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ میں نے ارشاد سے پوچھا۔ ''کیا امتیاز کل بھی سودی شاہ سے ملنے گیا تھا؟''

''اس نے مجھ سے ایسا کوئی ذکر تو نہیں کیا۔'' وہ سادگی سے بولا۔

ہماری اس گفتگو کے دوران دلشاد احمد نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ چائے پانی کے نام پر کھانے پینے کے اچھے خاصے لوازمات اس بیڈ روم میں پہنچا دیئے گئے۔ مجھے امید تھی، کانسٹیبل الٰہی بخش کی بھی خاطر تواضع کی گئی ہو گی۔ اس کے بعد حد اصرار پر میں باتوں کے

ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چلاتا رہا تھا۔

دس منٹ کی مزید بات چیت کے بعد میں نے ارشاد احمد سے اجازت چاہی۔ ''اس تعاون کا بہت بہت شکریہ چودھری صاحب۔ آپ نے طبیعت کی خرابی کے باوجود بھی اتنا وقت دیا۔''

وہ اصرار کرنے لگا۔ ''آپ کھانا کھا کر جائیں ملک صاحب!''

''میں کھانے سے زیادہ کھا چکا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''فی الحال میں منڈی بلال گنج جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے، سودی شاہ سے کوئی اہم بات معلوم ہو جائے۔''

وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ کوشش کر کے دیکھ لیں۔ ویسے مجھے نہیں امید وہ کل اس طرف گیا ہو۔ اگر اس کا ایسا کوئی پروگرام ہوتا تو مجھ سے ضرور ذکر کرتا۔''

''قانونی کارروائی تو بہرحال ضروری ہے ناں!'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ فوری طور پر اپنے قابل اعتماد بندوں کو امتیاز شیخ کی تلاش میں دوڑا دیں اور جیسے ہی کوئی خاص بات معلوم ہو، مجھ تک اس کی اطلاع ضرور پہنچائیں۔''

''کاش! میں آپ کو رخصت کرنے کے لئے حویلی کے دروازے تک جا سکتا۔'' وہ اس بیماری کے باوجود بھی حتیٰ الامکان گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو بھی اگر امتیاز کا کوئی سراغ ملے تو مجھے ضرور بتائیں۔''

''ضرور...... کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ آرام کریں۔ جلد صحت یاب ہونے کی کوشش بھی جاری رکھیں۔ انشاء اللہ بہت جلد دوبارہ ملاقات ہو گی۔''

پھر ہم اس کی حویلی سے رخصت ہو کر منڈی بلال گنج کی جانب روانہ ہو گئے۔



کانسٹیبل الٰہی بخش ایک ہوشیار اور موقع شناس قسم کا پولیس اہلکار تھا۔ واپسی کے راستے میں ہمارے درمیان امتیاز شیخ کی پراسرار گمشدگی پر بات ہوتی رہی۔ اس کا تجزیہ بھی یہی تھا کہ امتیاز کے ساتھ گھنے جنگل ہی میں کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہو گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم واپسی کی راہ پر سفر کرتے ہوئے منڈی بلال گنج پہنچ گئے۔ مذکورہ منڈی فرید آباد اور جنگل کے درمیان واقع تھی۔

غلّہ منڈی بلال گنج میں ہمیں سودی شاہ کی دکان تک رسائی حاصل کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سودی شاہ ایک کامیاب آڑھتی تھا۔ ارشاد احمد بھی ایک حوالے سے اس کاروبار سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا ان دونوں میں دوستی کا رشتہ استوار تھا۔ چند روز پہلے

اچھی خاصی بارش ہوئی تھی۔ دیگر علاقوں میں اس بارش کے اثرات تو جاتے رہے تھے لیکن غلّہ منڈی کے اندر ابھی تک کیچڑ بھری ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ وہاں مسلسل ٹرکوں کی آمد و شد بھی تھی۔ علاوہ ازیں یہ منڈی خاصے نشیبی علاقے میں واقع تھی۔ چنانچہ بارش کا پانی رک جانے اور خشک نہ ہونے کے باعث وسیع اور عریض صحن کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ ہم اپنی یونیفارم کو بچاتے ہوئے بالآخر مذکورہ دکان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

مسعود علی عرف سودی شاہ بھاری تن و توش کا مالک ایک ملنسار شخص تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر ہائی الرٹ ہو گیا۔ پولیس یونیفارم کا اپنا ایک رعب اور دبدبہ ہوتا ہے، پھر جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ اور بھی متاثر ہو گیا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ سارا علاقہ میرے تھانے کی حدود میں آتا ہے۔ میں ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔''

وہ ہمیں اپنے ساتھ دکان کے دفتری حصے میں لے گیا۔ یہاں پر مکمل پرائیویسی حاصل تھی۔ اس کی دکان ایک بڑے سے اونچی چھت والے ہال پر مشتمل تھی جس کا عقبی حصہ غلّے کے اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا جب کہ سامنے والے حصے میں دفتر اور دوسرے ضروری امور کے لئے ایک برآمدہ نما جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ دکان کے باہر منڈی کے صحن میں اس وقت بھی دو ٹرک کھڑے تھے جن پر لوڈنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ لگ بھگ نصف درجن پانڈی (پلے دار مزدور) اناج سے بھری ہوئی بوریاں اپنی پیٹھ پر لاد کر اسٹور روم سے ٹرک تک پہنچانے میں مصروف تھے۔ سودی شاہ سے ہماری ملاقات انہی ٹرکوں کے قریب ہوئی تھی۔

''اب بتائیں ملک صاحب!'' سودی شاہ نے میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کس قسم کی تفتیش کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آئے ہیں؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کر دیا۔ میری بات سن کر وہ گہری فکر میں ڈوب گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، میں نے ایک چال چل دی۔

''شاہ صاحب! میں ابھی ابھی ارشاد احمد سے مل کر آ رہا ہوں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''امتیاز کل اسی کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس کی حویلی سے رخصت ہوتے وقت اس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ آپ سے بھی ملتا ہوا جائے گا!''

یہ غلط بیانی میں نے مصلحت کی بناء پر کی تھی۔ حالانکہ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔

میرا تیر نشانے پر لگا۔ بعض اوقات اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر بھی بڑا کاری ثابت ہوتا ہے۔ سودی شاہ کی تشویش مزید گہری ہو گئی۔ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''ہاں، مجھے یہ تو پتہ چلا ہے کہ وہ یہاں کل آیا تھا لیکن اتفاق ہے کہ میں اس وقت دکان پر موجود نہیں تھا اس لئے میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر دفتر سے باہر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔

''ٹھہریں جناب! میں منشی افضل کو بلاتا ہوں۔''

اس دفتر کی ایک دیوار میں خاصا بڑا شیشہ نصب تھا جس کے طفیل باہر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ لوڈنگ کی کارروائی اس شیشے میں سے صاف نظر آ رہی تھی۔ سودی شاہ اپنی کرسی سے اٹھا اور دفتر کا دروازہ کھول کر اس نے آواز لگائی۔

''بوٹے ...... اوئے بوٹے! ادھر آ جلدی سے۔''

سودی شاہ نے ابھی منشی افضل کو بلانے کی بات کی تھی لیکن وہ آواز کسی بوٹا نامی شخص کو دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا دماغ کسی الجھن کا شکار ہوتا، اس نے خود ہی وضاحت کر دی۔ ''منشی افضل سامنے کہیں نظر نہیں آ رہا۔ شاید وہ ٹرکوں کی دوسری جانب کھڑا ہو۔''

اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ بوٹا حاضر ہو گیا۔ وہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا تھا۔ سودی شاہ نے اس سے کہا۔ ''اوئے کاکا! جا دوڑ کے منشی صاحب کو بلا لا۔''

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''امتیاز کے آنے کے بارے میں مجھے منشی افضل نے بتایا تھا۔ میں آپ کے سامنے اس سے بات کر لیتا ہوں۔''

افضل جب دفتر میں آیا تو سودی شاہ نے اس سے کہا۔ ''منشی جی! یہ اس علاقے کے تھانے دار ہیں اور آپ سے امتیاز شیخ کے بارے میں چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن پہلے آپ ان کے لئے چائے پانی کا بندوبست کر دیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں شاہ صاحب!'' میں نے ایک ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم ابھی حویلی سے سب کچھ کھا پی کر آئے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ تکلّف نہ کریں۔''

''اس میں تکلّف والی کون سی بات ہے جناب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ارشاد کا معاملہ اس کے ساتھ ہے اور میرا میرے ساتھ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، آپ میرے پاس تشریف لائیں اور بغیر کچھ کھائے پئے رخصت ہو جائیں۔''

میں نے اس کے پُر خلوص اصرار کو دیکھتے ہوئے زیادہ مزاحمت نہ کی اور ''دودھ پتی و کیک'' پر رضامندی ظاہر کر دی۔ منشی افضل گیا اور کسی سے مذکورہ خورد و نوش لانے کا کہہ کر واپس آ گیا۔ سودی شاہ کے اشارے پر وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور الجھن زدہ نظر سے میری جانب دیکھنے لگا۔

منشی افضل کی عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے جثے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا، وہ طویل عرصے تک کسرت وغیرہ بھی کرتا رہا ہے۔ اس نے سر پر ترچھی ٹوپی لگا رکھی تھی۔

سودی شاہ نے منشی افضل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''منشی جی! آپ نے بتایا تھا نا، کل امتیاز شیخ ہماری دکان پر آیا تھا۔ مجھ سے تو اس کی ملاقات نہیں ہو سکی مگر وہ آپ سے مل کر گیا تھا۔ تھانے دار صاحب آپ سے جو کچھ بھی پوچھیں، آپ انہیں ٹھیک ٹھیک بتا دیں۔''

سودی شاہ نے ابھی تک منشی کو امتیاز شیخ کو واپس آنے والے واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ منشی کی آنکھوں میں تیرنے والی تشویش میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس کی زبان پر آ گئی۔

''تھانے دار صاحب! امتیاز شیخ خیریت سے تو ہے نا؟'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے مبہم انداز میں کہا۔ ''فی الحال اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''آپ مجھ سے اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''امتیاز شیخ کل کتنے بجے یہاں آیا تھا؟''

''لگ بھگ ساڑھے تین بجے۔'' ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

ارشاد احمد کے مطابق امتیاز شیخ لگ بھگ تین بجے اس کی حویلی سے نکلا تھا۔ ارشاد مجھے بتا چکا تھا، امتیاز نے اس سے منڈی کی طرف آنے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا، امتیاز نے حویلی سے رخصت ہونے کے بعد سودی شاہ سے ملنے کے بارے میں سوچا تھا

میں نے منشی افضل سے پوچھا۔ ''وہ کتنی دیر تک یہاں رکا تھا؟''

''پندرہ بیس منٹ صرف۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

''وہ اکیلا ہی آیا تھا لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گیا۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا منشی جی؟''

اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''جب امتیاز یہاں پہنچا، طوطی پہلوان پہلے سے دکان پر موجود تھا۔ امتیاز نے مجھ سے شاہ صاحب کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ شاہ صاحب شام تک واپس آئیں گے۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے، میں واپس جاؤں گا۔ شاہ صاحب آئیں تو انہیں میرا سلام کہہ دینا۔ میں امتیاز سے رخصتی مصافحہ کر کے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت ایک ٹرک سے مال اتر رہا تھا اور ٹرک کے نزدیک موجود رہنا میرے لئے بہت ضروری تھا۔ میں یہی سمجھا، امتیاز شیخ واپس چلا گیا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد دکان کے برآمدے کی جانب میری نگاہ گئی تو وہ طوطی پہلوان کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ پھر وہ طوطی پہلوان کے ساتھ ہی یہاں سے رخصت ہوا تھا۔''

''یہ طوطی پہلوان کون ہے؟'' میں نے سودی شاہ سے سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، لوازماتِ خاطر داری دودھ پتی اور کیک وہاں پہنچ گئے۔ منشی افضل نے کیک والی پلیٹ کو میز کے وسط میں رکھا پھر تین کپوں میں دودھ پتی نکال کر ایک ایک کپ ہمارے سامنے رکھا۔ چینک کے ساتھ چار کپ آئے تھے، چوتھا کپ ٹرے میں خالی پڑا رہ گیا۔

''منشی جی! آپ چائے نہیں پیو گے؟'' سودی شاہ نے اس سے پوچھا۔

''شاہ جی! ادھر کام کو بھی دیکھنا ہے نا۔'' منشی افضل شیشے سے باہر ٹرک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے میں نے تھوڑی دیر پہلے بھی چائے پی ہے۔'' اس کا انداز اٹھنے والا تھا۔ سودی شاہ نے مجھ سے استفسار کیا۔

''ملک صاحب! اگر آپ نے منشی جی سے اور کچھ نہیں پوچھنا تو انہیں جانے کی اجازت دیتے ہیں۔''

میں نے منشی کی طرف دیکھا اور سرسری انداز میں کہا۔ ''آپ اس کے علاوہ بھی کچھ جانتے ہوں تو خود ہی بتا دیں۔''

''نہیں جناب! میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

میں نے منشی افضل کو جانے کی اجازت دے دی اور سودی شاہ سے کہا۔ ''شاہ صاحب! ابھی تک آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''کون سا سوال؟'' وہ چونک کر پوچھ بیٹھا۔

''میں نے آپ سے طوطی پہلوان کے بارے میں پوچھا تھا۔

''اوہ، طوطی پہلوان ...... یہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے جناب!''

امتیاز آخری مرتبہ طوطی پہلوان کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ میں نے کہا۔

''مجھے اس خراب آدمی کے بارے میں بتائیں۔''

مسعود علی عرف سودی شاہ کے مطابق، طوطی پہلوان کا اصل نام بشارت تھا لیکن اپنی ناک کے طفیل وہ طوطی پہلوان مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی ناک کسی طوطے کی ناک سے گہری مشابہت رکھتی تھی۔ بشارت بالمعروف طوطی پہلوان کسی زمانے میں اکھاڑے جایا کرتا تھا لیکن اس کا اصل شعبہ بدمعاشی اور غنڈہ گردی تھا۔ اکھاڑے میں کسرت کے دوران اس کا ایک کان ''ٹوٹ'' گیا تھا۔ اس شناخت کی بناء پر اس کے مخالفین اسے کن ٹٹا بدمعاش بھی کہتے تھے۔

سودی شاہ کی بات ختم ہوئی تو میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی دکان پر کیسے کیسے خطرناک لوگ آ کر بیٹھتے ہیں شاہ جی؟''

''ملک صاحب! میں منڈی میں بیٹھتا ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''موت اور گاہک کا کچھ بھروسہ نہیں، وہ کب اور کس روپ میں آ جائے۔ یہاں پر بھی بھانت بھانت کے لوگ آتے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ویسے میں ذاتی طور پر طوطی پہلوان کو سخت ناپسند کرتا ہوں اور وہ میری موجودگی میں ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔'' پھر قدرے آواز دبا کر بولا۔ ''طوطی پہلوان جیسے غنڈوں، بدمعاشوں سے کھلم کھلا مخالفت بھی تو مول نہیں لی جا سکتی ناں۔ اس لئے میں نے کبھی اسے یہاں آنے اور اپنی دکان میں بیٹھنے سے منع نہیں کیا۔''

''یہ طوطی پہلوان اگر کبھی میرے ہتھے چڑھ گیا تو میں اس کی ساری پہلوانی اور بدمعاشی ٹوٹے ہوئے کان کے راستے باہر نکال دوں گا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ امتیاز کا ایک بدمعاش سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ طوطی سے گھل مل کر باتیں کیوں کر رہا تھا اور پھر اس کے ساتھ کدھر گیا تھا؟ اب تک کی تفتیش نے تو مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ امتیاز شیخ ایک معقول اور شریف انسان تھا!''

''امتیاز کے بارے میں آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے ملک صاحب!'' وہ تائیدی انداز

میں بولا۔ ''میں خود بھی امتیاز کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند ہو رہا ہوں۔ طوطی پہلوان کی شہرت بہر حال ٹھیک نہیں ہے اور ...... خاص طور پر اس صورت میں امتیاز کا اس کے ساتھ کہیں جانا کہ ایک بڑی رقم بھی اس کے پاس تھی!''

سودی شاہ کی تشویش بجا تھی۔ یہ جاننے کے بعد امتیاز شیخ، طوطی پہلوان کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔ میری پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال لپکا کہ ہو نہ ہو، امتیاز شیخ کی پراسرار گمشدگی میں طوطی پہلوان کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے۔

''میں ابھی اور اسی وقت طوطی سے ملنا چاہتا ہوں شاہ صاحب!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد ہم غلّہ منڈی کی حدود سے نکل کر طوطی پہلوان کے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سودی شاہ نے مجھے بتایا کہ طوطی پہلوان کے ڈیرے پر جواء وغیرہ بھی ہوتا تھا، شراب اور مجرا بھی وہاں کے معمولات میں شامل ہیں۔ علاقے کے لوگ اس سے ڈرتے ہیں اس لئے کوئی اس کے خلاف شکایت لے کر تھانے نہیں جاتا۔

میں نے کہا۔ ''چلو، کوئی بات نہیں۔ اب تو میں خود، یعنی پورا تھانہ چل کر اس کے ڈیرے پر جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں، وہ ب بستہ پہلوان ہے یا پ پنسل پہلوان؟''

سودی شاہ نے کہا۔ ''میرا ذہن بھی اسی بات پر گھوم رہا ہے کہ امتیاز شیخ طوطی کے ساتھ کیوں گیا تھا۔ اگر کل ہی مجھے یہ بات پتہ چل جاتی تو اب تک میں اس سلسلے میں اچھی خاصی تفتیش کر چکا ہوتا۔''

''دیر آید، درست آید!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''کل نہ سہی، آج تو تفتیش شروع ہو ہی گئی ناں!''

''اللہ کرے، وہ بدبخت ہمیں ڈیرے پر مل جائے۔'' سودی شاہ نے کہا۔

میں نے خیال میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایسے ڈیروں پر جواء، شراب اور مجرا وغیرہ کی محفلیں عموماً رات کو سجائی جاتی ہیں۔ رنگے ہاتھوں طوطی شاہ کا پکڑنے تو میں پھر کبھی رات ہی میں آؤں گا۔ فی الحال تو امتیاز شیخ کا سراغ لگانا ہے۔ ویسے آپ نے ایک بات بالکل صحیح کہی ہے۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر مزید کہا۔ ''اگر یہ طوطی پہلوان آج میرے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کی بدبختی میں کوئی کلام باقی نہیں رہے گا۔''

طوطی کا ڈیرا، منڈی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جلد ہی ہم اس ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ہم

اس وقت سرکاری وردی میں تھے لہٰذا جس بھی گلی سے گزرتے، لوگ حیرت، دلچسپی اور تشویش کے ملے جلے تاثرات سے ہمیں دیکھتے۔ طوطی کا ڈیرا آبادی سے ہٹ کر ایک طرف تھا۔ ہمارے گھوڑے اس ڈیرے سے ابھی سو گز دور ہی تھے کہ میں نے ایک شخص کو بھاگ کر ڈیرے کے داخلی دروازے میں غائب ہوتے دیکھا۔ اس منظر نے مجھے چونکا دیا۔ تاہم میں نے اس سلسلے میں سودی شاہ کو کچھ نہ بتایا۔ میں ابھی تک خود کچھ نہیں سمجھ پایا تھا، اسے کیا بتاتا۔

ہم ڈیرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر گھوڑوں سے نیچے اترے، پھر کانسٹیبل الٰہی بخش نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ تین دستکیں رائیگاں گئیں، چوتھی دستک پر دروازے بڑے محتاط انداز میں کھل گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت محسوس نہ ہوئی کہ دروازہ کھولنے والا پہلی ہی دستک پر وہاں پہنچ گیا تھا اور دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر پتہ نہیں، کس بات کا انتظار کر رہا تھا۔ بہرحال، کھلے ہوئے دروازے میں مجھے جو صورت دکھائی دی اس نے مجھے مزید چونکا دیا۔

یہ وہی شخص تھا جسے چند لمحے پہلے میں نے اس ڈیرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت میں اس کا چہرہ تو واضح طور پر دیکھ نہیں سکا تھا تاہم مخصوص رنگ کے لباس کے باعث میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اس شخص نے گہرے نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔

”جی...... آپ کو کس سے ملنا......“

اس شخص نے ہراساں انداز میں بولنا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے خالص تھانے دارانہ لہجے میں کہا۔

”میں تمہارے اسی باپ سے ملنے آیا ہوں جسے تم ہماری آمد کی اطلاع دینے کے لئے ابھی ابھی ڈیرے میں داخل ہوئے ہو۔“

”مم...... میں سمجھا نہیں......“

”طوطی کو باہر بھیجو!“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پھنکار سے مشابہہ آواز میں کہا۔

”طوطی جی تو...... ڈیرے پر نہیں ہیں......“

”منظورے! باہر کون ہے؟“ ڈیرے کے اندر سے کسی نے کرخت آواز میں پوچھا۔

”بھا جی! پولیس آئی ہے۔“ منظورے نامی اس شخص نے کرخت آواز والے کو بتایا۔ ”یہ لوگ طوطی جی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔“

میں نے سوالیہ نظر سے سودی شاہ کی طرف دیکھا۔ اس موقع پر اس نے خاصی زودفہمی کا مظاہرہ کیا اور پوری قطعیت سے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے نگاہ کے اشارے سے اس سے پوچھا تھا، کیا کرخت آواز میں، ڈیرے کے اندرونی حصے میں بولنے والا طوطی پہلوان ہی ہے؟ اس کی گردن کی منفی جنبش نے مجھے بتایا کہ وہ طوطی پہلوان نہیں تھا۔

اسی اثناء میں وہ کرخت آواز دوبارہ ابھری۔ ”اچھا منظورے! میں آ کر دیکھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے بھا شوکت!“ منظورے نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اندر کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ میں بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور ایک زوردار دھکا مار کر ڈیرے کے دروازے کو کھول دیا۔ منظورا جو دروازے کے دونوں پٹ تھامے کھڑا تھا، اس دھکے کی تاب نہ لا سکا اور پشت کے بل ڈیرے کے اندرونی حصے میں جا گرا۔ میں بھرّا مار کر اندر داخل ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے الٰہی بخش اور سودی شاہ بھی میری تقلید میں ڈیرے کے اندر پہنچ گئے۔ الٰہی بخش تو تھا ہی پولیس والا لیکن ہماری معیت نے سودی شاہ کو بھی خاصا بہادر بنا دیا تھا۔ اگر میں اس موقع پر وہاں موجود نہ ہوتا تو سودی شاہ، طوطی پہلوان کے ڈیرے پر ایسی جرأت کا مظاہرہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میرا سامنا سب سے پہلے اسی شخص سے ہوا، منظورے نے جسے بھا شوکت کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ غیر ارادی طور پر میری نگاہ سب سے پہلے اس کے کانوں پر گئی۔ اس شخص کے دونوں سلامت کان سودی شاہ کے اندازے کی تصدیق کرتے تھے۔ وہ شخص کن ٹُٹا بدمعاش طوطی پہلوان نہیں تھا۔ آواز کی طرح اس کی صورت بھی خاصی کرخت تھی بلکہ اس چہرے کو ڈراؤنا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ بگڑے ہوئے خال و خط کے علاوہ اس کی رنگت بھی توے کو شرماتی تھی۔ وہ بھا (بھائی) کے بجائے کوئی بھاؤ (بھوت) نظر آتا تھا۔

ہم جس انداز میں ڈیرے کے اندر داخل ہوئے، اس نے بھا شوکت کو بری طرح بوکھلا دیا۔ وہ ”کک...... کیا...... کیا بات ہے......؟“ ہی کرتا رہ گیا اور میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انتہائی سفاکی سے استفسار کیا۔

”تمہارا وہ باپ کن ٹُٹا اور دُم کٹا طوطی کہاں ہے؟“

میرے جارحانہ تیوروں نے اسے دہلا دیا، لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ ”وہ...... نہیں...... ہیں......“

”کہاں گیا ہے وہ؟“ میں نے استفسار کا سلسلہ جاری رکھا۔

”طوطی جی ذرا وزیر نگر گئے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

"یہ ذرا تو تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے باقی کا طوطی یہاں پر ہی رکھا ہو!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ وزیر نگر کب گیا ہے اور اس کی واپسی کا کیا پروگرام ہے؟"

شوکت نامی اس ڈراؤنی صورت والے شخص نے سہمے ہوئے انداز میں میرے سوال کا جواب دیا۔ "طوطی جی آج صبح وزیر نگر گئے ہیں اور ان کی واپسی کل ہی ہوگی۔"

"اس کی عدم موجودگی میں تم ڈیرے کا نظام سنبھالتے ہو؟"

"جج ...... جی ہاں!" وہ ہکلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے دریافت کیا۔ "اس ڈیرے پر ایسا کون سا کاروبار کھلا ہوا ہے جس کا انتظام تمہیں سنبھالنا پڑتا ہے؟"

"کک ...... کچھ نہیں ...... جناب!" اس نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی۔

میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "دروغ گوئی کا مظاہرہ کر کے تم خود کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچوانے کی کوشش کر رہے ہو شوکت!"

وہ گھبرا گیا، اضطراری لہجے میں بولا۔ "آپ یقین کریں تھانیدار صاحب! یہاں پر کوئی بھی غیر قانونی کام نہیں......"

"بکواس بند کرو لنگور کی اولاد!" میں نے اس کی گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔"

وہ سناٹے میں آ گیا اور سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کڑک کر کہا۔

"نامعقول انسان! مجھے پکی اطلاع ملی ہے کہ طوطی پہلوان کے اس ڈیرے پر جواء ہوتا ہے۔ شراب اور شباب کی محفلیں بھی سجائی جاتی ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

جواب دینے کی بجائے بھا شوکت نے دزدیدہ نظر سے سودی شاہ کی طرف دیکھا جیسے اس ڈیرے کے بارے میں تمام تر اطلاعات مجھے اسی نے فراہم کی ہوں۔ جب وہ خاموش رہا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"سودی کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ بھی اس وقت زیرِ تفتیش ہے۔ تمہارے بعد اس کا نام اور نمبر آئے گا۔ اگر تم اسے پولیس کا مخبر سمجھ رہے ہو تو یہ تمہاری سنگین غلط فہمی ہوگی!"

اس نے باری باری ہم سب کی طرف دیکھا اور متذبذب انداز میں تھوک نگل کر رہ گیا۔

میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم زبان کھولنے پر تیار ہو یا میں تمہیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ پولیس سے تعاون کی صورت میں تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ بولو، کیا کہتے ہو؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے کانسٹیبل الٰہی بخش کی طرف دیکھا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تم فوراً اس ڈیرے کی تلاشی لو۔ میں شوکت سے نمٹ کر ادھر ہی آ رہا ہوں۔"

میں اس ڈیرے پر طوطی پہلوان سے ملنے گیا تھا تاکہ گمشدہ امتیاز شیخ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں اور ابھی تک میں نے شوکت سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ یہاں جو بھی کارروائی ہو رہی تھی وہ ایک سنسنی خیز ٹریلر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے، وہ ڈیرا میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا اور وہاں پر چند غیر اخلاقی جرائم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لیکن میں ان معاملات کو بعد میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میری اس دھواں دھار کارروائی نے شوکت اور منظورے کے اوسان خطا کر دیئے۔ اس وقت ان دونوں کے سوا ڈیرے پر اور کوئی بھی نہیں تھا لہٰذا کسی گھرے ہوئے شکار کی مانند انہیں ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔

"جناب! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" شوکت گھگھیانے لگا۔ "میں تو حکم کا غلام ہوں جی۔ طوطی جی کا حکم ٹال کر زندہ کیسے رہیں!"

"اوئے لنگور کے تخم!" میں نے گرج کر کہا۔ "تمہیں اس کن ٹٹے بدمعاش کے حکم کا بڑا خیال ہے ...... اور اس مالک کے حکم کے خلاف چل رہے ہو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تم حکم کے غلام ہو تو میں چھتر مار مار کر تمہیں اینٹ کی دگی بھی بنا سکتا ہوں۔ کیا سمجھے؟"

وہ "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" جیسی صورت حال کا شکار تھا لہٰذا مجھ سے تعاون کرتے ہی بنی۔ میں نے اس کی رہنمائی میں طوطی پہلوان کے ڈیرے کا "جائزہ" لے ڈالا اور جو بھی قابلِ گرفت شے نظر آئی اسے بحق سرکار اپنے قبضے میں لے لیا۔ شوکت ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نے ان کے جوئے اور شراب کے اڈے پر چھاپہ مارا ہے۔ میں نے اسے اسی عام فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور اپنے ضروری مسائل پر اس سے گفتگو کرنے لگا۔

"میں عارضی طور پر تمہیں اور منظورے کو اپنے ساتھ تھانے لے کر جاؤں گا۔" میں نے اسے گھستے ہوئے کہا۔ "تاکہ تم دونوں طوطی پہلوان کے خلاف گواہی دینے کے لئے محفوظ رہو۔ تمہارے بیانات کے بعد میں طوطی کو گرفتار کر کے تمہیں آزاد کر دوں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "آپ ہمیں سلطانی گواہ بنا لیں گے؟"

"فی الحال میرا یہی ارادہ ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "تم دونوں بھی طوطی پہلوان کے جرائم میں شریک رہے ہو۔ اس لئے تم لوگوں کی بریّت کے لئے یہ وعدہ معاف گواہ والا چکر ہی چلانا ہوگا۔"

"آپ کی بڑی بڑی مہربانی مائی باپ!" شوکت نے ممنونیت سے کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں اسی طرح تم پر مہربان رہوں تو اب میں تم سے جو بھی سوال کروں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔"

"آپ پوچھیں سرکار! میں کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔"

"کیا طوطی پہلوان واقعی وزیرنگر گیا ہوا ہے؟"

"جی ہاں، میں نے آپ سے جھوٹ نہیں بولا۔"

"اور وہ کل سے پہلے واپس نہیں آئے گا؟"

"وہ مجھے یہی بتا کر گیا ہے۔"

"ذرا سوچ کر بتاؤ" میں نے بدستور اسے گہری نظر سے گھورتے ہوئے جرح کا سلسلہ جاری رکھا۔ "کل شام چار بجے سے لے کر رات گئے تک تم کہاں تھے؟"

"میں ادھر ڈیرے پر ہی موجود تھا جناب!" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ "طوطی پہلوان سہ پہر کے وقت ڈیرے سے غائب تھا۔ پھر وہ چار بجے کے بعد واپس آیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں جناب! آپ بالکل صحیح بتا رہے ہیں۔" شوکت نے تائیدی انداز میں کہا۔ "وہ کم وبیش ساڑھے چار بجے واپس لوٹا تھا۔

"کیا وہ اس وقت اکیلا ہی تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"نن ...... نہیں ......" وہ جلدی سے بولا، پھر خاموش ہو گیا۔

"کیا بات ہے، تم چپ کیوں ہو گئے؟" میں نے دھاڑ سے مشابہہ آواز میں کہا۔ "اگر وہ اکیلا نہیں تھا تو......؟"

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "اس کے ساتھ ایک اور بندہ بھی تھا۔"

میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھا۔ "کیا تم اس بندے کو جانتے ہو؟"

"نہیں جناب! میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔" اس نے بتایا۔

سودی شاہ اور ارشاد کی زبانی مجھے امتیاز شیخ کے حلیے کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ میں نے مناسب الفاظ کی مدد سے شوکت کے سامنے امتیاز کے خال و خط اجاگر کرنے کی کوشش کی تو وہ فوراً تصدیقی انداز میں بولا۔

"جی ہاں ...... جی ہاں ...... آپ اسی بندے کے بارے میں بتا رہے ہیں۔"

میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "شوکت علی! میں جس بندے کا ذکر کر رہا ہوں، وہ موضع قلع چھمن سنگھ کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام امتیاز شیخ ہے۔ مبینہ طور پر وہ آخری مرتبہ اس ڈیرے پر دیکھا گیا ہے۔ اسے کل رات واپس گھر پہنچنا تھا، لیکن نہیں پہنچا۔ میں امتیاز شیخ کی تلاش ہی کے سلسلے میں منڈی بلال گنج اور فرید آباد کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔"

میں لمحے بھر کو سانس لینے کی خاطر خاموش ہوا پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم مجھے بتاؤ گے کہ اس بندے کے ساتھ اس ڈیرے پر کیا بیتی تھی؟"

سنگین حالات سن کر شوکت کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی، مسکین سی صورت بنا کر اس نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں لیکن میری بات کا یقین کر لیں۔ میں اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ لگ بھگ پانچ بجے ڈیرے سے چلا گیا تھا۔"

میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا اور خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "وہ ساڑھے چار بجے تمہارے ڈیرے پر آیا اور پانچ بجے رخصت ہو گیا۔ یعنی وہ محض آدھا گھنٹہ یہاں رکا۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے، یہ آدھا گھنٹہ اس نے کس مصروفیت میں گزارا تھا؟"

"میں اس بار میں بھی کوئی پکی بات نہیں کر سکتا جناب!" وہ عاجزی سے بولا۔ "وہ دونوں ڈیرے پر پہنچتے ہی ایک کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ طوطی نے مجھے تاکید کی تھی، کسی کو اس طرف نہ آنے دوں۔ اس بندے کو طوطی نے اپنا دوست بتایا تھا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق پورے آدھے گھنٹے تک کسی بھی شخص کو اس کمرے کی طرف نہ پھٹکنے دیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"تمہیں بالکل معلوم نہیں، وہ دونوں آدھے گھنٹے تک اس کمرے میں کیا کرتے رہے تھے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"قطعی نہیں سرکار۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!"

"تمہارے بیان کے مطابق، امتیاز نامی وہ بندہ پانچ بجے شام ڈیرے سے رخصت ہو گیا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا طوطی پہلوان اس کے بعد ڈیرے پر ہی رہا تھا؟"

"دس پندرہ منٹ بعد وہ بھی ڈیرے سے باہر چلا گیا تھا۔" اس نے بتایا۔

میں چونک اٹھا۔ ''اس کی واپسی کب تک ہوئی تھی؟''

''لگ بھگ سات بجے!'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے وہ کمرا دکھاؤ۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

طوطی پہلوان کی کل شام کی مصروفیات نے میرے ذہن میں ہلچل سی مچا دی۔ امتیاز شیخ اس کے ساتھ ڈیرے پر پہنچا تھا پھر اس کی واپسی پر طوطی پہلوان بھی دو گھنٹے کے لئے غائب ہو گیا۔ یہ تمام تر امور اس جانب اشارہ کرتے تھے کہ امتیاز کی پراسرار گمشدگی میں طوطی کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ طوطی ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ ایسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ اگر طوطی ایک مرتبہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر اس کی زبان سے امتیاز شیخ کے بارے میں اگلوانا آسان ہو جاتا۔

میں شوکت کی راہنمائی میں چلتے ہوئے اس کمرے میں آ گیا جہاں اس کے بقول، امتیاز نے کل طوطی کے ساتھ آدھا گھنٹہ بڑے مشکوک انداز میں گزارا تھا۔ میں پہلے بھی اس کمرے کی تلاشی لے چکا تھا لیکن اس بار چونکہ ذہن میں دوسری بات تھی لہٰذا تلاشی کا انداز بھی خاصا تفصیلی اور تنقیدی رہا۔ تاہم پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے باوجود بھی میں کوئی ایسا سراغ پانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس سے امتیاز شیخ کی روپوشی پر روشنی کی ایک کرن بھی پڑ سکتی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ طوطی پہلوان کی واپسی کا انتظار کیا جاتا۔

میں چونکہ یہ انتظار وہاں منڈی بلال گنج میں بیٹھ کر نہیں کر سکتا تھا لہٰذا شوکت اور منظورے کو اپنے ساتھ لے کر واپس تھانے آ گیا۔ میں نے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے سودی شاہ کی مدد سے طوطی کے ڈیرے پر ایسا بندوبست کروا دیا کہ جیسے ہی طوطی واپس آتا، اسے دھر لیا جاتا۔ طوطی کو اگلے روز لوٹنا تھا۔ یہ انتظام میں نے احتیاطاً عارضی طور پر کرایا تھا۔

تھانے پہنچتے ہی میں نے ایک حوالدار کو دو کانسٹیبلز کے ساتھ آئندہ روز منڈی بلال گنج جانے کے بارے میں احکام دے دیئے۔ وہ تینوں علی الصباح تھانے سے روانہ ہو جاتے اور ان کی واپسی طوطی پہلوان کی گرفتاری کی صورت ہی میں ہوتی۔ اس سلسلے میں سودی شاہ اور اس کے بندے پولیس اہلکاروں کی بھرپور مدد کرتے۔ میں نے بلال گنج منڈی سے رخصت ہوتے وقت سودی کو یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ کوئی بندہ بھیج کر فرید آباد میں چھوٹے چودھری ارشاد احمد کو بھی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دے۔

جب میں اپنے تھانے پہنچا تو سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔

***

اے ایس آئی مراد کی نگرانی میں جنگل کی طرف جانے والی متلاشی ٹیم ناکام و نامراد واپس لوٹ آئی۔ انہوں نے قلعہ پچھمن سنگھ سے فرید آباد تک کا سارا علاقہ دیکھ ڈالا لیکن گمشدہ امتیاز شیخ کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ شرقاً غرباً بہنے والی بڑی نہر کے کنارے تو وہ میلوں دور تک ہو آئے تھے۔ اے ایس آئی اپنی رپورٹ پیش کر چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''چھوٹے شیخ کا کیا حال ہے؟'' میرا اشارہ ممتاز شیخ کی طرف تھا۔

''وہ ابھی آپ کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے گھر گیا ہے۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''کہہ رہا تھا، ایک دو گھنٹے میں وہ واپس آ جائے گا۔ دراصل نظام پورہ سے شیخ فیاض آیا ہوا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے ملنے گیا ہے۔''

مراد کی بات سن کر اندازہ ہوا کہ امتیاز شیخ کی پُراسرار گمشدگی والی خبر اب تک کافی پھیل چکی تھی۔ فیاض شیخ، امتیاز اور ممتاز کا بھائی تھا جو الگ تھلگ نظام پورہ میں رہتا تھا۔

میں نے مراد سے پوچھا۔ ''امتیاز کی تلاش کے دوران تم نے ممتاز پر بھی نظر رکھی تھی یا......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''جناب! آپ کا حکم تھا، میں کوتاہی کیسے برتتا؟''

''پھر کیا نتائج برآمد ہوئے اس نگرانی کے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''میں نے یہی محسوس کیا ہے، وہ اپنے بھائی کی گمشدگی میں کسی طور ملوث نہیں۔''

''ہوں!'' میں گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ فرید آباد میں ارشاد احمد سے ملنے گئے تھے۔ وہاں کا کیا رہا؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے عملے کے چند افراد کو اس محاذ کی طرف روانہ بھی کیا ہے، اس سے لگتا ہے کہ وہاں کے حالات خاصے سنسنی خیز ہیں؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ پھر اسے مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

وہ بڑی دلچسپی سے میری بات سنتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو اس نے جوش بھرے انداز میں کہا۔ ''ملک صاحب! یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ مجھے پکا یقین ہے، طوطی پہلوان ہی نے امتیاز شیخ کو کہیں اِدھر اُدھر کر دیا ہے۔''

''بظاہر تو یہی نظر آ رہا ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''لیکن یقینی صورتِ حال

کے لئے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے امید ہے، کل شام تک اس کیس کی کوئی شکل نکل کر سامنے آجائے گی۔"

ہمارے درمیان کافی دیر تک اسی موضوع پر بات چیت ہوتی رہی پھر یہ سلسلہ ممتاز شیخ کی آمد پر منقطع ہو گیا۔ ممتاز میرے کمرے میں آیا تو اے ایس آئی بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے سوالیہ نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"تھانے دار جی! میں تنہائی میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں!"

اس کے اظہار کا ایک ہی مطلب تھا...... اور وہ یہ کہ ممتاز شیخ مجھ سے جو کچھ بھی کہنا چاہتا تھا وہ بات مراد کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ میں یہی سمجھا، وہ امتیاز شیخ کی بازیابی کی مہم کے سلسلے میں مجھے کسی مفید مشورے سے نوازنا چاہتا ہے۔ میں نے اے ایس آئی کو کمرے سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

جب اس کمرے میں میرے اور ممتاز شیخ کے سوا اور کوئی نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "ہاں بولو، تم مجھ سے کون سی ضروری بات کرنا چاہتے ہو؟"

ایک لمحے کے تامل کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ میرے قیاس کے مطابق، وہ امتیاز شیخ کی گمشدگی کے بارے میں ہی بات کر رہا تھا لیکن بہ اندازِ دیگر۔

"تھانے دار جی! پورے دن کی تجل خواری کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بھائی صاحب کے ساتھ اس جنگل میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔"

"پھر......تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

"میرا خیال ہے، ادھر قلعہ چھمن سنگھ ہی میں ان کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "ذرا کھل کر بات کرو ممتاز شیخ؟"

اس نے چوکنا نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔ "مجھے بھابی خدیجہ پر شک ہے جناب!"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" میں اچھل پڑا۔ "تمہارا مطلب ہے، خدیجہ نے خود ہی اپنے شوہر کو کہیں غائب کر دیا یا کروا دیا ہے؟"

"جی ہاں، میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"میں آج صبح خدیجہ سے مل چکا ہوں اور اس کی حالت کو بھی اچھی طرح ملاحظہ کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنے شوہر کی گمشدگی پر بے حد پریشان ہے۔ تم بالکل غلط انداز میں

سوچ رہے ہو ممتاز شیخ!"

"جناب! میں نے جو محسوس کیا وہ آپ کے سامنے بیان کر دیا۔" وہ شاکی لہجے میں بولا۔ "اس پر یقین کرنا، نہ کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کس بناء پر اپنی بھابی کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہو؟"

"تھانے دار صاحب! آپ نہیں جانتے، خدیجہ کتنی تیز عورت ہے۔" وہ بھابی کے لئے اپنے دل میں چھپی نفرت اور کدورت کو سامنے لاتے ہوئے بولا۔ "اس چالاک عورت نے بھائی صاحب کو پورے خاندان سے کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ کسی وقت کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ دولت کی خاطر کسی بھی انتہا کو جا سکتی ہے۔"

"دولت کی خاطر!" میں نے استعجابیہ نظر سے اپنے سامنے بیٹھے ممتاز کو دیکھا۔ "تم کس دولت کا ذکر کر رہے ہو؟"

میری معلومات کے مطابق تین ہزار روپے والے معاملے سے صرف تین افراد واقف تھے، یعنی رقم دینے والا ارشاد احمد، رقم وصول کرنے والا امتیاز شیخ اور اس کی بیوی خدیجہ جسے اتنا معلوم تھا کہ اس کا شوہر تین ہزار روپے لینے فرید آباد، ارشاد احمد کے پاس گیا ہے...... اور اب یہ ممتاز شیخ بھی دولت کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ بات میرے لئے حیران کن تھی۔ خدیجہ اور ممتاز شیخ میں سخت ترین دشمنی پائی جاتی تھی۔ یہ تو سوچنا ہی حماقت ہوتا کہ بھابی نے دیور کو رقم والی بات بتائی ہو گی!

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "مجھے پتہ چلا ہے بھائی صاحب کسی سے ایک تگڑی رقم لے کر آنے والے تھے۔ تین ہزار روپے کوئی معمولی رقم تو نہیں ہوتی ناں!"

"تمہیں یہ بات کس نے بتائی تھی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس جی، اِدھر اُدھر سے اُڑتے ہوئے میں نے بھی سن لی ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

میں نے کہا۔ "یہ خبر کوئی پتنگ نہیں جو اِدھر اُدھر اُڑتی پھر رہی ہو؟"

وہ خاموش نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تم خواہ مخواہ اپنی بھابی پر شک کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے وہ اس معاملے میں سب سے زیادہ بے قصور ہے...... بلکہ مظلوم ہے کہیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔"

وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "تھانے دار صاحب! میں نے تو عرض کیا ہے ناں۔ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔ میں نے اپنے

محسوسات آپ تک پہنچا دیئے ہیں۔"

"اور میں بھی تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بے بنیاد نہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں تازہ ترین حالات کی خبر نہیں ہے!"

"تازہ ترین حالات؟" وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

جواب میں، میں نے اسے فرید آباد اور منڈی بلال گنج میں اپنی کارروائی سے آگاہ کر دیا اور آخر میں کہا۔ "طوطی پہلوان کے دو کارندے شوکت علی اور منظور اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہیں۔ مجھے امید ہے، کل تک طوطی پہلوان بھی قانون کی گرفت میں آ جائے گا۔ پھر تمہارے بھائی کی گمشدگی کا راز بھی کھل کر سامنے آ جائے گا۔"

"آپ نے تو ادھر کے خاصے سنسنی خیز حالات بتائے ہیں۔" وہ حیرت سے دیدے پھاڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بہرحال، میں پھر بھی یہی کہوں گا، خدیجہ کو آپ ضرور چیک کریں۔ اس کے گھر کی تلاشی کوئی نیا رنگ دکھا سکتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے، خدیجہ نے اپنے شوہر کو گھر کے اندر کہیں چھپا رکھا ہے؟" میں نے اسے کڑی نظر سے گھورا۔

"ایسا ہو بھی سکتا ہے جناب!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "اور یہ بھی ممکن ہے، جن تین ہزار روپے کا ذکر ہو رہا ہے، وہ رقم گھر کے اندر سے ہی برآمد ہو جائے!"

میں نے کھوجتی ہوئی نگاہ سے چند لمحات تک اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ممتاز شیخ! تم ایک بے بنیاد بات کر رہے ہو۔ بہرحال میں تمہاری اس بات کو یکسر رد نہیں کروں گا۔ میں پہلے بھی خدیجہ کے گھر سے ایک چکر لگا کر آ چکا ہوں، کل تفصیلی تلاشی بھی لے ڈالوں گا۔"

"اب مجھے اجازت دیں تھانے دار صاحب!" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "گھر میں نظام پورہ سے چند مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کو بھی دیکھنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے پتہ چلا ہے، تم سے بڑا بھائی فیاض شیخ نظام پورہ سے آیا ہے۔"

"جی ہاں...... میں نے انہی مہمانوں کا ذکر کیا ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ "فیاض شیخ اس معاملے کے بارے میں کیا کہتا ہے؟"

"وہ خدیجہ کے رویے پر سخت برہم ہے۔"

"کیوں...... خدیجہ نے اس کے ساتھ ایسا کیا کر دیا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

وہ بتانے لگا۔ "فیاض بھائی، امتیاز بھائی کی گمشدگی کا سن کر قلعہ کچھمن سنگھ آئے تھے اور

جب وہ ان کے گھر گئے تو خدیجہ نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ بولی تم سب لوگ میرے دشمن ہو۔ میں کسی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بھائی فیاض کو اس کے رویے سے سخت تکلیف پہنچی اور وہ خاموشی کے ساتھ میرے گھر آ گئے۔ اب آپ ہی بتائیں، ایسے ہوتے ہیں رشتے دار؟ ہم اپنے بڑے بھائی کے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"کیا خدیجہ نے فیاض کے ساتھ واقعی ایسا کیا ہے؟"

"آپ فیاض بھائی سے پوچھ لیں، اگر میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو۔"

"ٹھیک ہے، میں اس سے بھی پوچھوں گا۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "ویسے خدیجہ ایسی نظر تو نہیں آتی!"

"یہی تو اس کا کمال ہے جناب۔" وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ "وہ اپنی رونی صورت اور چہرے کی معصومیت سے خود کو مظلوم اور بے قصور ثابت کر دیتی ہے۔ آپ اس عورت کو نہیں جانتے تھانے دار صاحب! ہمارا تو کئی سال سے واسطہ ہے ناں!"

وہ اول آخر اپنی بھابی کی مخالفت میں بول رہا تھا اور یہ ناپسندیدگی و مخالفت دوطرفہ تھی۔ خدیجہ بھی اپنے دیور کے بارے میں ایسے ہی دشمنانہ خیالات رکھتی تھی۔ دونوں میں کون صحیح اور کون غلط تھا، میں فی الحال واقعی یہ بات نہیں جانتا تھا۔

میں نے کہا۔ "میرا تو نیا نیا واسطہ پڑا ہے ممتاز۔ تم فکر نہ کرو، میں بھی جلد ہی اسے جان لوں گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر تھانے سے رخصت ہو گیا۔

✲✲✲

اگلے روز، صبح ہی صبح بارش شروع ہو گئی۔

میں نے کئی مرتبہ تھانے سے نکلنے کا ارادہ کیا لیکن اپنے عزائم کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اس دوران ایک لمحے کے لئے بھی بارش نے وقفہ نہ دیا۔ یہ خلافِ توقع بارش تھی اور بعد از دوپہر تک خوب دل کھول کر برستی رہی۔ لگ بھگ دو بجے دوپہر بارش تھمی اور میں نے خدیجہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ ایک اور رکاوٹ راہ میں آن کھڑی ہوئی۔

اس بے موسم کی دھواں دھار بارش نے اچھی خاصی تباہ کاری مچا دی تھی۔ گاؤں کی نزدیکی سڑک پر کوئی مسافر بردار گاڑی الٹ گئی اور مجھے فوری طور پر موقع کی کارروائی کے

لئے وہاں جانا پڑ گیا۔ اس حادثے میں متعدد زخمیوں کے علاوہ دو افراد کی ہلاکت بھی عمل میں آئی تھی۔ ان دو مسافر افراد میں ایک آٹھ سال کا بچہ بھی تھا۔ دن کا باقی حصہ وہاں سڑک پر گزر گیا اور مغرب سے کچھ تھوڑا پہلے میں اس ہنگامی کارروائی سے فارغ ہوا۔

خدیجہ کا گھر اس سڑک اور تھانے کے درمیان واقع تھا لہٰذا میں واپسی میں اس سے ملنے چلا گیا۔ وہ سب سے پہلے اپنے شوہر کے بارے میں مستفسر ہوئی۔ میں نے اسے اس کے شوہر کے سلسلے میں جاری اب تک کی کارروائی کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور آخر میں پوچھ لیا۔

''میں نے سنا ہے، کل تمہارا بڑا دیور فیاض یہاں آیا تھا اور تم نے اس کے ساتھ خاصی بدتمیزی کی ہے؟''

''یہ سب لوگ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے آتے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''مجھے نہیں ملنا کسی سے۔''

میں نے کہا۔ ''جہاں تک میں نے سنا ہے، فیاض ممتاز سے خاصا مختلف ہے۔ اس کے ساتھ تم لوگوں کی کوئی ناراضگی وغیرہ بھی نہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''یہ سچ ہے کہ مجھے فیاض بھائی سے کوئی بڑی شکایت نہیں لیکن کل ممتاز کے ساتھ انہیں دیکھ کر پتہ نہیں کیوں میرا دماغ خراب ہو گیا اور میں نے انہیں بھی الٹی سیدھی سنا دیں۔ میں یہی سمجھتی تھی کہ ممتاز انہیں سکھا پڑھا کر میرے پاس لایا ہو گا۔ مجھے اس شخص کی شکل سے بھی شدید نفرت ہے اور اسی کو دیکھ کر میں نے فیاض کے ساتھ بھی بدسلوکی کر ڈالی۔ بعد میں مجھے اپنے رویے پر افسوس بھی ہوا۔''

''کیا فیاض کے ساتھ ممتاز بھی یہاں آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ یہ بات ممتاز نے مجھے نہیں بتائی تھی۔ میں نے خدیجہ سے ممتاز وغیرہ کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا ورنہ وہ خواہ مخواہ بھڑک اٹھتی۔ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

''بہرحال تم نے فیاض کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔''

اس نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔

وہ شام ہونے سے پہلے کا وقت تھا اور فضا میں اتنی روشنی باقی تھی کہ میں گھوم پھر کر خدیجہ کے گھر کو دیکھ سکتا تھا۔ میں فوری طور پر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ خدیجہ میرے

اس رویے سے خاصی الجھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا بھی کہ میں پراسرار انداز میں اس کے گھر کی تلاشی کیوں لے رہا ہوں اور میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ضروری کارروائی ہے۔ اسے اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تمام کمروں کے علاوہ میں نے گھر کے صحن کا بھی بغور جائزہ لے ڈالا لیکن مجھے وہاں سے کوئی بھی ایسا سراغ نہ مل سکا جس سے اس بات کی طرف شک جاتا کہ امتیاز شیخ کی پراسرار گمشدگی میں کسی بھی حوالے سے خدیجہ کا ہاتھ ہو۔

میں نے بوقت رخصت اسے تسلی دی۔ ''تم فکر نہ کرو خدیجہ! میں بہت جلد تمہارے شوہر کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ذرا طوطی پہلوان میرے ہاتھ آ جائے پھر یہ معاملہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی۔ خدیجہ کا اکلوتا بیٹا الطاف اس وقت اس کمرے کے سامنے کھڑا تھا جس کے اندر وہ سفید گھوڑا رہتا تھا جو اپنے مالک کے بغیر ہی زخمی حالت میں گھر پہنچا تھا۔ موسم کی خرابی اور زخمی خالت کے پیش نظر اسے کمرے ہی میں رکھا گیا تھا۔ مجھے اس کی خیریت بھی دریافت کرنا تھی اس لئے ادھر چلا گیا۔

سب سے پہلے میں نے الطاف کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ وہ لگ بھگ دس سال کا ایک دھان پان سا لڑکا تھا۔ اس عمر میں شعور قدرے پختہ ہو چکا ہوتا ہے اور انسان اپنے حالات کو اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ زندگی کے بعض اہم اور حساس معاملات میں اپنے دلی جذبات کو ظاہر نہیں کر سکتا۔

الطاف اپنے والد کی پراسرار گمشدگی کا بہ خوبی اندازہ لگا چکا تھا اس لئے اس کے چہرے پر مجھے غم و اندوہ کے گہرے بادل دکھائی دیئے۔ میں نے اسے پیار کیا اور تھوڑی دیر تک تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ خاموش کھڑا میری باتیں سنتا رہا پھر چپکے سے اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس کی خاموشی اور اداسی برمحل تھی۔

میں جس دوران الطاف کو پچکار رہا تھا، میں نے کمرے کے اندر گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز دو مرتبہ سنی تھی۔ گھوڑے کی زبان تو کوئی گھوڑا ہی سمجھ سکتا ہے لیکن ان لمحات میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ تقاضا کر رہا ہے، الطاف کی طرح میں اسے بھی پیار کروں۔ یہ میرا ایک وقتی احساس تھا جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر ہوں۔

میں کمرے کے اندر پہنچا تو وہ خاصا خوشی سے ہنہنایا۔ انسان کا ذہن جس سمت میں سوچ

رہا ہوتا ہے، وہ ہر ضروری اور غیر ضروری بات کو بھی اس سے منسوب کر لیتا ہے۔ مجھے بھی یہی محسوس ہوا جیسے میری آمد پر اس نے خوشی کا اظہار کیا ہو۔ میں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیسے ہو شہزادے؟''

جواب میں وہ ایک مرتبہ پھر ہنہنایا۔ میں یہی سمجھا، وہ مجھے اپنی خیریت سے آگاہ کر رہا ہے۔ میں نے اسے دروازے کے قریب لا کر اس کی گھائل ٹانگوں کا جائزہ لیا۔ ڈنگر ڈاکٹر ظہوری بڑی توجہ سے اس کا علاج کر رہا تھا۔ اس نے دروازے تک مختصر سے سفر کے دوران تکلیف تو محسوس کی لیکن میں نے دیکھا، وہ پہلے سے کافی بہتر تھا۔ میں نے اس گھوڑے سے دوبارہ آ کر اسے دیکھنے کا وعدہ کیا اور خدیجہ کے گھر سے نکل آیا۔

راستے میں ممتاز شیخ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے یہی ظاہر کیا، ہم اتفاق سے ملے ہیں لیکن میں نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ ہمارا ملنا اتفاقاً نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری ٹوہ میں ادھر گھوم رہا ہو۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ ''تم ابھی تک گھر نہیں گئے؟''

''میں گھر ہی سے آ رہا ہوں جناب!'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''ادھر فیقے موچی سے ایک کام تھا'' اس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو گھر نہیں ملا، واپس جا رہا تھا تو آپ پر نظر پڑ گئی۔ یقیناً آپ خدیجہ بھابی کی طرف سے آ رہے ہیں۔ وہاں کی کیا خبریں ہیں؟''

اس نے بڑی چالاکی سے سوالات کے رخ کو اپنی جانب سے پھیر کر میری طرف کرنے کی کوشش کی تو میں چند لمحے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے گھورتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں استفسار کیا۔

''تھانے دار میں ہوں یا تم؟''

''ظاہر ہے جی، تھانے دار تو آپ ہی ہیں جناب!''

''پھر اپنی زبان کو قابو میں رکھو اور تھانے دار بننے کی کوشش نہ کرو۔''

''میں نے کیا، کیا ہے تھانے دار صاحب؟'' وہ ایسی معصومیت سے پوچھنے لگا جیسے میری بات نہ سمجھ سکا ہو۔

میں نے ڈانٹ سے مشابہہ لہجے میں کہا۔ ''صرف میرے سوالات کو غور سے سنو اور سوچ سمجھ کر ان کا جواب دو۔ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟''

وہ الجھ گیا۔ ''میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے جناب؟''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کسی حقیقت کو ادھورا بیان کرنا بھی ایک قسم کی

دروغ گوئی ہی ہوتی ہے۔ تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ فیاض شیخ کے ساتھ تم بھی خدیجہ کے گھر گئے تھے؟''

وہ جز بز ہو کر رہ گیا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا جناب!''

''خدیجہ نے تمہاری ہی وجہ سے فیاض کو گھر میں داخل نہیں ہونے دیا۔'' میں نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر اسے تمہاری شکل نظر نہ آتی تو وہ اپنے دیور فیاض کو دروازے پر سے نہ لوٹاتی۔ فیاض کے لئے اس کے دل میں مخالفانہ جذبات نہیں ہیں۔ وہ یہی سمجھی کہ تم فیاض کو کوئی الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر وہاں لائے ہو۔''

''خدیجہ میرے بارے میں ہمیشہ بدگمان رہتی ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''فیاض کے ساتھ اگر وہ مجھے بھی گھر میں بٹھا لیتی تو اس کا کون سا نقصان ہو جاتا۔ میں بھی تو فیاض کی طرح اس کا دیور ہوں۔ بھائی صاحب کے گھر پر ہم دونوں کا ایک ہی جیسا حق ہے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے اور میں اس سلسلے میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال، خدیجہ ایسا نہیں سمجھتی۔ اور میری معلومات کے مطابق امتیاز شیخ بھی تمہیں وہ اہمیت نہیں دیتا رہا جو فیاض شیخ کو حاصل ہے۔''

''یہی تو مصیبت ہے جناب!'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''پتہ نہیں، ان لوگوں کو مجھ سے ایسی کون سی دشمنی ہے؟''

''دوستی اور دشمنی کا حساب کتاب تم بعد میں کرتے رہنا۔'' میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں میں یہی تاکید کروں گا کہ خدیجہ کی ٹوہ میں رہنا چھوڑ دو۔ ورنہ میں تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لئے مجبور ہو جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے تھانے دار صاحب!'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''میں آپ کے اس حکم کو یاد رکھوں گا۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس سے پوچھ لیا۔ ''کیا فیاض شیخ اس وقت تمہارے گھر میں موجود ہے؟''

فیاض شیخ، امتیاز شیخ کا بھائی تھا اور میری معلومات کے مطابق ان دونوں بھائیوں کے درمیان ناخوشگوار تعلقات بھی نہیں تھے۔ وہ اگر بھائی کی گمشدگی کا سن کر نظام پورہ سے قلعہ بھیمن سنگھ آ ہی گیا تھا تو اس سے مل لینا ضروری تھا۔ ممکن ہے، امتیاز کی بازیابی کے ذیل میں

اس سے کوئی اشارہ مل جاتا!

ممتاز شیخ نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”بھائی فیاض تو واپس چلا گیا ہے۔“

”وہ کب گیا ہے؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”جب میں تھانے سے گھر پہنچا تو وہ جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔“ ممتاز نے بتایا۔ ”خدیجہ کے رویے نے اسے ایسا دلبرداشتہ کیا کہ اس نے واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہی اسے روانہ کر کے آیا ہوں۔“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب فیاض شیخ سے ملاقات کی ایک ہی صورت تھی کہ یا تو میں اسے یہاں قلعہ کچھمن سنگھ طلب کر لیتا یا پھر اس کے پاس نظام پورہ چلا جاتا اور یہ دونوں کام یا دونوں میں سے کوئی ایک کل صبح ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے ممتاز شیخ کو کچھ اور ہدایات دیں اور واپس تھانے آ گیا۔

❀❀❀

میں امید کر رہا تھا کہ اس روز منڈی بلال گنج کی طرف سے کوئی خوش خبری سننے کو ملے گی لیکن میری یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔ ایک تو بارش نے بھی اس دن کی کارکردگی کو خاصا متاثر کیا تھا۔ البتہ اگلے روز دوپہر کے وقت وہ پولیس ٹیم واپس آ گئی جسے میں نے طوطی پہلوان کی گرفتاری کے لئے منڈی بلال گنج روانہ کیا تھا۔

اس روز مارچ کی غالباً چھبیس تاریخ تھی۔ امتیاز شیخ کی گمشدگی کی رپورٹ چوبیس مارچ کی صبح خدیجہ نے درج کروائی تھی۔ امتیاز گزشتہ روز یعنی تیئیس مارچ کی شام سے غائب تھا۔

پولیس ٹیم کے ساتھ سودی شاہ بھی آیا تھا اور سب سے زیادہ خوش خبری کی بات یہ تھی کہ وہ پارٹی طوطی پہلوان کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ وہ بدبخت آج صبح ہی وزیر نگر سے واپس لوٹا تھا اس لئے ایک دن کی تاخیر ہو گئی۔

میں نے اس حوالدار کو اپنے کمرے میں بلا لیا جو طوطی پہلوان کو گرفتار کر کے یہاں تک لایا تھا۔ اس نے میرے پاس آ کر بڑے جوشیلے انداز میں اطلاع دی۔ ”ملک صاحب! آپ کا مطلوبہ مجرم حاضر ہے۔“

میں نے اس کارنامے پر اس کی کارکردگی کو مناسب الفاظ میں سراہا اور اس سلسلے میں اہم سوالات کرنے کے بعد پوچھا۔ ”وہ کن ٹٹا بدمعاش گمشدہ امتیاز شیخ کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟“

”وہ اس سلسلے میں کوئی بھی بات قبول کرنے کو تیار نہیں۔“ حوالدار نے جواب دیا۔

”طوطی، بلال گنج منڈی کا ایک دہشت نشان مجرم ہے جناب۔ اس کی گرفتاری کے لئے ہمیں خاصی دقت اٹھانا پڑی ہے۔ اگر سودی شاہ کا تعاون ہمیں حاصل نہ ہوتا تو یہ بندہ تو ہاتھ سے پھسلا جا رہا تھا۔“

”اس دُم کٹے بدمعاش کی دہشت کا ایک گراف میں خود چیک کروں گا۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم اسے لے کر میرے پاس آ جاؤ۔“

”جناب! سودی شاہ بھی آپ سے ملاقات کے لئے بے تاب ہے۔“ حوالدار نے بتایا۔

”اس سے میں بعد میں ملاقات کرتا ہوں۔ تم پہلے طوطی پہلوان کو اندر لاؤ۔“

”اوکے سر!“ حوالدار مجھے سلیوٹ کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مذکورہ مجرم بشارت عرف طوطی پہلوان میرے کمرے میں حاضر تھا۔ حوالدار نے اسے میری میز کے ادھر لا کر کھڑا کر دیا اور خود تن کر اس کے قریب ہی جم گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے میری جانب سے اشارہ پاتے ہی وہ بس ”شروع“ ہو جائے گا۔ میں تنقیدی نظر سے طوطی پہلوان کا جائزہ لینے لگا۔

اس کا نام طوطی پہلوان کچھ غلط نہیں رکھا گیا تھا۔ اس کی ناک کسی طوطے کی مانند ہی ایک خاص زاویے میں جھکی ہوئی تھی۔ بدن کسرتی اور قدرے پھیلا ہوا۔ یہ اس بے اعتنائی کا نتیجہ تھا جو کافی عرصے سے اکھاڑے کی جانب سے برتتا چلا آ رہا تھا۔ وہ بنا بنایا ایک بدمعاش تھا۔ اگر کسی کو اس کے کرتوت معلوم نہ بھی ہوتے تو وہ اس کی صورت دیکھتے ہی جان جاتا، طوطی معاشرے کے معزز طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”میں نے سنا ہے طوطی! تم بڑی اڑی کر رہے ہو۔ کیا کافی دنوں تک ہماری میزبانی کا لطف اٹھانے کا ارادہ ہے؟“

”جب مجھ پر خواہ مخواہ کے الزامات عائد کئے جائیں گے تو میں تائید کیسے کروں گا جناب!“ وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ”آپ کے بندے میرے ساتھ بڑی زیادتی کر رہے ہیں تھانے دار صاحب!“

”کیا یہ غلط ہے کہ تم اپنے ڈیرے پر جوئے کا اڈا چلاتے ہو؟“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ”وہاں شراب و شباب کی محفلیں سجائی جاتی ہیں؟“

”وہ دوسری بات ہے جناب۔“ وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔ ”لیکن آپ کے حوالدار صاحب تو مجھ پر کوئی اور ہی سنگین الزام لگا رہے ہیں جبکہ میرا امتیاز شیخ سے کوئی تعلق نہیں۔“

میں نے کہا۔ ''تم جسے دوسری بات گردان رہے ہو وہ بھی کچھ کم سنگین نہیں ہے۔ تم میرے تھانے کی حدود میں جس نوعیت کا کاروبار جمائے بیٹھے ہو، میں اس سلسلے میں تمہیں لمبے عرصے کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھجوا سکتا ہوں۔ یہ نہ بھولو کہ میرے پاس تمہارے جرائم کے بڑے ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں۔''

اس نے بے چین نگاہ سے مجھے دیکھا۔ ''ثبوت'' والی بات نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ وہ میرے مطلب کی تہہ میں پہنچ گیا ہوگا۔ یہ ممکن نہیں تھا، شوکت علی اور منظورے کی گرفتاری اس سے پوشیدہ رہی ہو۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھا دیا۔

''طوطی! تم جس دعوے کو بے بنیاد اور غلط الزام کہہ رہے ہو، اس بارے میں بھی میں نے بڑی گہری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ تمہاری جان بڑے بھیانک شکنجے میں آ چکی ہے۔ تم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ امتیاز شیخ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ کیا سمجھے؟''

وہ الجھن زدہ نظر سے تھوڑی دیر تک مجھے تکتا رہا پھر احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟ امتیاز شیخ کی گمشدگی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔''

''چلو، شکر ہے کہ تم نے امتیاز شیخ سے شناسائی کا تو اقرار کر لیا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پھنکار سے مشابہہ لہجے میں کہا۔ ''اس کی گمشدگی میں شامل تمہارے ہاتھ کو میں خود ہتھکڑی پہنا دوں گا۔''

''جناب! یہ شناسائی بھی بس لمحاتی سی تھی۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کہے!

میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے، اس روز سودی شاہ کی آڑھت کی دکان پر تم پہلی مرتبہ امتیاز شیخ سے ملے تھے؟''

''بالکل...... بالکل!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اب آپ نے کی ہے، میرے دل کی بات۔''

''صرف دل ہی کی نہیں، تمہارے پھیپھڑے اور گردے کی بات کر سکتا ہوں طوطی پہلوان!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور یاد رکھو، اگر تم نے میرے سوالات کے معقول جواب نہیں دیئے تو میں تمہاری طوطے جیسی ناک کو کاٹ کر تمہارے چہرے پر ہدہد کی ناک چپکا دوں گا پھر سب تمہیں ہدہد پہلوان کہیں گے۔ بعض تو تمہیں ''بی ہدہد'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ تم نے اپنی بدمعاشی اور غنڈہ گردی سے پورے علاقے پر ایک دہشت سی بٹھا رکھی

ہے۔ سوچو، جب تمہیں منڈی بلال گنج کا بچہ بچہ ''ہدہد بی بی'' کہہ کر چھیڑے گا تو تمہاری کیا عزت و توقیر رہ جائے گی؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ تاہم وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا، میری باتیں اس کے مزاج اور موڈ کا سوا ستیاناس مار رہی تھیں۔ اس کا اندرون تہہ و بالا ہو رہا تھا لیکن مجبوری نے اس کے لبوں پر آہنی قفل ڈال دیئے تھے۔ وہ عام لوگوں کی طرح مجھے اپنی دہشت سے ڈرا سکتا تھا اور نہ ہی سنگین نتائج کی دھمکی دے کر کوئی خاص رعایت حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی کارروائی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم اسی روز بقول تمہارے پہلی مرتبہ امتیاز شیخ سے ملے تھے پھر وہاں سودی شاہ کی دکان پر یوں گھل مل کر اس سے باتیں کیوں کر رہے تھے جیسے تم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہو؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب!'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا اپنا ایک طریقۂ کار ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ۔'' اتنا کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں خاموش ہوا تو میں انتظار کرنے لگا، وہ کسی سربستہ راز سے پردہ اٹھانے والا ہے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''جب تک اس دنیا میں بے وقوف لوگ موجود ہیں، عقل مند اور تیز آدمی بھوکا نہیں مر سکتا۔ میں نے ابھی اپنے طریقۂ کار کا ذکر کیا ہے ناں ...... تو جناب! میں بھی امتیاز شیخ جیسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شکار کرتا ہوں۔ ایسے احمق افراد کی مجھے ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ میں انہیں اپنے شیشے میں اتارنے کے لئے ایک سو ایک گُر جانتا ہوں۔''

مجھے یوں محسوس ہوا، وہ کوئی انکشاف کرنے جا رہا تھا اس لئے خاموش نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سودی شاہ کی دکان پر مختصر سی ملاقات میں یہ اندازہ لگا لیا کہ امتیاز کو چکر دیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اس کے پاس کچھ رقم بھی ہے۔ میں نے بہلا پھسلا کر اسے جوئے کے لئے راضی کر لیا۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ اپنے ڈیرے پر لے گیا اور اس کی جیب خالی کر دی۔''

''کیا وہ راضی خوشی اتنی بڑی رقم ہار گیا؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''جناب! راضی خوشی تو کوئی ایک دھیلا بھی نہیں ہارتا۔'' وہ بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''میں نے پہلے ایک دو داؤ میں امتیاز کو جیتنے کا موقع دیا۔ اس سے اس کا حوصلہ کھل گیا۔ ہر جوئے کے اڈے والا یہی کرتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اسے مونڈھنا شروع

کر دیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس کے پاس اتنی بڑی رقم ہو گی۔ جب وہ مسلسل ہارنے لگا تو جیت کی توقع میں بڑے بڑے داؤ لگانے لگا۔ اس طرح میں نے اس کی پونجی کے ساتھ ہی وہ رقم بھی جیت لی جو شروع میں ہاری تھی۔"

"اوہ!" میں نے افسوس ناک انداز میں اس شاطر شخص کی طرف دیکھا۔ "تم نے تین ہزار روپے پر ہاتھ صاف کر لیا اور وہ خاموشی سے لُٹ گیا۔"

"جناب! اس قسم کے کاموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" طوطی پہلوان رازدارانہ انداز میں بولا۔ پھر اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی پیشکش بھی شامل ہو گئی۔ "تھانے دار صاحب! اگر آپ مجھے اس جھمیلے سے آزاد کر دیں تو میں تین ہزار روپے کی وہ رقم آپ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"یعنی اس دیدہ دلیری سے تم مجھے رشوت پیش کر رہے ہو؟" مجھے غصہ آ گیا۔

"اگر آپ اسے تحفہ یا نذرانہ سمجھ لیں تو بات بن جائے گی۔" وہ بڑے بھونڈے انداز میں مسکرایا۔ "ملک صاحب! آپ مجھے خاصے سخت آدمی لگتے ہیں۔ آپ سے پہلے اس تھانے میں جو تھانیدار تعینات تھا اس سے تو میری اچھی خاصی دوستی تھی۔"

اس کی باتیں طیش دلانے لگی تھیں لیکن میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھا اور اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم اسے نذرانہ کہو یا تحفہ، میں تین ہزار کی رقم تم سے ضرور واپس لوں گا۔ اپنے لئے نہیں بلکہ امتیاز کی بیوی اور بچے کے لئے۔ اس رقم پر صرف اور صرف انہی کا حق ہے۔"

ایک لمحے کو میں سانس لینے کے لئے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ امتیاز شیخ کے ساتھ تم نے کیا، کیا ہے؟"

وہ بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا اور بولا۔ "میں اس کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ میرے ڈیرے سے صحیح سلامت رخصت ہوا تھا۔"

"اور اس کے پیچھے ہی تم بھی رخصت ہو گئے تھے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اور تمہاری واپسی لگ بھگ دو گھنٹے کے بعد ہوئی تھی؟"

وہ ڈیرے سے اپنے غیاب کے بارے میں مختلف تاویلیں دینے لگا۔ جب اس کی باتوں سے میری تسلی نہ ہوئی تو میں نے اسے حوالدار کے حوالے کر دیا۔

"تم اس پر کچھ کام کرو۔ میں رات کو اس سے دوبارہ ملاقات کروں گا۔"

حوالدار کے چہرے پر خوشی چمک اٹھی۔ وہ کشاں کشاں طوطی پہلوان کو میرے کمرے سے لے کر حوالات کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اس کے حسبِ منشا طوطی کی صورت میں

اسے ایک عظیم تحفے سے نواز دیا تھا۔

وہ دن اور اس سے اگلا دن بھی کسی کامیابی کے بغیر ہی گزر گیا۔ ہم نے طوطی پہلوان پر مروجہ طور طریقے آزما کر دیکھ لئے تھے لیکن اس نے امتیاز کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی اقراری بیان نہ دیا۔ اس صورتِ حال نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ میں تھانے سے اٹھا تو امتیاز شیخ کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا اور نیند کی آغوش تک پہنچتے پہنچتے یہ پریشان کن سوچ میرے ذہن سے چپکی رہی۔

***

آئندہ روز جب میں بیدار ہوا تو صبح کے آغاز کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک آئیڈیا چمکا۔ اس آئیڈیا کے بارے میں، میں نے باقاعدہ سوچا نہیں تھا۔ بس خود بخود ہی یہ خیال چپکے سے ذہن میں ابھر آیا تھا۔ بعد ازاں اس خیال پر عمل کرنا بہت سودمند ثابت ہوا۔

میں نے کسی سینئر افسر سے یہ کہاوت سنی تھی کہ چوری شدہ چیز جب کسی بھی طور برآمد نہ ہو رہی ہو تو خود کو اس شے کی جگہ رکھ کر سوچنا چاہئے۔ اس سلسلے میں میرے اس سینئر نے ایک گھوڑے کی مثال بھی دی تھی۔ کسی کا ایک گھوڑا چوری ہو گیا تھا اور کسی بھی طرح اس گھوڑے کا سراغ نہیں مل رہا تھا، بالآخر اس نے خود کو گھوڑا تصور کر لیا اور یہ سوچنے لگا کہ اگر اس کے ساتھ گھوڑے والی سچویشن پیش آ جائے تو وہ کہاں جائے گا۔ اس کوشش میں اسے کامیابی حاصل ہوئی اور وہ "گھوڑا" بن کر آخر کار گھوڑے تک پہنچ گیا۔

جس کیس نے میرا دماغ گھما رکھا تھا اس میں کوئی گھوڑا تو گم نہیں ہوا تھا بلکہ گھوڑے کا مالک پچھلے پانچ چھ روز سے غائب تھا۔ میرے ذہن نے فوری طور پر اس آئیڈیا میں تھوڑا ترمیم و اضافہ کیا اور میں تیار ہو کر خدیجہ بیگم کے گھر پہنچ گیا۔ اے ایس آئی مراد بھی میرے ہمراہ تھا اور ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں گئے تھے۔

خدیجہ نے حسبِ حال ہمارا استقبال کیا۔ میں اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جس کے اندر امتیاز شیخ کا سفید گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی گھوڑا بڑے والہانہ انداز میں ہنہنانے لگا۔ اس کے زخم بڑی حد تک ٹھیک ہو چکے تھے۔ اس وقت وہ اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔

اے ایس آئی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "ملک صاحب! یہ گھوڑا تو آپ کو پہچاننے لگا ہے۔"

میں مراد کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے گھوڑے کی سمت بڑھا۔ وہ بھی میری طرف

لپکا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کمرے سے باہر نکلنا چاہتا ہو۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کرو جوان! میں تمہاری رسّی کھول رہا ہوں۔ تم میری رہنمائی کرو گے کہ تمہارا مالک امتیاز کس جگہ تم سے بچھڑا تھا!''

وہ شانت ہو کر اپنی بڑی بڑی سی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ انسانی زبان کو سمجھ رہا ہو لیکن اس کے رویے اور ردِ عمل سے یہی بات ظاہر ہوتی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا اسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ شاید ہمارے درمیان کوئی روحانی رابطہ قائم ہو گیا تھا۔

اے ایس آئی کو میں اپنے منصوبے سے آگاہ کر چکا تھا، خدیجہ کو بھی میں نے مختصر الفاظ میں اپنے پروگرام سے متعلق بتایا اور سفید گھوڑے کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی۔ وہ بڑی آسانی سے میری بات سمجھ گئی اور بولی۔

''جناب! یہ کام تو آپ کو پہلی فرصت میں کرنا چاہئے۔''

خدیجہ کی طرف سے اجازت ملتے ہی ہم اس گھنے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے جو فرید آباد اور موضع چھمن سنگھ کے درمیان پایا جاتا تھا۔ میں اور اے ایس آئی اپنے گھوڑوں پر سوار تھے جبکہ سفید گھوڑا بغیر کسی سوار کے آگے آگے بڑھ رہا تھا۔ جب تک ہم آبادی کے اندر رہے، میں نے امتیاز کے گھوڑے کی لگام تھامے رکھی۔ جنگل کی جانب جانے والے راستے پر چھوڑتے ہی میں نے اس کی لگام چھوڑ دی اور بڑے دلار سے کہا۔

''یہاں سے تمہارا کام شروع ہوتا ہے شہزادے! تم آگے آگے چلو گے اور سیدھے وہاں پہنچو گے جہاں تمہارے مالک امتیاز شیخ کو کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔''

اس بے زبان نے بڑی توجہ سے میری بات سنی، ہنہنا کر حکم کی تعمیل کا یقین دلایا اور خاموشی سے ایک جانب بڑھ گیا۔

اے ایس آئی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! میں نے ایسا ''فرمانبردار'' گھوڑا پہلے کہیں نہیں دیکھا۔''

''میں بھی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''اس کی پُر اعتماد چال سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہمیں کسی منزل پر پہنچا کر ہی دم لے گا۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں پہلے اس گھوڑے سے مدد لینے کا خیال کیوں نہیں آیا؟'' اس نے پوچھا۔

''مراد! قدرت کا کوئی کام خالی از مصلحت نہیں ہوتا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بھی تو دیکھو، یہ بے زبان پہلے چلنے کے قابل ہی کہاں تھا۔ اب یوں محسوس ہو رہا ہے، ہم اپنی منزل سے بہت قریب ہیں۔''

آدھے گھنٹے کے بعد میرا یہ یقین عملی صورت اختیار کر کے ہمارے سامنے آ گیا۔ اس گھوڑے نے ہمیں نہر کے کنارے پہنچایا اور تھوڑا آگے، نہر کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے ایک گڑھے کے پاس جا کر رک گیا۔ ہم اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ اے ایس آئی نے کہا۔

''ملک صاحب! یہ ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

گھوڑا بار بار اس گڑھے کی جانب منہ کر کے مخصوص انداز میں ہنہنا رہا تھا۔ مذکورہ گڑھے میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ میرے لئے گھوڑے کا بس اتنا سا اشارہ ہی کافی تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنی عقل اور اختیار کے گھوڑے دوڑانا تھے...... اور میں نے ایسا ہی کیا۔

میں نے فوری طور پر اے ایس آئی کو تھانے بھیج کر عملے کے چند افراد کو وہاں بلا لیا۔ پھر دوپہر تک اس گڑھے کا پانی باہر نکالنے کے بعد نیچے سے امتیاز شیخ کی لاش کو برآمد کر لیا گیا۔ اس کے جسم پر متعدد زخموں کے آثار ملے۔ غالباً یہ تیز دھار کلہاڑیوں کے زخم تھے جو بڑی بے دردی سے اسے لگائے گئے تھے۔

امتیاز شیخ کے لباس سے الجھی ہوئی سونے کی ایک زنجیر بھی گڑھے میں سے برآمد ہوئی۔ میں نے وہ زنجیر خدیجہ بیگم کو دکھائی تو اس نے صاف انکار کر دیا، وہ زنجیر امتیاز کی نہیں تھی۔

بعد ازاں میں نے طلائی زنجیر کی ''تلاش'' اور کھوج جاری رکھی اور بالآخر اس کے مالک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کام کرنے میں مجھے چار پانچ روز لگ گئے تھے۔ اس دوران امتیاز شیخ کو سپردِ خاک کیا جا چکا تھا۔

اس طلائی زنجیر کا مالک کوئی اور نہیں بلکہ مقتول کا چھوٹا بھائی ممتاز شیخ تھا۔ میں نے اسے گرفتار کر کے تفتیش کی چکی میں پیس ڈالا۔ بالآخر اسے اقبالِ جرم کرتے ہی بنی۔

اس نے بتایا کہ اسے کسی طرح تین ہزار کی رقم کے بارے میں سن گن مل گئی تھی۔ وہ بھائی اور بھابی کے رویے سے سخت برگشتہ تھا۔ اس نے بیچ جنگل کے امتیاز شیخ کو لوٹنا چاہا۔ اس کارروائی کے لئے اس نے اپنے دو ساتھیوں کا انتظام بھی کیا تھا۔ ان تینوں نے نقاب لگا رکھے تھے۔ وہ دونوں ساتھی پیش پیش تھے جبکہ ممتاز تھوڑا پیچھے رہ کر ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

امتیاز کے پاس سے جب کوئی رقم برآمد نہ ہوئی تو انہوں نے ناکام ہو کر درندگی کا مظاہرہ کیا اور کلہاڑیوں کے وار کر کے اسے جان سے مار ڈالا۔ اس ظالمانہ کارروائی میں امتیاز کا گھوڑا بھی شدید زخمی ہو کر وہاں سے بھاگ گیا ...... اور یہی زخمی گھوڑا بعد میں ممتاز کی گرفتاری کا سبب بن گیا۔

میں نے ممتاز کی نشان دہی پر اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی گرفتار کر کے بڑا ٹھیک ٹھاک فٹ کر دیا۔ وہ عدالت سے سزا پا کر جیل کی دیواروں کے پیچھے چلے گئے۔

آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ الطاف نے مجھے اپنی زندگی کے دوسرے دور کے جو حالات سنائے وہ اپنی جگہ ایک مکمل اور عبرت ناک داستان ہے۔ پھر کبھی یہ کہانی بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ بہ شرطِ زندگی......!

✽ ...... ✽

آخری ملاقات

اکتوبر کی ایک اُداس شام تھی۔

موسم سرما ابھی شروع نہیں ہوا تھا تاہم سہ پہر کے بعد فضا میں ہلکی پھلکی خنکی شامل ہو جاتی تھی۔ شام اور رات میں اگر سردی نہیں ہوتی تو گرمی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا محکمہ جاتی فائلوں کا پیٹ بھر رہا تھا۔ وہ پورا دن تھانے میں ہی گزر گیا تھا۔ باہر نکل کر سرگرمی دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ اسی سبب مجھ پر کسل مندی سی سوار ہونے لگی۔ ہاتھ پاؤں حرکت میں رہیں تو ذہن اور طبیعت بھی مستعد اور چست رہتی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر میں نے اس روز تھانے سے جلدی اٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ آٹھ بجے میں نے شبینہ ڈیوٹی والے اے ایس آئی کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

''مزمل! میں کوارٹر میں جا رہا ہوں۔ اگر کوئی ہنگامی ضرورت پیش آ جائے تو مجھے بلا لینا۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔'' وہ پُر اعتماد انداز میں بولا۔

میں تھانے سے نکل کر اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا جو عقبی سمت تھانے کی چوحدی کے اندر بنا ہوا تھا۔

اس روز میں نے خلافِ معمول رات کا کھانا بھی ذرا جلدی کھا لیا پھر عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں بستر پر لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی سوچ ابھری کہ تھانے میں اچانک میری ضرورت پیش آ گئی ہے!

جس طرح موت اور گاہک کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا، وہ کسی وقت بھی وارد ہو سکتے ہیں، بالکل اسی طرح پولیس کی ملازمت میں ایمرجنسی کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہوتا۔ تھانہ انچارج درحقیقت چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی ہوتا ہے ...... اگر وہ ڈیوٹی کی حقیقت کو سمجھتا ہو تو۔ ورنہ بعض تھانے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں تھانہ انچارج سب سے زیادہ مزے میں یعنی فارغ ہوتا

میں کوارٹر کا صحن عبور کر کے بیرونی دروازے پر پہنچا اور کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔

میری نگاہ کانسٹیبل اشفاق کے چہرے سے ٹکرائی میرے استفسار سے پہلے ہی وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سر جی! محلہ بجتے والا میں بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

مذکورہ محلہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا اور تھانے سے بہت قریب بھی تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''کیسی گڑبڑ؟''

''وہ جی...... ادھر ڈاکٹر بشارت ہے ناں۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''اس کے کلینک پر کوئی واردات شاردات ہوگئی ہے۔ اے ایس آئی صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا، ڈاکٹر بشارت کے کلینک پر کوئی واردات ہوئی ہے؟''

''ڈاکٹر کے کلینک کے سامنے طفیل نامی ایک بندہ ڈرائی فروٹس کا ٹھیلا لگاتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس نے ابھی ابھی یہ اطلاع دی ہے۔''

''کیا طفیل اس وقت تھانے ہی میں موجود ہے؟''

''جی ہاں، اے ایس آئی نے اسے بٹھا رکھا ہے۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''واردات کی نوعیت کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟''

''جی لڑائی جھگڑے کا ایک سنگین واقعہ ہے۔''

کسی کلینک پر لڑائی جھگڑے کے واقعات عموماً پیش آتے تو نہیں ہیں۔ اس اطلاع نے میرے ذہن کو الجھا دیا۔ میں نے کانسٹیبل اشفاق سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم چلو۔ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔''

پانچ منٹ کے بعد میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ طفیل کو میں نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ میرے سوالات کے جواب میں اس نے اپنی معلومات کے مطابق جو جواب دیئے ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

ڈاکٹر بشارت کا اپنے کسی مریض سے جھگڑا ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں غصیلے مریض نے ڈاکٹر کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ کلینک کے قریب ہی میڈیکل اسٹور بھی تھا۔ ہنگامہ آرائی کی اطلاع پا کر میڈیکل اسٹور کا مالک شہباز کلینک پر پہنچا تو اس دوران حملہ آور مریض ''اپنا کام'' کر کے موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ شہباز نے فوری طور پر عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور ڈاکٹر بشارت کو اٹھا کر سول ہسپتال لے گیا۔ شہباز ہی کے ایما پر طفیل اس افسوس ناک واقعے کی اطلاع دینے تھانے پہنچا تھا۔ طفیل کے مطابق، یہ واقعہ لگ بھگ

ساڑھے آٹھ بجے پیش آیا تھا۔

مریض اور ڈاکٹر کے درمیان تلخ کلامی کے اِکا دُکا واقعات تو کبھی کبھار سننے میں آتے رہتے تھے لیکن یہ اپنی نوعیت کی انوکھی واردات تھی جس میں ایک مریض نے اپنے مسیحا کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ نہ صرف زخمی کیا تھا بلکہ جائے واردات سے فرار بھی ہو گیا تھا۔

ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی تھی اور وہ یہ کہ زخمی ڈاکٹر کو کلینک پر ٹریٹ کرنے کی بجائے ہسپتال کیوں پہنچایا گیا۔ میں جانتا تھا بشارت کلینک ایک خاصا چلتا ہوا کلینک تھا اور ڈاکٹر بشارت نے اپنی مدد کے لئے ایک چھوڑ دو دو کمپاؤنڈر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے ایک آدھ مرتبہ اس کلینک پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ بشارت کا فی الفور ہسپتال پہنچایا جانا واقعے کی سنگینی کو ظاہر کرتا تھا۔

میں نے کانسٹیبل مراد کو اپنے ساتھ لیا اور تھانے سے نکل آیا۔ میں جس دوران طفیل سے سوال جواب کر رہا تھا، اے ایس آئی مزمل نے میر لئے ایک تانگے کا بندوبست کر دیا تھا۔ میں اس تانگے میں بیٹھا اور کوچ بان سے محلہ بجتے والا چلنے کے لئے کہا۔

ڈاکٹر بشارت کو شدید زخمی حالت میں سول ہسپتال پہنچایا جا چکا تھا۔ اصولی طور پر پہلے مجھے ادھر ہی کا رخ کرنا چاہئے تھا مگر ایک فوری خیال کے تحت میں نے کلینک میں جھانکنا ضروری سمجھا۔ تانگہ تھانے سے نکل کر جی ٹی روڈ پر آیا پھر بائیں طرف محلّہ بجتے والا کی جانب مڑ گیا۔

''بشارت کلینک'' اس وقت کھلا ہوا تھا۔ میں کلینک کے اندر پہنچا تو عارف کمپاؤنڈر سے ملاقات ہوئی۔ عارف ایک پستہ قامت اور خاصا چاق و چوبند ڈسپنسر تھا۔ کلینک میں تین چار مریض بھی موجود تھے۔ عارف کی زبانی مجھے معلوم ہوا، وہ ان مریضوں کو گزشتہ روز والی دوا دے کر ہی رخصت کر دے گا۔ انہیں ڈاکٹر بشارت کے علاج سے افاقہ تھا اور وہ بضد تھے کہ اگر ڈاکٹر موجود نہیں تو انہیں فائدہ پہنچانے والی وہی دوا دے دی جائے۔ میری آمد پر عارف کچھ زیادہ ہی مستعد ہو گیا اور پندرہ منٹ میں اس نے تمام مریضوں کو ''نمٹا'' دیا۔

جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس سے ڈاکٹر کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے بتایا کہ رات کے ابتدائی حصے میں خوشیا نامی ایک شخص اس کلینک پر پٹی کروانے آیا۔ اس کی بائیں ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔ پنڈلی کا گوشت بڑے بھیانک انداز میں پھٹ کر لٹک رہا تھا اور خون بھی پوری طرح رکا نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ صرف پٹی سے کام نہیں چلے گا، ٹانکے لگا کر باقاعدہ ڈریسنگ کرنا

ہو گی۔ مریض کا اصرار تھا کہ کوئی دوا لگا کر پٹی باندھ دی جائے لیکن زخم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے ماہرانہ انداز میں کہہ دیا، کم از کم چھ ٹانکے لگانا ہوں گے ورنہ گوشت یونہی لٹکا رہے گا اور زخم مہینوں تک ٹھیک ہونے میں نہیں آئے گا!

ڈاکٹر کے حتمی انداز کو دیکھتے ہوئے خوشیا اسٹچنگ پر راضی ہو گیا۔ ڈاکٹر بشارت نے آدھے پونے گھنٹے کی محنت سے اس کا زخم سی دیا اور کمپاؤنڈر امان اللہ سے کہا کہ وہ زخم پر ڈریسنگ کر دے۔ امان اللہ نے اپنا کام نمٹایا تو ڈاکٹر نے مریض کی پرچی اس تک پہنچا دی۔ اس پرچی پر مریض کو بہم پہنچائی جانے والی طبی امداد، دوا اور ایک کونے میں مریض سے وصول کرنے والی رقم مخصوص کوڈ میں درج تھی۔ جیسا کہ کلینک کے عام دستور کے مطابق کیا جاتا ہے۔

امان اللہ نے دوا تیار کرنے کے بعد مریض کو تھمائی، اس کے استعمال کا طریقہ بتایا اور کوڈ میں لکھی ہوئی رقم کا مطالبہ کیا۔

خوشیا نے ادائیگی سے انکار کر دیا۔ امان اللہ نے کہا۔ ”پیسے تو تمہیں دینا پڑیں گے بھائی۔“

”میں بہت غریب آدمی ہوں۔“ خوشیا نے کہا۔ ”میں پیسے نہیں دے سکتا۔ تم ایک نیکی سمجھ کر معاف کر دو۔“

اس وقت امان اللہ اور عارف دونوں ڈسپنسری میں موجود تھے اور یہ گفتگو عارف کے سامنے ہی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر اسٹچنگ کے بعد دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا جہاں دوسرے مریض اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر بشارت کا کلینک ایک چھوٹے سے کمرے اور ایک کشادہ ہال پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر خود کمرے میں بیٹھتا تھا۔ ہال انتظار گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی ہال کے ایک کونے میں، داخلی دروازے کے قریب ڈسپنسری بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بشارت نے اس کلینک میں اچھا سیٹ اپ بنا رکھا تھا۔

امان اللہ نے خوشیا کے جواب میں کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب نے پرچی پر پیسے لکھ دیئے ہیں۔ اگر تم نہیں دو گے تو مجھے اپنی جیب سے ڈالنے پڑیں گے۔ رات کو روزانہ کلینک بند کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب پرچیوں کو جانچ کر حساب کرتے ہیں اور اس حساب کے مطابق وہ رقم وصول کرتے ہیں۔ میں تم سے بھی زیادہ غریب آدمی ہوں۔ مجھ پر رحم کرو اور پیسے دے دو۔“

امان اللہ ایک دھان پان اور دراز قد نوجوان تھا۔ اس کی وضاحت کا خوشیا پر کوئی اثر نہ

ہوا اور وہ اس بات پر مصر رہا کہ علاج و معالجے کا معاوضہ ادا نہیں کرے گا۔ ڈسپنسر اور مریض کے درمیان ہونے والی تکرار سے ڈاکٹر بشارت واقف نہیں تھا۔ جب وصولی اور ادائیگی کا یہ معاملہ زیادہ بڑھنے لگا تو عارف نے خوشیا سے کہا۔

”تم خواہ مخواہ ہم سے جھگڑا کیوں کر رہے ہو۔ اگر تمہیں پیسے ادا نہیں کرنے تو ڈاکٹر صاحب سے بات کر لو۔ وہ اگر چاہیں گے تو پرچی پر سے پیسے کاٹ دیں گے۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔“

خوشیا کٹ حجتی پر اتر آیا۔ ”تم دونوں جھوٹ بول رہے ہو۔ ڈاکٹر نے پرچی پر کہیں بھی پیسے نہیں لکھے۔ اگر لکھے ہیں تو مجھے بھی دکھاؤ؟“

وہ بے چارے کہاں سے دکھاتے۔ ڈاکٹر بشارت نے وصولی کی رقم مخصوص کوڈ میں درج کی تھی جیسا کہ جنرل فزیشن عام طور پر کرتے ہیں۔ خوشیا کی نامعقولیت کو دیکھتے ہوئے عارف نے امان اللہ سے کہا۔

”لاؤ یار! یہ پرچی مجھے دو۔ میں ڈاکٹر صاحب کو دکھا کر آتا ہوں اور ان سے پوچھ بھی لیتا ہوں۔“

امان اللہ نے مذکورہ پرچی عارف کی طرف بڑھا دی۔ عارف پرچی لے کر ڈاکٹر بشارت کی جانب بڑھا لیکن اس کے کمرے میں داخل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اسی لمحے ڈاکٹر کسی کام سے کمرے میں سے نکلا پھر اس سے پہلے کہ عارف یا امان اللہ میں سے کوئی اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتا، خوشیا تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔

”ار...... رے...... یہ کیا کر رہے...... ہو؟“ بے ساختہ ڈاکٹر بشارت کی زبان سے ادا ہوا۔

ڈاکٹر کا یہ حیرت بھرا استفسار خوشیا کے لئے تھا۔ اس اللہ کے بندے نے ڈاکٹر کو دیکھتے ہی ہوا میں چھلانگ لگائی اور الٹی قلا بازی مارنے کے بعد اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

”ابھی میں نے تمہاری پنڈلی پر چھ ٹانکے لگائے ہیں اور تم یہ کرتب بازی کر رہے ہو۔“ ڈاکٹر نے حیرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت کے دوران کہا۔ ”اس اچھل کود سے اگر کوئی ٹانکا کھل گیا تو تمہارے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی!“

”ڈاکٹر صاحب! ہم بڑے سخت جان لوگ ہیں، یہ چھوٹی موٹی چوٹیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا، کوئی دوا لگا کر پٹی باندھ دیں لیکن آپ نے اپنا بل

بڑھانے کے لئے خواہ مخواہ ٹانکے لگا دیئے۔" وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اب آپ کے یہ دونوں کمپاؤنڈر مجھے تنگ کر رہے ہیں۔ اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو میں ضرور دے دیتا۔ لیکن یہ میری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے۔"

ڈاکٹر نے قدرے ہمدردی اور توجہ سے خوشیا کی طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

"تم آسانی سے جتنے پیسے دے سکتے ہو، دے دو۔" پھر وہ امان اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ جتنے پیسے بھی دے، وہی پرچی پر بھی لکھ دینا۔"

ایک مخلص ڈاکٹر اپنے ضرورت مند مریض کے ساتھ یہی مہربانی کر سکتا ہے۔ لیکن خوشیا اس وقت کسی اور ہی موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ بڑے حتمی لہجے میں بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! اتنے اور جتنے کی بات نہیں۔ میں آپ کو ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔"

ڈاکٹر یہی سمجھا کہ وہ واقعی اتنا مفلس اور نادار ہے کہ ایک پیسہ تک ادا نہیں کر سکتا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا تمہاری جیب میں کچھ بھی نہیں ہے؟"

"اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو میں آپ کو خوش کرنے کے لئے کرتب کیوں دکھاتا؟"

کرتب سے اس کی مراد الٹی قلابازی تھی جو ڈاکٹر پر نگاہ پڑتے ہی اس نے اچھل کر ہوا میں لگائی تھی۔ ڈاکٹر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"خوشیا! تم کرتے کیا ہو؟"

"جناب! میں جانوروں کا کاروبار کرتا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "ہم سال بھر ڈھور ڈنگر پالتے ہیں اور بڑی عید سے پہلے شہروں قصبوں کی طرف نکل آتے ہیں۔ چند دن مویشی منڈی میں گزار کر واپس چلے جاتے ہیں۔ آج کل ہم آپ کے شہر آئے ہوئے ہیں۔"

ان دنوں بقرہ عید کی آمد آمد تھی اور قربانی کے جانوروں کی خریداری عروج پر تھی۔ میرے تھانے سے کچھ فاصلے پر سبزی منڈی واقع تھی اور منڈی کے ساتھ ہی ایک وسیع و عریض میدان کھلا پڑا تھا جہاں ہر سال علاقے کی سب سے بڑی مویشی منڈی لگا کرتی تھی۔ خوشیا نے ڈاکٹر بشارت سے اسی مویشی منڈی کا ذکر کیا تھا۔ میری تازہ ترین معلومات کے مطابق جس میدان میں اس زمانے میں مویشی منڈی لگا کرتی تھی آج کل وہاں ایک منی اسٹیڈیم کی تعمیر جاری ہے۔ وہ علاقہ چونکہ ایک چھوٹے سے شہر کی صورت اختیار کر چکا ہے لہٰذا مستقبل میں اس شہر کے اکلوتے اسٹیڈیم میں بڑے بڑے میچ ہونے کی توقع ہے!

ڈاکٹر بشارت نے اس سے کہا۔ "پھر تم غریب کس طرح ہو گئے؟ مویشی فروخت کرنے

والے تو عید کے سیزن لگا کر سال بھر کی روٹیوں کا بندوبست کر لیتے ہیں۔"

"جناب ابھی تو جانور بکنا شروع بھی نہیں ہوئے۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "ہم آج صبح ہی تو آپ کے علاقے میں آئے ہیں۔ بس آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے میرے پاس یہی ایک آئٹم ہے۔"

بات ختم کرتے ہی خوشیا ایک مرتبہ پھر ہوا میں بلند ہوا، پلک جھپکتے میں اس نے اپنی باڈی کو گٹھڑی کی صورت دی اور لگاتار دو الٹی قلابازیاں لگا کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ زخمی ٹانگ کے ساتھ اس قسم کے فن کا مظاہرہ کرنا حماقت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر بشارت، خوشیا کی اس حرکت پر سر پیٹ کر رہ گیا۔ جھنجلاہٹ میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"اچھا بابا! جاؤ، جان چھوڑو۔ تم تو مجھے کوئی پاگل لگتے ہو۔ پیسوں وغیرہ کو جہنم میں ڈالو اور میرے کلینک سے فوراً باہر نکل جاؤ۔ خواہ مخواہ کوئی اور مصیبت نہ بنا دینا۔"

"ڈاکٹر صاحب! اس کو ایسے نہ چھوڑیں۔" عارف کی پُر جوش آواز گونجی۔ "اس کے پاس بہت سارے پیسے ہیں ...... یہ دیکھیں۔"

ڈاکٹر نے توجہ دلانے پر بڑی سرعت سے عارف کی جانب دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں ایک بٹوا کھولے کھڑا تھا، لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ ...... بٹوا...... اس کی جیب سے گرا ہے ......اور نوٹوں سے بھرا ہوا ہے......"

الٹی قلابازیاں لگانے کے دوران وہ بٹوا خوشیا کی جیب سے پھسل کر کلینک کے فرش پر گر گیا تھا۔ اس "فرار" کا خوشیا کو مطلق احساس نہ ہوا لیکن بٹوے پر نگاہ پڑتے ہی عارف نے فوراً اسے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ سیاہ رنگ کا وہ بٹوا اس وقت عارف کے ہاتھوں میں دکھائی دے رہا تھا۔

ڈاکٹر کے ساتھ ہی خوشیا نے بھی بٹوے کی طرف دیکھا۔ اپنی شے کو پہچاننا کسی کے لئے بھی مشکل نہیں ہوتا اور وہ "شے" اگر نوٹوں سے بھری ہو تو یہ کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ خوشیا کی آنکھوں میں کسی شِکرے جیسی خطرناک چمک نمودار ہوئی۔ وہ عارف کی جانب بڑھتے ہوئے خونخوار لہجے میں غرایا۔

"لاؤ ادھر ...... میرا بٹوا دو۔"

اس کے ساتھ ہی خوشیا نے عارف کو مارنے کی کوشش بھی کی۔ اس کے ہاتھ میں جانوروں کو کنٹرول کرنے والا مضبوط ڈنڈا تھا جس کے دونوں سروں پر آہنی خول چڑھے

ہوئے تھے لیکن عارف اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ خوشیا جیسے ہی اس خطرناک ڈنڈے سے عارف پر حملہ آور ہوا، اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے سیاہ بٹوا ڈاکٹر بشارت کی جانب اچھال دیا۔

ڈاکٹر بشارت نوجوانی کے زمانے میں ایک اچھا اسپورٹس مین رہا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے بٹوے کو کیچ کر لیا۔ اس لمحے خوشیا عارف کو بھول کر بشارت کی جانب مڑا۔ لگتا تھا، وہ بٹوا اس کے لئے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا انکشاف ہوتے ہی خوشیا پر ایک جنون سا سوار ہو گیا تھا۔ وہ بڑے ہیجانی انداز میں ڈنڈا سونتتے ہوئے ڈاکٹر کی جانب بڑھا۔

ڈاکٹر اس دوران بٹوا کھول کر اس میں رکھی رقم شمار کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ خوشیا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آگے بڑھ کر بڑے وحشیانہ انداز میں ڈاکٹر پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیئے۔ لگتا تھا، وہ چرندوں کے ساتھ نہیں بلکہ درندوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہو اور اسی صحبت سے اس میں درندوں کی خُو بُو، رچ بس گئی ہو۔ پتہ نہیں، اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر بشارت کو خوشیا کی طرف سے ایسے شدید ردِ عمل کی توقع نہیں تھی اس لئے وہ دھوکے میں مار کھا گیا۔ خوشیا نے پہلے اس کے ہاتھوں پر ڈنڈے برسائے۔ جب اس کے ہاتھوں سے بٹوا نہیں چھوٹا تو اس نے ڈاکٹر کے چہرے کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ خوشیا کا یہ عمل اتنا اضطراری اور میکانکی تھا کہ ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا اور اپنے چہرے اور سر کو بچانے کی خاطر اس نے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھا لیا۔

اس کوشش کے دوران بٹوا اس کے ہاتھوں سے نیچے گر گیا۔ خوشیا نے موقع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے بٹوا اٹھایا اور ڈاکٹر کو اس کے حال پر چھوڑ کر کلینک سے فرار ہو گیا۔ جب تک امان اللہ اور عارف، ڈاکٹر بشارت کی مدد کو آتے، وہ فرش پر گر چکا تھا۔ یہ ایسی صورت حال تھی کہ کسی کو خوشیا کا تعاقب کرنے کا خیال نہ آیا۔ دونوں کمپاؤنڈرز نے ڈاکٹر کو فرش پر سے اٹھا کر ایک بینچ پر ڈال دیا۔

یہ وہی بینچ تھی جس پر ڈاکٹر بشارت اپنے مریضوں کو لٹا کر چیک کرتا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ جب امان اللہ اور عارف کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو امان اللہ میڈیکل اسٹور سے شہباز کو بلا لایا۔ وہی شہباز جس کے ایماء پر طفیل اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے آیا تھا۔

ڈاکٹر ہوش میں تو تھا لیکن اس کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔ شہباز نے اسے دیکھتے

ہی کہہ دیا۔

”ڈاکٹر صاحب کو ہسپتال لے جانا چاہئے۔ معاملہ خاصا سنگین نظر آ رہا ہے۔“

ڈسپنسرز کلینک پر ہی ڈاکٹر کی مرہم پٹی کا سوچ رہے تھے۔ لیکن بشارت کی پیشانی اور ناک سے اس تیزی سے خون بہہ رہا تھا کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس صورت حال میں جب شہباز نے ڈاکٹر کو ہسپتال لے جانے کی تجویز پیش کی تو سب نے اس سے اتفاق کیا۔ چنانچہ شہباز، ڈاکٹر بشارت کو اپنے ساتھ سول ہسپتال لے گیا۔

عارف نے مجھے اس واقعے کی تفصیل بتانے کے بعد کہا۔ ”شہباز ابھی تک واپس نہیں آیا۔ پتہ نہیں، ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے۔“

”امان اللہ کہاں ہے؟“ میں نے خالی کلینک میں نگاہ دوڑاتے ہوئے دوسرے کمپاؤنڈر کے بارے میں استفسار کیا۔

میں جب کلینک پر پہنچا تو وہاں تین چار مریض موجود تھے جنہیں عارف نے جھٹ پٹ فارغ کر دیا تھا۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”شہباز کے ساتھ ہی امان اللہ بھی ہسپتال چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو سنبھالنا اکیلے شہباز کے بس کی بات نہیں تھی۔“

عارف کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم کب تک یہاں بیٹھے انتظار کرتے رہو گے۔ چاہو تو کلینک کو بند کر دو۔ میں سیدھا ہسپتال ہی جا رہا ہوں۔“

”جناب! شہباز میڈیکل اسٹور بھی ابھی تک کھلا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”شہباز کا ملازم بھی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ویسے بھی کلینک کا وقت ختم ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی ہیں میں وقت پر ہی کلینک بند کروں گا۔“

”تم لوگ عموماً کتنے بجے کلینک بند کر دیتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”رات کو گیارہ بجے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر مریض موجود ہوں تو دیر بھی ہو جاتی ہے۔ ویسے ساڑھے دس کے بعد عام طور پر مریض آتے نہیں ہیں۔ ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھ کر مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے درمیان زیادہ تر میڈیکل پر گفتگو ہوتی ہے۔ اسی دوران مریضوں والی پرچیوں کا بھی حساب کر لیا جاتا ہے۔“

پھر اس نے مجھے ”بشارت کلینک“ کے اوقات کے بارے میں تفصیلاً بتایا۔ مذکورہ کلینک دونوں وقت نہایت پابندی کے ساتھ کھلتا تھا۔ صبح نو بجے سے دوپہر ایک بجے تک اور پھر شام پانچ بجے سے رات گیارہ بجے تک۔ ڈاکٹر بشارت کا گھر محلّہ بخشے والا ہی میں تھا اس

لئے دو وقت کی آمد و شد میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ امان اللہ کی رہائش باغبان پورہ میں تھی اور عارف ریل بازار میں رہتا تھا۔ وہ دونوں اپنی سائیکلوں پر کلینک آتے جاتے تھے۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے عارف سے پوچھا۔ ''کیا ڈاکٹر بشارت کے گھر والوں کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''کیوں؟'' میں نے متعجب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''ڈاکٹر کا گھر تو چند قدموں کی دوری پر ہے۔''

''میں نے ڈاکٹر صاحب کے گھر کا چکر لگایا تھا لیکن وہاں تالا پڑا ہوا ہے۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''پھر مجھے یاد آیا کہ ڈاکٹر صاحب کے بیوی بچے تو شاہین آباد گئے ہوئے ہیں۔''

شاہین آباد، بختے والا سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے عارف سے پوچھا۔ ''وہ لوگ شاہین آباد کیوں گئے ہیں؟''

''شاہین آباد میں ڈاکٹر صاحب کی سسرال ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بچے اپنی نانو کے گھر گئے ہیں۔''

''اوہ!'' میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

اس کے بعد میں نے عارف سے مزید دو چار ضروری سوالات کئے اور کانسٹیبل کے ساتھ کلینک سے باہر نکل آیا۔ اس دوران کوچ بان تانگے میں موجود رہ کر ہمارا انتظار کرتا رہا تھا۔ ہم تانگے پر سوار ہوئے اور سول ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر بشارت کو پیش آنے والا واقعہ بظاہر انتہائی معمولی نوعیت کا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں، میرے اندر کوئی مسلسل یہ کہہ رہا تھا کہ اس واقعے کو حقیر نہ سمجھا جائے۔ میری جگہ اگر کوئی اور تھانے دار ہوتا تو اپنی بجائے وہ کسی کانسٹیبل کو بھیج کر صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کرتا۔ میں اپنے اندر اٹھنے والی آواز کو جاننے سے قاصر تھا مگر اپنے محسوسات کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خوشیا کا رویہ اور ردِ عمل ذہن کو الجھا دینے والا تھا۔ میں الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ اس مویشی فروش کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس کی جیب میں اگر اچھی خاصی رقم موجود تھی تو پھر اس نے ادائیگی سے انکار کیوں کیا؟ ڈاکٹر بشارت نے اس کی پنڈلی میں پورے چھ ٹانکے لگائے تھے، وہ ایسے خطرناک زخم پر

محض پٹی ہی کیوں کروانا چاہتا تھا؟ اور سب سے اہم بات کہ وہ زخم اسے کیسے لگا تھا؟ پھر زخمی پنڈلی کے ساتھ نہ صرف اس نے سمر سالٹ (قلابازیوں) کا مظاہرہ کیا بلکہ با آسانی وہاں سے فرار بھی ہو گیا...... کیونکر؟ وہ سیاہ بٹوے کو دیکھ کر آپے سے باہر کیوں ہو گیا تھا؟ اس نے ڈاکٹر کو زدوکوب کر کے جس بربریت کا عملی ثبوت دیا، اس کے پیچھے اس کی نفسیات کا کون سا پہلو کارفرما تھا؟ اور کیا واقعی وہ کوئی مویشی فروش ہی تھا؟ اس بات کا بھی بھروسہ نہیں تھا کہ اس کا نام خوشیا ہی ہو!

❋❋❋

ہسپتال پہنچتے پہنچتے رات کے گیارہ بج گئے۔

اس وقت تک فضا میں اچھی خاصی خنکی شامل ہو چکی تھی۔ میں نے تانگے والے کو ایک مرتبہ پھر انتظار کی سولی پر چڑھایا اور کانسٹیبل مراد کے ساتھ ہسپتال کے اندر داخل ہو گیا۔ جلد ہی ہم ڈاکٹر بشارت کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اس وقت ہسپتال کے ایک بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے سے پہلے اس ڈاکٹر سے ملنا ضروری سمجھا جس نے ہسپتال میں اسے اٹینڈ کیا تھا۔

میری یہ کوشش خاصی سودمند ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر کی زبانی مجھے ڈاکٹر بشارت کی حالت کے بارے میں پتہ چل گیا۔ خوشیا کے جنون نے ڈاکٹر کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر کے مطابق ڈاکٹر بشارت کی پیشانی پر چار ٹانکے لگانا پڑے تھے۔ ناک کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی تھی اور خون روکنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ بشارت کی کلائیوں، کہنیوں اور ہاتھوں پر بھی گومڑ اور نیل کے نشانات پائے گئے تھے۔ یہ سب اس ڈنڈا کاری کا نتیجہ تھا جو خوشیا کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔

''مریض کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔'' ڈیوٹی ڈاکٹر نے بتایا۔ ''وہ چاہے تو گھر جا سکتا ہے۔ ہم نے ضروری ٹریٹ منٹ دے دیا ہے۔''

ایک ڈاکٹر کے لئے مریض کا لفظ سن کر مجھے بڑا عجیب سا لگا، تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ فی الوقت ایسا ہی تھا۔ بشارت نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے خوشیا کو ٹریٹ کیا تھا۔ پھر اسی کی ''مہربانی'' سے وہ ڈاکٹر سے مریض میں بدل گیا۔

میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے ضروری معلومات حاصل کیں اور اٹھ کر ڈاکٹر بشارت کے پاس آ گیا۔

امان اللہ ڈسپنسر بھی اس کے بیڈ کے پاس ہی کھڑا تھا۔ میری آمد کے بارے میں امان اللہ

نے ڈاکٹر بشارت کو آگاہ کیا تو اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ اس کا سر اور ناک پٹیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ مجھے اس کی حالت پر خاصا ترس بھی آیا۔

چند سوالات سے مجھے اندازہ ہو گیا، وہ اس مرحلے سے گزرنے کے قابل تھا۔ میں نے اسے زیادہ پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور پوچھا۔

''کیا آپ کے بیوی بچوں کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی ہے؟''

''میں نے تھوڑی دیر پہلے شہباز کو شاہین آباد بھیجا ہے۔'' ڈاکٹر بشارت نے بتایا۔ ''وہ میری فیملی کو اپنے ساتھ ہی لے کر آئے گا۔''

''مجھے آپ کے کمپاؤنڈر عارف نے خاصی تفصیل سے اس حادثے کے بارے میں بتایا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ اپنی نوعیت کا ایک عجیب اور منفرد واقعہ ہے۔ آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''سچی بات تو یہ ہے، میں خوشیا کے رویے کو ابھی تک سمجھ نہیں پایا ہوں۔''

''کیا آپ اسے پہلے سے جانتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

یہ سوال میں نے اس لئے کیا تھا تاکہ کسی رنجش یا دشمنی کا سراغ لگایا جا سکے۔ ڈاکٹر نے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔ ''میں نے اس بدبخت کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔''

''علاقے کے کسی اور شخص سے آپ کی کوئی چپقلش وغیرہ تو نہیں ہے؟''

میں یہ جاننا چاہتا تھا، کہیں ڈاکٹر کے کسی دشمن نے خوشیا کو اپنا آلہ کار نہ بنایا ہو۔ لیکن ڈاکٹر کے جواب نے میرے اس خیال کی نفی کر دی۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔ ''میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔''

''پھر تو خوشیا کا رویہ سمجھ میں آنے والا نہیں۔'' میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''ایک نارمل انسان سے ایسے جارحانہ ردِعمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''

''وہ نارمل نہیں بلکہ کوئی نفسیاتی مریض تھا۔'' ڈاکٹر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اس کے لئے زیادہ مناسب لفظ ''مجرم'' ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ خطرناک شخص ضرور مجرمانہ ذہنیت رکھتا ہو گا۔''

ڈاکٹر کے جواب نے مجھے ایک خاص زاویے سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ خوشیا کی طرف سے میرا دل بھی مطمئن نہیں تھا۔ میں بھی اس کے حوالے سے خاصے منفی انداز میں سوچنے پر مجبور تھا۔ میں نے ڈاکٹر بشارت سے پوچھا۔

''کیا خوشیا نے آپ کو بتایا تھا، اس کی پنڈلی پر زخم کیسے آیا تھا؟''

''میں جب بھی کسی غیر معمولی زخم والے شخص کو ٹریٹ کرتا ہوں تو اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر کے اپنی تسلی ضرور کر لیتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''میں نے خوشیا سے بھی اس سلسلے میں چند سوالات کئے تھے جن کے جواب میں اس نے جو کچھ بتایا وہ مجھے مطمئن کر دینے کے لئے کافی تھا لیکن اب میں دوسرے انداز میں سوچ رہا ہوں......''

ڈاکٹر بشارت بولتے بولتے اچانک خاموش ہوا تو میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شک ہے، خوشیا کی ٹانگ کسی مجرمانہ کارروائی کے نتیجے میں زخمی ہوئی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''ابھی تک آپ نے بتایا نہیں کہ خوشیا نے آپ کو کیا وجہ بتائی تھی؟''

''اس نے بتایا تھا، وہ ایک زیرِ تعمیر عمارت کے قریب سے گزر رہا تھا۔ وہاں دیگر بلڈنگ میٹریل کے علاوہ بہت سارا سریا بھی رکھا ہوا تھا۔ اسی سریے کے ڈھیر میں ایک سریا بڑے خطرناک انداز میں باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کی نظر نہیں پڑی اور وہ سریا اس کی پنڈلی کو زخمی کر گیا۔''

بلڈنگ میٹریل کے حوالے سے عموماً ایسے واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ اگر خوشیا واقعی کوئی مجرم تھا تو اس نے اپنے زخم کی مناسبت سے بڑا معقول جواز پیش کیا تھا، شاید اسی لئے ڈاکٹر کو بھی اس کی بات کا یقین آ گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر بشارت سے استفسار کیا۔

''آپ نے خوشیا کی ٹانگ کے زخم کو سی کر مرہم پٹی کر دی تھی۔ چھ ٹانکے کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود بھی اس نے نہ صرف یہ کہ الٹی قلابازیوں کا مظاہرہ کیا بلکہ موقع ملتے ہی وہاں سے فرار بھی ہو گیا۔ اس کی یہ کارکردگی زخمی حالت سے میل نہیں کھاتی۔''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کی اس حرکت پر میں خود بھی حیران ہوں۔ میں نے اس کی پنڈلی کے پانچ انچ لمبے اور آدھے انچ گہرے زخم پر پورے چھ ٹانکے لگائے تھے اور توقع کر رہا تھا کہ وہ لنگڑا کر بھی بہ مشکل چل سکے گا لیکن اس نے میرے کلینک پر ایسی اچھل کود مچائی کہ عقل دنگ ہے۔''

وہ لمحہ بھر کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب میں نے اس کے زخم کا معائنہ کر کے ٹانکے لگانے کا فیصلہ کیا تو اس کا کہنا تھا، میں ٹانکوں کے چکر میں نہ پڑوں اور محض پٹی کر دوں۔ میں نے اسے زخم کی خطرناکی سے آگاہ کیا تو اس نے کہا تھا، میں بہت سخت جان

ہوں۔لوٹ پوٹ کر خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا......اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مجھے متاثر کرنے کے لئے جب اس نے قلابازیاں لگائیں تو کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا، وہ شدید زخمی ہے۔ سخت جانی اور کیا ہوتی ہے تھانے دار صاحب؟''

اس نے سوالیہ جملے پر بات ختم کی تو میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ میں خوشیا کو جلد ہی حراست میں لے لوں گا۔ جب وہ میرے قابو آئے گا تو اس کی سخت جانی کا ''ٹیسٹ'' بھی ہو جائے گا۔فکر نہ کریں، آپ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا پورا حساب لیا جائے گا!''

میں نے لفظ ''ٹیسٹ'' پر اچھا خاصا زور دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ چند لمحات تک وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''ایک بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ جب اس کے بٹوے میں ایک موٹی رقم موجود تھی تو پھر اس نے بل کی ادائیگی میں اتنی حیل و حجت کیوں کی؟ میں بہت سے مستحق مریضوں کا مفت علاج کر دیتا ہوں۔ اگر میں اس بدبخت سے پیسے نہ لیتا تو بھی مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ لیکن پتہ نہیں، اس نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔ جیب میں اچھی خاصی رقم موجود ہونے کے باوجود بھی وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ وہ بہت غریب ہے، علاج کے پیسے ادا نہیں کر سکتا۔''

''یہ نکتہ اس وقت آپ کی اور میری سمجھ میں آئے گا جب وہ نامراد میرے ہتھے چڑھے گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔''ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو اس کے بٹوے میں جھانکنے کا موقع ملا تھا۔ کتنی رقم چھپا رکھی تھی اس نے اپنے بٹوے میں؟''

''اس نے مجھے رقم گننے کی مہلت کہاں دی تھی۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔''پتہ نہیں، اچانک اس پر کون سا بھوت سوار ہو گیا تھا کہ اس نے بے دریغ مجھے مارنا شروع کر دیا۔ بہرحال......'' وہ متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''میرے اندازے کے مطابق کم از کم دو ہزار روپے تو ہوں گے اس کے بٹوے میں۔''

''دو ہزار!'' میں نے حیرت بھری آواز میں دہرایا۔''یہ تو اچھی خاصی رقم ہے۔''

اس زمانے میں دو ہزار روپے ایک خطیر رقم شمار ہوتی تھی۔ میں اپنی ان کہانیوں میں اِس زمانے اور اُس زمانے کا تقابلی جائزہ کئی مرتبہ پیش کر چکا ہوں۔ آج کل کے حساب سے وہ رقم کسی بھی طور پر دو لاکھ روپے سے کم حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ مجھے گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ڈاکٹر بشارت نے کہا۔

''اس نے ایک اور جھوٹ بھی بولا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق، وہ آج ہی مویشی منڈی میں پہنچا تھا اور ابھی تک اس نے ایک بھی جانور فروخت نہیں کیا تھا لیکن بٹوے والی رقم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے وہ کافی دنوں سے منڈی میں موجود ہے اور اچھا خاصا کاروبار کر چکا ہے۔''

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔''ڈاکٹر صاحب! آپ کا اندازہ کافی حد تک درست نظر آتا ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے، اس کے علاوہ کوئی بات ہو۔''

''مثلاً اور کون سی بات ہو سکتی ہے؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔''ڈاکٹر صاحب! آپ اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالیں۔ یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں بہت جلد خوشیا کی اصلیت معلوم کر لوں گا۔'' پھر ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔''اگر وہ واقعی خوشیا ہے تو!''

''جی، کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ الجھ گیا۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔''یہ بھی تو ممکن ہے، اس نے اپنا نام غلط بتایا ہو۔''

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔''اس کے جھوٹے ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے۔''

میں عارف سے خوشیا کے حلیے، قد کاٹھ، جسمانی ساخت اور رنگت وغیرہ کے بارے میں تفصیلاً معلوم کر چکا تھا۔ یہی سوالات میں نے باری باری امان اللہ اور ڈاکٹر بشارت سے بھی کئے اور ان کے جوابات کو ذہن نشین کر لیا۔ اس طرح خوشیا...... یا وہ جو کوئی بھی تھا، اس کا سراپا میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔

رخصت سے پہلے میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا۔''کیا شہباز واپس آپ کے پاس آئے گا؟''

''اس نے کہا تو یہی تھا کہ میری فیملی کو گھر پہنچانے کے بعد وہ سیدھا ہسپتال پہنچے گا۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔''یہاں والوں نے تو مجھے چھٹی دے دی ہے۔شہباز آ جائے تو میں جانے کا پروگرام بناتا ہوں۔''

''اگر آپ کہیں تو میں آپ کو گھر پہنچانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔'' میں نے پیشکش کرنے والے انداز میں کہا۔''میرے پاس سالم تانگہ ہے۔ ہم آپ کو گھر چھوڑنے کے بعد تھانے چلے جائیں گے۔''

وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔''آپ نے پہلے ہی میری خاطر کافی تکلیف کی ہے۔''

"یہ تو میرا فرض تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ پولیس کے ساتھ نہیں جانا چاہتے ہیں تو دوسری بات ہے ورنہ میری پیشکش تو موجود ہے۔"

تھوڑی سوچ بچار کے بعد وہ ہمارے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

ہم محلہ بخشے والا میں جب اس کے گھر پہنچے تو اس وقت شہباز بھی اس کے بیوی بچوں کو لے کر آ گیا۔ میں نے شہباز اور کانسٹیبل کی مدد سے ڈاکٹر بشارت کو گھر کے اندر پہنچایا اور تھانے آنے کے لئے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔ شہباز بھی میرے ساتھ تانگے تک آیا۔ وہ مجھ سے کافی باتیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ "شہباز! کیا تم خوشیا کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"نہیں جناب، کچھ خاص نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر اور اس کے ڈسپنسر کو جو معلوم ہے اس سے زیادہ نہیں۔"

شہباز ایک دراز قامت اور دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اعضا سے چستی جھلکتی تھی۔ اس نے داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم بھی یہاں کہیں قریب ہی رہتے ہو؟"

"نہیں جناب، میں تھانے والے بازار میں رہتا ہوں۔"

یہ تو مجھے معلوم ہو چکا تھا، وہ خوشیا اور ڈاکٹر کو پیش آنے والے واقعے کے محرکات سے واقف نہیں لہٰذا آدھی رات کو اس سے سوال و جواب کر کے وقت برباد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے میں نے اس سے کہہ دیا۔

"تم کل صبح تھانے آ جاؤ۔ پھر ہم وہیں پر ساری باتیں کر لیں گے۔"

وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔ میں تانگے پر سوار ہو کر تھانے کی طرف چل پڑا۔

میں تھانے میں داخل ہوا تو شبینہ ڈیوٹی والا اے ایس آئی میرا منتظر تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

"ملک صاحب! لگتا ہے، آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔"

اے ایس آئی مزمل کو میں نے دو ماہ پہلے بری طرح لتاڑ دیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مجرم سے بیس روپے رشوت لے کر اسے چھوڑ دیا تھا۔ میں نے جب اس سلسلے میں اس سے پوچھ گچھ کی تو پہلے تو وہ خود کو بچانے کے لئے آئیں بائیں شائیں کرتا رہا لیکن جب میں نے اسے وارننگ دی کہ اگر اس نے اپنی غلطی کا اعتراف نہ کیا تو میں اس کی

شکایت اوپر تک پہنچاؤں گا تو اس نے رشوت والی بات قبول کر لی۔ بہرحال، اس کی درخواست پر میں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ وہ اس وقت اسی واقعے کا حوالہ دے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "میں نے جب تمہیں معاف کر دیا تو پھر ناراضگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے!"

"جناب! میں محسوس کرتا ہوں کہ اس واقعے کے بعد سے آپ نے مجھ کوئی ذمہ داری نہیں سونپی۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ "اس سے آپ کی خفگی کا پتہ چلتا ہے۔"

"تم خواہ مخواہ منفی انداز میں سوچ رہے ہو۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک اتفاق ہے کہ کسی اہم محاذ پر تم سے کام لینے کا موقع نہیں آیا۔"

یہ سچ ہے کہ میں اس واقعے کو فراموش کر بیٹھا تھا اور اے ایس آئی کے حوالے سے بالکل نارمل انداز میں تھانے داری کر رہا تھا۔ اس نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے شکوہ جاری رکھا۔

"ملک صاحب! آج کل میری رات کی ڈیوٹی ہے۔ ڈاکٹر بشارت والے واقعے میں آپ مجھے بھی تو ہسپتال بھیج سکتے تھے۔" وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر بات پوری کرتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے، آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے۔"

"اگر تم ایسا سوچتے ہو تو یہ تمہارے دماغ کی ٹیڑھ ہے۔" میں نے ڈانٹ سے مشابہہ لہجے میں کہا۔ "اور جہاں تک ڈاکٹر بشارت والے واقعے کا تعلق ہے تو تم اس سے الگ نہیں ہو۔ میں اپنا کام کر کے آ گیا ہوں۔ اب تمہاری باری ہے۔ مویشی منڈی جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"مویشی منڈی؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں مویشی منڈی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ایک خطرناک آدمی کا سراغ لگانا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ "خطرناک آدمی......؟" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"انتہائی خطرناک...... اور جنونی!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "میں اس شخص کا ذکر کر رہا ہوں جس کی بائیں ٹانگ کی پنڈلی میں چھ ٹانکے لگے ہوئے ہیں اور جس نے ڈاکٹر بشارت کو شدید زخمی کر کے سول ہسپتال پہنچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ خوشیا اس کا نام ہے۔ وہ قربانی کے لئے مال مویشی فروخت کرنے ادھر مویشی منڈی میں آیا ہوا ہے۔"

اے ایس آئی مزمل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بولا۔ ''اچھا آپ اس بندے کی بات کر رہے ہیں۔''

''تمہیں ڈاکٹر بشارت والے معاملے کو ہینڈل کرنے کا شوق تھا ناں؟'' میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''جی ہاں ...... جی ہاں۔''

میں نے اسے خوشیا کے بارے میں تمام تر تفصیل سے آگاہ کیا اور کہا۔ ''تم ابھی روانہ ہو جاؤ۔ شبینہ ڈیوٹی سمجھ کر یہ کام بھی نمٹا ہی دو۔''

''ٹھیک ہے جناب، میں جاتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یہ بات تو سمجھ گئے ہو ناں، تمہیں کیا کرنا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ملک صاحب!'' وہ پُر اعتماد انداز میں بولا۔ ''آپ نے خوشیا کا حلیہ اچھی طرح مجھے ذہن نشین کرا دیا ہے۔ میں اس کو تلاش کر کے اپنے ساتھ تھانے لے آؤں گا۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اس طرح تمہاری کارکردگی کا امتحان بھی ہو جائے گا اور ہاں......'' میں لمحہ بھر کے لئے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں سے اٹھنے کے بعد اپنے کوارٹر پر چلا جاؤں گا۔ تم سے صبح ہی ملاقات ہو گی۔ اگر تم خوشیا کو پکڑ کر تھانے لانے میں کامیاب ہو جاؤ تو اسے حفاظت سے حوالات میں رکھنا۔ کسی قسم کے ٹریٹمنٹ کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے اس کا انٹرویو کروں گا، اس کے بعد ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔ ''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔''

اے ایس آئی کے رخصت ہونے کے بعد میں اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

اس رات نارمل نیند تو خراب ہو چکی تھی لہٰذا کافی دیر بعد آنکھ لگی اور اس دوران میں بستر پر لیٹا ڈاکٹر بشارت اور خوشیا کے بارے میں سوچتا رہا۔ ڈاکٹر بشارت کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اسے ایک افسوس ناک حادثے کا نام دیا جا سکتا تھا لیکن خوشیا کے رویے میں جتنے گھماؤ، پھراؤ اور الجھنیں تھیں انہیں سمجھنا آسان نظر نہیں آتا تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی اور مجھے اسی گڑبڑ تک پہنچنا تھا اور خوشیا ہاتھ لگ جاتا تو یہ رسائی بہت آسان ہو جاتی۔ اب دیکھنا

یہ تھا کہ اے ایس آئی کون سا تیر مار کر آتا ہے؟ وہ گیا تو بڑے جوش و خروش سے تھا۔

❀❀❀

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی!

میں رات کو خاصی دیر سے سویا تھا اس لئے نسبتاً تاخیر سے آنکھ کھلی۔ میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو وہاں تازہ ترین مسائل میرے منتظر تھے۔ میں نے اے ایس آئی مزمل کو اپنے کمرے میں بلا لیا تاکہ گزشتہ رات کی رپورٹ لے سکوں۔ تھوڑی دیر بعد جب مزمل میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا۔

''کیا تم خوشیا کو پکڑ لائے ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور جواب دیا۔ ''نہیں ملک صاحب! وہ تو ہاتھ نہیں آیا لیکن خالی ہاتھ واپس لوٹنا مجھے گوارا نہیں تھا اس لئے جھورے کو پکڑ لایا ہوں۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔ ''یہ جھورا کون ہے؟''

''بکروالوں کا سردار۔'' اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ''وہ حوالات میں بند ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔'' بھیڑ، بکریاں اور دیگر مویشی چرانے اور ان کی خرید و فروخت کرنے والوں کو گاؤں دیہات میں عموماً ''بکروال'' کہا جاتا ہے۔ اے ایس آئی کا اشارہ مویشی منڈی مین موجود جانوروں کے مالکان کے سردار کی طرف تھا۔ میں فوراً اس کی بات کی تہہ میں پہنچ گیا اور پوچھا۔

''مزمل! میں نے تمہیں خوشیا کی گرفتاری کے لئے ادھر بھیجا تھا۔ تم بکروالوں کے سردار جھورے کو کیوں پکڑ لائے ہو؟''

''جناب! میں نے پورے دو گھنٹے مویشی منڈی میں گزارے ہیں۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے دیکھا ہو گا، بڑے میدان میں ان لوگوں نے مویشیوں کے ساتھ ہی ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ایک طرف قطار سے ان کی جھونپڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ وہ درجن بھر افراد ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ جھورا ان سب کا لیڈر ہے۔ میں نے ایک ایک شخص سے خوشیا کے بارے میں پوچھا لیکن کوئی بھی اس نام کے بکروال سے واقف نہیں۔ صرف ایک بکروال نے اس حلیے کے شخص کو مویشی منڈی میں دیکھا تھا۔ خوشیا کو دیکھنے والے اس بکروال کا نام صفدر ہے۔ میں نے اس کا تفصیلی انٹرویو کیا ہے۔ وہ متضاد باتیں کرتا ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے، صفدر نے اچھی طرح خوشیا کو دیکھا ہو گا اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے اسے محض شک ہے کہ خوشیا کے حلیے کا کوئی شخص اس نے مویشی منڈی میں دیکھا

ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ دانستہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے......''

''اور تم کسی صفدر کی بجائے بکروالوں کے سردار جھورے کو اپنے ساتھ لے آئے۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔''نہ صرف ساتھ لائے ہو بلکہ اسے حوالات میں بھی بند کر دیا ہے؟''

وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔''ملک صاحب! آپ میری پوری بات تو سن لیں جناب!''

''ہاں، ہاں۔ بتاؤ۔ میں سن رہا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔''میں تو صفدر ہی کو اپنے ساتھ تھانے لانے والا تھا لیکن یہ جھورا بیچ میں آ گیا۔ دراصل صفدر جھورے کا بیٹا ہے۔ جھورے نے کہا...... تم مجھے اپنے تھانیدار کے پاس لے چلو۔ وہ جو بھی پوچھیں گے، میں بتا دوں گا۔ تم نے جس خوشیا کا ذکر کیا ہے اسے میں بھی اس حد تک جانتا ہوں جتنا کہ صفدر۔ صفدر ہی نے مجھے اس شخص کے بارے میں بتایا ہے۔ میرے بچے کو خواہ مخواہ خوار نہ کرو۔ اگر تھانے دار صاحب ضرورت محسوس کریں گے تو صفدر صبح بھی تھانے آ سکتا ہے۔'' وہ سانس لینے کے لئے رکا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''لہٰذا میں صفدر کے باپ جھورے کو پکڑ لایا ہوں۔ آپ اس سے جو بھی پوچھنا چاہیں، پوچھ لیں۔ اسے حوالات میں ضرور رکھا گیا ہے لیکن آپ کی ہدایت کے مطابق اس کو ابھی تک کوئی ٹریٹمنٹ نہیں دیا گیا۔''

وہ خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا۔''جھورے کے بیٹے صفدر کی عمر کیا ہو گی؟''

''مجھے تو وہ پچیس کے قریب لگا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔''پچیس سال کے جوان کو وہ بچہ کہہ رہا ہے۔'' میرا اشارہ جھورے کی طرف تھا۔''خیر، میں جھورے کو بعد میں اپنے پاس بلاتا ہوں، پہلے ان کی سن لوں جو باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔''

جب میں تھانے آیا تو میں نے برآمدے میں ایک مرد اور ایک عورت کو پریشان حال بیٹھے دیکھا تھا۔ ان کے چہرے ہی فریادیوں جیسے تھے۔ پتہ نہیں، بے چارے کس مصیبت میں گرفتار ہو کر تھانے پہنچے تھے۔ اے ایس آئی میرا اشارہ سمجھ گیا اور کمرے سے رخصت ہوتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں ان دونوں کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ میرے سامنے حاضر تھے۔ میں نے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''بیٹھ جاؤ۔''

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ بیٹھ گئے اور باری باری اضطراری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں، تم بتاؤ......! میں نے ان کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتائیں۔ آپ لوگوں کا کیا مسئلہ ہے؟''

''میرا نام ارشاد احمد ہے۔'' مرد نے کمزور سی آواز میں اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''اور یہ میری بیوی نصرت بی بی ہے۔ ہم سخت پریشان ہیں تھانے دار صاحب!''

بات ختم کرتے کرتے وہ اچھا خاصا روہانسا ہو گیا۔ ارشاد احمد کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ شیو بناتا تھا۔ تاہم سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ چھریرے بدن کا مالک ایک خوش شکل بڈھا تھا۔ اس کی بیوی نصرت بی بی قدرے بھاری جثے کی مالک ایک سانولی عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس کے قریب لگایا۔ میں چند لمحات تک گہری نظر سے ان دونوں کا جائزہ لیتا رہا پھر بڑی رسان سے کہا۔

''پریشانی تو تمہارے بشروں پر لکھی ہوئی ہے۔ میں نے اس پریشانی کا سبب پوچھا ہے۔''

نصرت گلوگیر آواز میں بولی۔''ہم شاہدہ کی وجہ سے پریشان ہیں۔''

''یہ شاہدہ کون ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ہماری اکلوتی بیٹی ہے تھانے دار صاحب!'' ارشاد نے جواب دیا۔

''شاہدہ کو ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم دونوں کی یہ حالت ہو رہی ہے؟'' میں نے کریدا۔

''وہ کل رات سے غائب ہے۔'' نصرت نے بھیگے ہوئے لہجے میں بتایا۔

میں چونک اٹھا۔''غائب ہے...... کیا مطلب؟''

میرے اس سوال کے جواب میں ان دونوں نے باری باری مجھے جو قصہ سنایا، میں مختصر اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ان کے مطابق ان کی اکلوتی بیٹی شاہدہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ کل شام سے پہلے مویشی منڈی کی طرف گئی تھی۔ شام تک سہیلیاں تو واپس اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئیں لیکن شاہدہ ابھی تک غائب تھی۔ بوڑھے والدین کے بس میں جو کچھ تھا اسے بروئے کار لاتے ہوئے وہ رات گئے تک شاہدہ کو تلاش کرتے رہے مگر اس سلسلے میں انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ انتہائی آزردہ اور دل گرفتہ ہو گئے۔ باقی رات انہوں نے بیٹی کے انتظار میں جاگ کر گزار دی۔ صبح کسی سمجھدار نے انہیں تھانے میں شاہدہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے

کا مشورہ دیا اور...... اب وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے ان کی بپتا پوری توجہ سے سنی اور پوچھا۔ ''آپ لوگوں نے شاہدہ کی ان سہیلیوں سے پوچھ گچھ کی ہے جن کے ہمراہ وہ مویشی منڈی کی طرف گئی تھی؟''

''سب سے باری باری پوچھ چکے ہیں۔'' ارشاد نے جواب دیا۔ ''لیکن شاہدہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ تینوں خیریت سے اپنے گھروں کو پہنچ گئی ہیں۔'' پھر اس نے مذکورہ تینوں سہیلیوں کے نام بتا دیئے۔

میں نے کہا۔ ''شاہدہ کی سہیلیاں شمیم، خالدہ اور تنویر اس کی واپسی کے بارے میں کیا بتاتی ہیں؟''

''ان کا کہنا ہے، شاہدہ اپنی گلی میں داخل ہو گئی تھی۔ اگر وہ گھر نہیں پہنچی تو یہ حیرت کی بات ہے۔'' نصرت نے بتایا۔ ''وہ تینوں بھی شاہدہ کی گمشدگی پر بہت پریشان ہیں۔''

''کیا ان میں سے کوئی بھی تمہاری گلی میں نہیں رہتی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ ہمارے ہی محلے کی رہنے والی ہیں لیکن دوسری گلیوں میں ان کے گھر ہیں۔'' پھر وہ شمیم، تنویر اور خالدہ کے گھروں کا محل وقوع بتانے لگی۔

میں نے اہم نکات کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا۔ تنویر، مشتاق کی، خالدہ، نواز کی اور شمیم، یعقوب کی بیٹی تھی اور یہ تمام افراد محلہ نور پورہ میں رہتے تھے۔ شاہدہ کی ان تینوں سہیلیوں میں صرف خالدہ شادی شدہ تھی اور ان دنوں اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کی شادی کو دو سال ہوئے تھے تاہم ابھی تک اس کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ خالدہ اور شاہدہ کا گھر پچھواڑے سے آپس میں ملا ہوا تھا۔ چھتوں کے اس ملاپ نے بالائے چھت ان دونوں سہیلیوں کی ایک دوسرے کے گھر میں آمد و شد کو خاصا آسان بنا دیا تھا۔ خالدہ کے شوہر کا نام رجب علی تھا۔ اس کا گھر موسیٰ کالونی میں واقع تھا۔ رجب علی کی ریل بازار میں کپڑے کی دکان تھی۔

میں نے ارشاد احمد سے پوچھا۔ ''تمہاری بیٹی شاہدہ کی عمر کیا ہو گی؟''

''وہ بائیس سال کی ہو چکی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا وہ شادی شدہ ہے؟''

''نہیں۔''

''کہیں بات وغیرہ چل رہی ہے؟''

''ابھی تک ایسا کوئی سلسلہ باقاعدہ شروع نہیں ہوا۔'' ارشاد احمد کی بجائے اس کی بیوی نصرت نے جواب دیا۔ ''حالانکہ تین چار گھروں سے شاہدہ کے رشتے آئے ہیں لیکن ارشاد نے صاف انکار کر دیا ہے۔ کہتا ہے، شادی کی اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو شاہدہ بچی ہے۔''

ارشاد بولا۔ ''ہاں، مجھے تو وہ بچی ہی دکھائی دیتی ہے لیکن......'' اس کی آواز بھرّا گئی ''پتہ نہیں، میری شاہدہ کہاں چلی گئی......؟'' بات ختم کرتے ہی وہ ہاتھوں کی پشت سے نم ہو جانے والے آنکھوں کے گوشوں کو صاف کرنے لگا۔

جو والدین اکلوتی اولاد رکھتے ہیں وہ اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوتے ہیں، خصوصاً بیٹی والے۔ وہ بیٹی کی شادی میں دانستہ تاخیری حربے اختیار کرتے رہتے ہیں۔ وہ تنہائی کے ڈر سے دہل جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں، اگر بیٹی بیاہ کر دوسرے گھر چلی گئی تو ان کا کیا ہو گا؟ بعض ایسے والدین کچھ اس قسم کی سیاست لڑاتے ہیں کہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کوئی ایسا لڑکا تلاش کر لیتے ہیں جسے گھر دامادی میں کوئی مشکل پیش آنے کا امکان نہ ہو۔ ایسے با اختیار اکیلے لڑکے کو وہ اپنی فرزندی میں لے کر اپنے ہی گھر میں بسا لیتے ہیں۔ اس طرح بیٹی، ان کا گوشۂ جگر ہمیشہ نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ غلط ہے یا صحیح، اگر باہمی رضامندی سے ایسا کر لیا جائے تو خوشگوار نتائج لا سکتا ہے۔

ارشاد قدرے سنبھلا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا شاہدہ پہلے بھی کبھی اس طرح غائب ہوئی ہے؟ گمشدہ شخص کے بارے میں ہر قسم کا سوال کرنا پڑتا ہے۔''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''ایسا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا جناب۔''

''تم لوگوں کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں ہے؟''

''بالکل نہیں جناب۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''تمہارے رشتے دار اور کہاں کہاں رہتے ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کھیالی، تھیڑی سانسی، قلعہ دیدار سنگھ، وزیر آباد اور پنڈی بھٹیاں میں ہمارے رشتے دار بستے ہیں۔''

ان تمام جگہوں میں تھیڑی سانسی اور کھیالی، نور پورہ کے قریب تھے۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''شاہدہ کہیں کسی رشتے دار کے گھر تو نہیں چلی گئی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''ایسے چپ چپاتے وہ بھلا کہاں جا سکتی ہے؟''

میں نے شاہدہ کی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''نصرت بی بی! اب میں تم سے ایک

نازک سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ تم لوگوں کا انتہائی ذاتی پہلو ہے لیکن اطمینان رکھو، یہ بات ہم تینوں کے درمیان ہی رہے گی۔ میں یہ سوال پوچھنے پر مجبور ہوں۔ آپ دونوں اسے میرے فرائض کا تقاضا سمجھ لیں۔''

''آپ پوچھیں جی، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' نصرت بی بی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا شاہدہ کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی؟''

''نہیں تھانے دار صاحب! ایسی کوئی بات میرے علم میں تو نہیں۔''

''اور کوئی لڑکا اسے چاہتا ہو؟'' میں نے کرید جاری رکھی۔

ارشاد احمد نے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! ہماری بیٹی کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاہدہ کی گمشدگی کے سلسلے میں جتنے ممکنہ ضروری سوالات تھے، وہ میں نے ان دونوں سے پوچھ لئے لیکن اس کے جواب میں کوئی سرا میرے ہاتھ نہ آسکا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کی بیٹی شاہدہ کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ! وہ بہت جلد آپ کی نظروں کے سامنے ہوگی۔ اس سلسلے میں آپ کو بھی مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔''

''آپ حکم کریں تھانے دار صاحب!'' ارشاد نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔''

میں نے چند لمحات کے لئے کہا۔ ''پہلے نمبر پر تو آپ اپنے تمام عزیزوں، رشتے داروں سے رابطہ کریں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ شاہدہ ان میں سے کسی کے گھر تو نہیں چلی گئی۔ اس کے بعد......''

''اس کی امید تو نہیں سرکار!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''آپ کا حکم ہے تو میں یہ کام ضرور کروں گا۔''

''اسے حکم ہی سمجھ لو۔'' میں نے اس کی سوچ کے مطابق کہا۔ ''اس کے بعد دوسرا کام تمہیں یہ کام کرنا ہے شاہدہ اپنی جن تین سہیلیوں کے ہمراہ کل سہ پہر مویشی منڈی کی طرف گئی تھی ان کے بیانات کا بندوبست ہونا چاہئے۔ ممکن ہے، ان سے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو شاہدہ کی تلاش میں معاون ثابت ہو سکے۔ جیسے بھی ہو، تم ان تینوں کو تھانے تک لاؤ گے۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کام میں کرلوں گا۔ لیکن وہ اکیلی تو تھانے

نہیں آئیں گی۔ ان کے ورثاء بھی ساتھ آنا چاہیں گے۔''

''آنے دو۔ جو بھی ساتھ آنا چاہے اسے روکو مت۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''تم ان سے اور ان کے لواحقین سے بات کر کے دیکھو۔ اگر وہ لوگ شرافت سے تعاون پر تیار ہو جائیں تو اچھی بات ہے اور بالفرضِ محال وہ کوئی پس و پیش کریں تو مجھے آکر بتانا۔ میں اس کام کی تکمیل کے لئے تمہارے ساتھ اپنے عملے کے کچھ افراد بھیج دوں گا۔ تمہیں کسی بھی حوالے سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور جانے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی تقلید میں نصرت بی بی نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ میں نے انہیں جانے کی اجازت دینے سے پہلے ارشاد احمد سے پوچھ لیا۔

''ارشاد! تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟''

اس نے ایک سینما کا نام لیا اور بتایا۔ ''جناب! میں اس سینما میں بکنگ کلرک ہوں۔''

بکنگ کلرک سے اس کی مراد وہ شخص تھا جو سلاخ دار کھڑکی کے عقب میں ایک اونچی کرسی یا اسٹول پر بیٹھ کر شائقین فلم کو ٹکٹ دیتا ہے۔ ارشاد نے جس سینما کا نام لیا وہ ایک خاص اعتبار سے بڑی خراب شہرت رکھتا تھا مگر شائقین فلم کا ایک مخصوص طبقہ بلیک مارکیٹ میں ٹکٹ خرید کر بھی اپنے ذوق کی تسکین کا سامان کر لیتا تھا۔ مذکورہ سینما سبزی منڈی کے عین سامنے سڑک کی دوسری جانب واقع تھا۔ اس سینما کے پہلو میں وہ وسیع و عریض گراؤنڈ تھا جہاں مویشی منڈی لگی ہوئی تھی۔ محلہ نور پورہ سینما کے عقب میں واقع تھا۔

وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے دروازے پر پہنچے لیکن باہر نکلنے کی بجائے وہ رک گئے۔ میں نے محسوس کیا ان کے درمیان سرگوشیوں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی خاص بات پر خفیہ تبادلۂ خیالات کر رہے ہوں۔

''کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟'' میں نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے پوچھ لیا۔

ارشاد نے مڑ کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! ایک چھوٹی سی بات ہے۔ پتہ نہیں، شاہدہ کی گمشدگی سے اس کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ نصرت میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ میں وہ بات آپ کو ضرور بتاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''ارشاد! تمہاری بیوی مجھے خاصی سمجھ دار لگتی ہے۔''

میرے اس توصیفی جملے نے نصرت پر خاطر خواہ اثر کیا۔ وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار جی! ارشاد جس بات کو معمولی اور چھوٹی سمجھ رہا ہے، میرے

نزدیک وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے بی بی!" میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بسم اللہ کرو۔ وہ اہم بات بھی مجھے تم ہی بتا دو۔"

نصرت کے بولنے سے پہلے ارشاد احمد گویا ہوا۔ "جنابِ عالی! میرے پاس کمیٹی (بیسی) ڈلتی رہتی ہے۔ اور ہر وقت گھر میں ایک خاص رقم موجود رہتی ہے۔ وہ رقم بھی اپنی جگہ سے غائب ہے۔"

رقم کا ذکر سنتے ہی میں چونک اٹھا، فوراً پوچھا۔ "تمہارے گھر میں کتنی رقم رکھی ہوئی تھی؟"

"میرا خیال ہے، وہ کم از کم ایک ہزار روپے اور زیادہ سے زیادہ بارہ سو ہوں گے۔" ارشاد نے بتایا۔

نصرت نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! یہ کوئی معمولی رقم تو نہیں۔"

وہ بالکل درست کہہ رہی تھی۔ اس زمانے کے اعتبار سے وہ رقم بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ آج کل کے ایک لاکھ روپے تقریباً سمجھ لیں یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ شاہدہ کی گمشدگی کے ساتھ ہی وہ رقم غائب ہوئی تھی۔ لہٰذا سوچا جا سکتا تھا، وہ رقم اپنی مرضی سے شاہدہ لے گئی ہو گی۔ اسی پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ارشاد احمد سے استفسار کیا۔

"تم کمیٹی کی مد میں جمع ہونے والی رقم کو گھر میں کہاں رکھتے تھے؟"

"کپڑوں والے بڑے صندوق کی پاکٹ میں۔" اس نے بتایا۔

"یہ بات تمہارے علاوہ اور کس کس کو معلوم تھی؟"

"ہم تینوں ہی اس بات سے واقف تھے۔"

"یعنی تم، نصرت اور شاہدہ؟"

"جی ہاں جناب!"

"کیا اس سے پہلے بھی کبھی کمیٹی والی رقم یوں غائب ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

ارشاد نے جواب دیا۔ "نہیں، جناب یہ پہلا واقعہ ہے۔"

"تم نے ...... یا نصرت نے تو وہ رقم نہیں لی ناں؟"

"نہیں جناب!" وہ بہ یک زبان بولے۔

"اس کا مطلب ہے شاہدہ ہی وہ رقم اپنے ساتھ لے گئی ہے؟" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"پتہ نہیں، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں تھانے دار صاحب!" وہ بے حد الجھا ہوا تھا۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "بہت جلد سب پتہ چل جائے گا۔"

وہ بہ یک وقت سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے تسلی تشفی دے کر انہیں تھانے سے روانہ کر دیا۔

❋❋❋

جھورے کا اصل نام منظور احمد تھا لیکن "جھورا" بچپن سے اب تک اتنے تواتر کے ساتھ بولا جاتا رہا تھا کہ اب منظور احمد سے کوئی واقف نہیں رہا تھا۔ جھورا کنگ سائز جثے کا مالک ایک ہیوی ڈیوٹی بکروال تھا اور اسے بکروالوں کے اس گروہ کا سردار ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب رہی ہو گی۔ جھورے نے "آٹھ بیس" اسٹائل کی خاصی صحت مند مونچھیں پال رکھی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جھورے کے فقید المثال جثے اور اس کی مونچھوں کے درمیان صحت و تندرستی کا ٹائٹل مقابلہ ہو رہا ہے۔ دونوں ہی اپنی اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے کوشاں نظر آتے تھے!

میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر جھورے کو حوالات سے اپنے کمرے میں بلا لیا اور ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ "اے ایس آئی مزمل بھی اس کے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔ میری نگاہ جھورے پر جمی ہوئی تھی۔

وہ بینچ کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔ "جناب! میرا خیال ہے آپ کی یہ کمزور اور ناتواں سرکاری کرسی میرا بوجھ اٹھاتے ہوئے چیں بول جائے گی لہٰذا بیٹھنے کے لئے بینچ ہی مناسب ہے۔"

جھورے کی بات میں بھی اتنا ہی وزن تھا جتنی بات اس کے وزن میں تھی۔ میں نے بینچ پر بیٹھنے والے فیصلے کے لئے اسے آزاد چھوڑ دیا۔ اگر میں نے اس کو چلتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہوتا تو یقین نہ آتا کہ تین من سے زیادہ کی وہ لاش اتنی مستعدی سے چلتی کیسے ہو گی۔ اس کے وزن، جسامت اور مستعدی میں حیرت انگیز توازن پایا جاتا تھا۔ جب وہ مذکورہ بینچ پر براجمان ہو چکا تو میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جھورے! تم نے میرے تھانے کی حوالات میں جو آدھی رات گزاری ہے اس میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ناں؟"

"آپ ...... اور آپ کا تھانہ دونوں بڑے نرالے اور عجیب ہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ "لگتا ہے، یہاں کا باوا آدم ہی کوئی دوسرا ہے۔"

اس کے انداز نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ گزشتہ رات حوالات میں اس کے ساتھ عملے نے کوئی زیادتی نہ کر دی ہو۔ اس حوالے سے میں نے جب اسے ٹٹولا تو پتہ چلا، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ محض اس وجہ سے مجھ سے اور میرے تھانے سے شاکی تھا کہ تعاون کے باوجود ہم نے اسے حوالات میں ڈال رکھا تھا۔ میں نے اس کا موقف سمجھنے کے بعد بڑے بھرپور انداز میں تسلی دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جھورے! تم خود کو کوئی الزامی حوالاتی نہ سمجھو۔ تم ایک طرح سے سرکاری مہمان ہو۔''

اس نے برا سا منہ بنایا اور بیزاری سے بولا۔ ''ایک ہی بات ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم خوشیا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''اگر سچی بات بتاؤں تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔''

''تم سچ کہو، یقین کرنا یا نہ کرنا میرا کام ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''خوشیا میرے ایک دوست کا نام ہے جو ادھر نہر کی دوسری طرف موضع تھیڑی سانسی میں رہتا ہے۔ وہ پانی والے مٹکے، گھڑے اور مٹی کی ہانڈیاں بناتا ہے۔''

اس کے جواب نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ میں نے کہا۔ ''میں اس خوشیا کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو کل تمہاری مویشی منڈی میں دیکھا گیا تھا۔ تم نے اور تمہارے بیٹے صفدر نے اسے دیکھا تھا بلکہ صفدر ہی نے اس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔ میرے اے ایس آئی نے تمہیں اس کے حلیے سے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''آپ لوگ جس بندے کو تلاش کر رہے ہیں وہ مجھے بھی مطلوب ہے۔ آپ کے اے ایس آئی صاحب نے بتایا ہے کہ اس بندے نے کسی ڈاکٹر کو شدید زخمی کر دیا ہے اور فرار ہو گیا ہے۔ اسی سلسلے میں آپ لوگوں کو اس کی تلاش ہے۔ حلیے کے اعتبار سے میں بھی اسی بندے کا ذکر کر رہا ہوں جس کو آپ ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ اس نے مجھے اپنا نام اکرام اللہ بتایا تھا۔''

اس نے ایک مختصر سے سوال کا گھما پھرا کر طویل جواب دیا تو میں نے پوچھا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس نے تمہیں اپنا نام اکرام اللہ بتایا اور ہمیں خوشیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم اس وقت ایک ہی بندے کا ذکر کر رہے ہیں ...... وہ خطرناک بندہ جو نام بدلنے کے معاملے میں جتنا تیز ہے، اس سے کہیں زیادہ تیز وہ تیور بدلنے میں ہے۔ تمہیں اس لئے

تھانے لایا گیا ہے کہ خوشیا نامی اس شخص نے تم سے تعلق ظاہر کیا تھا۔

تمہارا حوالہ دیئے بغیر اس نے ڈاکٹر بشارت کو بتایا تھا کہ وہ مویشی منڈی میں قربانی کے جانور فروخت کرنے آیا ہوا ہے اور ...... تم اس گروہ کے سردار ہو جو آج کل ادھر مویشی منڈی میں سرگرم ہے۔'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ڈاکٹر بشارت کو پیش آنے والے واقعے سے تو تم واقف ہو ہی گئے ہو گے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''یہ واقعہ سن کر مجھے سخت افسوس ہوا ہے۔''

میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''تم خوشیا یا اکرام اللہ کو کیوں تلاش کرتے پھر رہے ہو؟''

''وہ مجھے اچھا خاصا نقصان پہنچا کر غائب ہو گیا ہے۔'' جھورے نے تلخ لہجے میں بتایا۔

اس کی بات سن کر میں چونک اٹھا، فوراً پوچھا۔ ''اس نے تمہیں کس سلسلے میں کیا نقصان پہنچایا ہے؟ یہ تو تم ایک بالکل نئی بات بتا رہے ہو۔''

''ڈاکٹر بشارت تو صرف زخمی ہوا ہے، دو چار دن میں بھلا چنگا ہو جائے گا۔'' وہ تلخی بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن وہ نامراد مجھے جو ہاتھ دکھا گیا ہے اس کے بارے میں جان کر آپ بھی دنگ رہ جائیں گے۔''

پھر میرے استفسار پر جھورے نے خوشیا کی پول پٹیاں کھول دیں۔ اس نے بتایا کہ خوشیا کل دن میں اس کے پاس آیا تھا۔ مسکین سی صورت بنا کر اپنا نام اکرام اللہ بتاتے ہوئے خود کو بے روزگار ظاہر کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تھیڑی سانسی میں رہنے والے جھورے کے دوست خوشیا کا حوالہ بھی دیا اور کہا کہ خوشیا نے اسے جھورے کے پاس بھیجا ہے اور یقین دلایا کہ جھورا اس کے رزق روزگار کا کوئی بندوبست کر دے گا۔ جھورے کو اس کی بے کاری اور بے روزگاری کا سن کر ترس آ گیا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ خوشیا (اکرام اللہ) کے لئے کیا کرے۔ چنانچہ اس نے اسے اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے مویشیوں کی فروخت میں لگایا۔ سہ پہر تک وہ بڑی دل جمعی سے کام کرتا رہا اور اس نے اپنی چرب زبانی کا استعمال کر کے کئی چھوٹے بڑے جانور نکال دیئے۔ شروع میں ایک دو جانوروں کی فروخت کے بعد فوراً اس نے رقم جھورے کے حوالے کر دی۔ جھورے نے اسے محنت اور لگن سے کام کرتے دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ اس سے کہا کہ وہ مویشیوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو اپنے پاس ہی رکھے۔ رات کو ایک ساتھ حساب کر لیں گے۔ اس نے جھورے کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کام میں جت گیا۔ جھورا اس کی طرف سے خاصا مطمئن

تھا۔

اس کا اطمینان اچانک اس وقت کافور ہو گیا جب شام کے وقت اسے پتہ چلا کہ خوشیا منڈی میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ صفدر نے خوشیا کو اپنے باپ سے ملوایا تھا، جھورے نے اسی کو خوشیا کی تلاش پر مامور کر دیا لیکن خوشیا منڈی میں کہیں دکھائی دیا اور نہ ہی منڈی سے باہر کہیں۔ جب اس کی تلاش میں ناکامی ہوئی تو وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ یہ تھی خوشیا کی کل کہانی۔

میں نے جھورے سے پوچھا۔ ”خوشیا یعنی اکرام اللہ تمہیں کتنی رقم کی ڈز دے گیا ہے؟“

”ایک محتاط اندازے کے مطابق جانوروں کی فروخت سے حاصل ہونے والے آٹھ سو روپے اس کے پاس تھے۔“ جھورے نے بتایا۔ ”وہ میرا ہاتھ بٹا رہا تھا، ہاتھ دکھا کر چلا گیا!“ آخری جملہ اس نے بڑے کڑوے انداز میں ادا کیا تو میں ایک مرتبہ پھر چونک اٹھا۔

میرے چونکنے کا سبب اس جملے میں رقم کی مالیت تھی۔ جھورے کے مطابق وہ اس کے آٹھ سو روپے مار کر غائب ہوا تھا۔ جب کہ ڈاکٹر بشارت نے کلینک پر اس کے بٹوے میں کم و بیش دو ہزار روپے کے کرنسی نوٹ رکھے دیکھے تھے۔ اس حساب سے میرا دھیان فوراً ارشاد احمد کی کمیٹی (بیسی) کی طرف چلا گیا۔ اس کے گھر میں رکھی ہوئی کمیٹی کی رقم بھی شاہدہ کے ساتھ ہی غائب ہو گئی تھی جو بارہ سو روپے پر مشتمل تھی۔ اگر خوشیا اور شاہدہ کو تھوڑی دیر کے لئے ملا دیا جاتا تو خوشیا کے بٹوے میں نظر آنے والی دو ہزار روپے کی رقم کا جواز سمجھ میں آ جاتا تھا۔ اس تناظر میں میرے ذہن میں یہ خطرناک سوال اٹھا...... کہیں خوشیا ہی نے تو شاہدہ کو غائب نہیں کر دیا؟

اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو پھر یہ دونوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا!

میں نے جھورے کو سر دست شاہدہ کے بارے میں کچھ نہ بتایا اور پوچھا۔ ”کیا تم نے اپنے تھیٹری سانسی والے دوست خوشیا سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی؟ تمہارے بقول اکرام اللہ نے تمہارے اسی دوست کے حوالے سے تمہارے پاس نوکری حاصل کی تھی؟“

”ابھی تک تو خوشیا سے میرا رابطہ نہیں ہو سکا۔“ جھورے نے مایوسی سے بتایا۔ ”سوچا تھا، صبح کسی بندے کو تھیٹری سانسی کی طرف دوڑاؤں گا لیکن مجھے کیا پتہ تھا، آج کی صبح آپ کے تھانے کی حوالات میں نمودار ہو گی!“ بات ختم کرتے ہی اس نے شکایتی نظر سے اے ایس آئی مزمل کی طرف دیکھا۔

جھورے کو حوالات میں بند کرنے کا سہرا اس کے سر بندھتا تھا۔

میں نے مزید چند سوالات کر کے جھورے کے بارے میں اطمینان کر لیا کہ وہ شاہدہ کے غیاب یا ڈاکٹر بشارت کو پیش آنے والے واقعے میں کسی بھی حوالے سے ملوث نہیں تھا۔ وہ بے چارہ تو خوشیا (اکرام اللہ) کے ہاتھوں خود چوٹ کھائے بیٹھا تھا۔ میں نے اب تک کی بات چیت میں جھورا کو ایک معقول اور قابل اعتماد کاروباری شخص پایا۔ لہٰذا اس سے ذرا کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اچھے اور مفید تعاون کی امید رکھی جا سکتی تھی۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں جھورے کو شاہدہ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا اور آخر میں کہا۔ ”حالات و واقعات تو اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ شاہدہ کے اغواء میں کسی نہ کسی حوالے سے اکرام اللہ کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے، شاہدہ خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہو۔“ اس نے ایک نکتے کی بات کی۔

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور کہا۔ ”ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اب سب سے اہم بات شاہدہ کی بازیابی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے یا کسی نے زبردستی اسے اغواء کیا ہے، دونوں صورتوں میں اکرام اللہ سے اس کے بارے میں کوئی اہم بات معلوم ہو سکتی ہے۔ تم اس کی گرفتاری کے لئے مجھ سے کیا تعاون کر سکتے ہو؟“

”جناب! میں تو آپ کی قید میں بیٹھا ہوں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ایک مجبور اور بے بس قیدی آپ کی کیا مدد کر سکتا ہے۔“

میں نے اس کے لہجے کی کاٹ کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ”تم خود کو اسی لمحے سے آزاد سمجھو۔ میں تمہیں اے ایس آئی کے ساتھ تھیٹری سانسی بھیج رہا ہوں۔ تم اپنے دوست خوشیا کے تعاون سے اس کم بخت اکرام اللہ کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔“ پھر میں نے مزمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ نامراد جہاں بھی ہو اور جس بھی حالت میں نظر آئے اسے فوراً گرفتار کر کے تھانے لے آؤ۔ اس کے ساتھ ہی اگر شاہدہ بھی ہاتھ لگ جائے تو یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات ہو گی۔“ پھر میں نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔

”پتہ نہیں، اس کا نام خوشیا ہے یا اکرام اللہ اور یا پھر کچھ اور......؟“

جھورے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جناب! میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں لیکن کہیں بھی روانہ کرنے سے پہلے آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے مویشی منڈی جانے کی مہلت ضرور دے دیں۔ میں اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دینا چاہتا ہوں۔“

''ہاں ہاں، تمہیں اس کا موقع دیا جائے گا۔'' میں نے جلدی سے کہا پھر اے ایس آئی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''مزمل! تم دس پندرہ منٹ میں تھیڑی سانسی جانے کی تیاری کر لو ...... اور خوش ہو جاؤ کہ میں نے تمہارے لئے ایک اور کام نکال لیا ہے۔ اب تو تمہیں میری خفگی کا شکوہ نہیں ہونا چاہئے۔''

''تھینک یو ملک صاحب!'' وہ ندامت آمیز ممنونیت سے بولا۔ ''میں جلد از جلد آپ کی نظر میں سرخرو ہو کر دکھاؤں گا۔''

میں نے واشگاف الفاظ میں اس کے نیک عزائم کو سراہا۔ جب وہ ضروری تیاری کے سلسلے میں کمرے سے نکل گیا تو میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر جھورے کے لئے کلچے اور پائے کا ناشتہ منگوا لیا۔ میرے تھانے کے نزدیک ہی جی ٹی روڈ پر بس اسٹاپ تھا۔ اسی بس اسٹاپ پر ایک نیک شعار بندہ سری پائے کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ مجھے بھی کئی مرتبہ اس کے ٹھیلے سے پائے وغیرہ منگوا کر کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ سری پائے کا عمدہ کاریگر تھا۔ ظہوری چاچا نامی وہ شخص اپنے پردادا کی میراثی ٹیکنیک کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ سری پائے بیچنا ان کا خاندانی پیشہ تھا۔

جب ناشتہ آ گیا تو میں نے جھورے سے کہا۔ ''جب تک تم ناشتے سے فارغ ہو گے، اے ایس آئی تیار ہو کر آ جائے گا۔ پھر تم اس کے ہمراہ روانہ ہو جانا۔ پہلے مویشی منڈی جا کر تم اپنے بندوں کو ضروری ہدایت دے دینا پھر تم دونوں تھیڑی سانسی کی طرف چلے جانا ...... اور ایک بات کا خیال رکھنا۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں کو شام سے پہلے پہلے کسی خوشگوار رپورٹ کے ساتھ واپس آنا ہے۔ میں اس سلسلے میں اے ایس آئی مزمل کو بھی تاکید کر دوں گا۔''

''انشاء اللہ! اچھا ہی ہو گا تھانے دار صاحب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

میں نے بھی صدقِ دل سے کہا۔ ''انشاء اللہ!''

❋❋❋

دوپہر کے بعد ارشاد احمد میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔

''تھانے دار صاحب! شاہدہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا کہ نہیں؟''

اس وقت وہ اکیلا ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں پتہ چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''شاہدہ کی ماں کی حالت ٹھیک نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اسی لئے میں اسے گھر پر چھوڑ آیا ہوں۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔'' میں نے اس کے غم میں شریک رہتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''میں نے تمہارے ذمے جو کام لگایا تھا، اس کا کیا ہوا؟ تم نے ان سہیلیوں کو تھانے لانے کی بات کی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میری ان تینوں کے باپوں سے بات ہوئی ہے لیکن انہوں نے ایک درخواست کی ہے۔''

''کیسی درخواست ارشاد احمد؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

مشتاق، نواز اور یعقوب نے کہا ہے اگر تھانے دار صاحب ہم پر مہربانی کریں تو ان لڑکیوں کو تھانے نہ بلائیں۔'' ارشاد احمد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے ایک تجویز دی ہے اور وہ یہ کہ وہ تنویر، خالدہ اور شمیم کو میرے گھر میں اکٹھا کر لیتے ہیں۔ آپ بھی وہیں آ جائیں، پھر ان لڑکیوں سے جو بھی پوچھ پرتیت کرنا ہو، وہیں پر کر لیں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر لجاجت آمیز انداز میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ جوان بیٹیوں کے والدین کی مجبوریوں کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے یعقوب، نواز اور مشتاق نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ باقی آپ زیادہ بہتر سوچ سکتے ہیں۔''

مشتاق، تنویر کا باپ تھا۔ نواز، خالدہ کا اور یعقوب، شمیم کا۔ گمشدہ شاہدہ آخری مرتبہ اس تین خواتین کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ لہٰذا میں شاہدہ کی بازیابی کے سلسلے میں ان تینوں کا بھرپور انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کی خاطر میں نے انہیں تھانے بلوایا تھا لیکن لڑکیوں کے والدین نے مجھ سے جو درخواست کی تھی وہ ہر لحاظ سے معقول اور جائز نظر آتی تھی لہٰذا میں نے ارشاد احمد کی بات کے جواب میں کہا۔

''لڑکیوں کے باپ بھی بہتر انداز میں سوچ رہے ہیں۔ مجھے ان کا یہ فرمائش نما مطالبہ منظور ہے۔ شمیم، خالدہ اور تنویر کو تھانے لانے کی بجائے تم اپنے گھر میں جمع کر لو۔ میں مغرب کے فوراً بعد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ جناب!''

میں نے ارشاد احمد سے اس کے گھر کی لوکیشن معلوم کی اور تسلی دلاسا دے کر اسے

رخصت کر دیا۔

درحقیقت میں ارشاد احمد کے گھر کا بھی تفصیلی جائزہ لینا چاہتا تھا۔ شاہدہ اس گھر کی ایک باسی تھی۔ عین ممکن تھا، وہاں سے مجھے کوئی ایسا اشارہ مل جاتا جو اس کی تلاش اور بازیافت میں مددگار ثابت ہوتا۔ شاہدہ کو ڈھونڈنے کے لئے مجھے ہر محاذ پر کام کرنا تھا۔

ارشاد احمد کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد شہباز میرے پاس آ گیا۔ گزشتہ رات ڈاکٹر بشارت کے گھر پر ہی میری اس سے مختصر ملاقات ہوئی تھی۔ تفصیلی بات چیت کے لئے میں نے اسے تھانے آنے کو کہا تھا۔ وہ اسی لئے میرے پاس حاضر ہوا تھا۔

شہباز ایک سلجھا ہوا اور معقول جوان تھا۔ جب اس سے گفتگو ہوئی تو مجھے پتہ چلا، وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ نہ ہو سکا اور اس نے بی فارمیسی کا کورس کر کے میڈیکل اسٹور کھول لیا۔ وہ ایک سند یافتہ کیمسٹ، فارماسسٹ اور ڈرگسٹ تھا۔ میڈیکل اسٹور کھولنے سے پہلے بی فارمیسی کورس کے دوران ہی اس نے ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں معمولی سی ملازمت بھی اختیار کر لی تھی۔ اس معمولی سی ملازمت نے اس کے تجربے اور معلومات میں غیر معمولی اضافہ کیا تھا۔ اب پچھلے دو سال سے وہ ایک بڑا میڈیکل اسٹور بڑے اعتماد اور شان سے چلا رہا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے شہباز سے ڈاکٹر بشارت کی خیر خیریت دریافت کی۔ اس نے بتایا۔ ''ڈاکٹر بشارت اپنے گھر میں پڑا آرام کر رہا ہے۔ چند روز تک وہ کلینک تو نہیں جا سکے گا۔ البتہ اس کے کمپاؤنڈرز نے کلینک کھول لیا ہے۔ بند دکانداری کا تاثر اچھا نہیں ابھرتا۔ ڈسپنسرز پرانے مریضوں کو بھگتاتے رہیں گے۔ ویسے مجھے نہیں امید کہ ڈاکٹر زیادہ دنوں تک گھر میں بیٹھا رہے گا۔ وہ تو آج بھی کلینک آنے کے لئے پَر تول رہا تھا لیکن اس کی بیوی نے نہیں آنے دیا۔ ڈاکٹر نے بڑی مصروف اور مستعد زندگی گزاری ہے۔ ایسے لوگوں کا کسی ایک جگہ ٹِک کر بیٹھے رہنا ممکن نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک کہتے ہو تم۔'' میں نے اس کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''میری بھی یہی رائے ہے کہ ڈاکٹر کو گھر میں بیٹھنے کی بجائے کلینک آنا چاہئے۔ وہ مریضوں میں گھرا رہنے کا عادی ہے۔ کلینک میں آ کر بیٹھے گا تو اس کا دل بہلا رہے گا۔ اس طرح اس کے زخموں کی ریکوری زیادہ جلدی ہو جائے گی۔''

''ہوں......'' اس نے پُرمعنی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور مستفسر ہوا۔ ''اس شیطان کا کوئی سراغ ملا جو ڈاکٹر کو زخمی کر کے فرار ہو گیا تھا؟''

مجھے اندازہ ہو گیا، شہباز شاہدہ کی گمشدگی سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کا میڈیکل اسٹور محلہ بختے والا میں تھا جب کہ رہائش تھانے والا بازار میں۔ لیکن شاہدہ کا تعلق محلہ نور پورہ سے تھا۔ ان دونوں محلوں میں تھوڑی دوری واقع تھی تاہم، دونوں محلے میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے لہٰذا میں نے شہباز کی معلومات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں بڑی سرگرمی سے اس بدبخت کو تلاش کر رہا ہوں۔ وہ ڈاکٹر بشارت کو زدوکوب کرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں اور بھی کئی گل کھلا کر گیا ہے!''

شہباز نے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کون کون سے گل ملک صاحب؟''

میں نے اسے جھورے اور شاہدہ کو پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا اور جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''ابھی تک تو یہ بھی پتہ نہیں چل سکا، اس وحشی جنگلی کا اصل نام کیا ہے؟ میرے پاس ابھی تک اس کے دو نام آئے ہیں۔ خوشیا ...... جو اس نے ڈاکٹر بشارت کے کلینک کی پرچی پر لکھوایا تھا اور اکرام اللہ ...... جو اس نے بکروالوں کے سردار جھورے کو بتایا تھا۔ میں نے اے ایس آئی مزمل کو اس مکار شخص کی گرفتاری کے لئے جھورے کے ساتھ تھیڑی سانسی روانہ کر دیا ہے۔ امید ہے، شام تک کوئی خوشخبری سننے کو ملے گی۔''

شہباز تھوڑی دیر مزید میرے پاس بیٹھا حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتا رہا۔ اس نے خاصے الجھے ہوئے انداز میں مجھ سے دریافت کیا۔

''ایک بات بالکل پلّے نہیں پڑ رہی ملک صاحب! اس جنگلی کی ڈاکٹر بشارت کے ساتھ کون سی دشمنی تھی؟ اس نے جس وحشیانہ سلوک کا مظاہرہ کیا ہے اس کی توقع کسی نارمل انسان سے تو نہیں کی جا سکتی۔ زیادہ نہیں مگر میں نے تھوڑی بہت نفسیات پڑھ رکھی ہے۔ مجھے تو وہ شخص کوئی دماغی مریض لگتا ہے!''

''میں بھی تمہارے خیال سے متفق ہوں شہباز!'' میں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ساتھ کوئی ذہنی اور نفسیاتی گڑبڑ ضرور ہے۔ بہرحال!'' میں نے لمحاتی توقف کرنے کے بعد اضافہ کیا۔

''وہ بہت جلد میری گرفت میں آنے والا ہے۔ میں کوشش تو یہی کروں گا کہ وہ اپنی زبان ہی سے دماغی اور نفسیاتی کیفیت کو تفصیلاً بیان کر دے تاکہ مجھے اس کا ''مرض'' ڈھونڈنے میں آسانی رہے۔ لیکن اگر اس نے شرافت کی زبان نہ سمجھی تو مجبوراً مجھے اس کے چند تفتیشی ''ٹیسٹ'' کرنا پڑیں گے۔ ان مخصوص ''ٹیسٹ'' سے گزرنے کے بعد اس کا مرض کھل کر سامنے آ جائے گا!''

شہباز میری بات کی تہہ میں پہنچ گیا، معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''ہسپتال کی لیبارٹری کی بہ نسبت آپ کے تھانے کی ''لیبارٹری'' میں کئے جانے والے ٹیسٹ زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔''

''تم سمجھداری کی بات کر رہے ہو!'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تھانے سے رخصت ہو گیا۔

تھیڑی سانسی میرے تھانے سے اتنے فاصلے پر تھا کہ دن میں بہ آسانی وہاں کے چار چکر لگائے جا سکتے تھے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر مجھے امید تھی کہ اے ایس آئی مزمل شام سے پہلے کسی خوشخبری کے ساتھ واپس آ جائے گا۔ لیکن جب مغرب کی اذان تک بھی اس کی صورت نظر نہ آئی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ اس زمانے میں دور دراز کے چھوٹے علاقوں میں ٹیلی فون کی سہولت میسر نہیں تھی کہ میں تھیڑی سانسی فون کر کے وہاں کی صورتِ حال سے آگاہی حاصل کر لیتا۔ انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد ارشاد احمد کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

نور پورہ لگ بھگ سو گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا محلہ تھا۔ ارشاد احمد نے مجھے بڑی تفصیل سے لوکیشن سمجھا دی تھی چنانچہ اس کا گھر تلاش کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کا گھر مسجد والی گلی میں تھا۔ میں دستک دے کر گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا اور وہاں مجھے ارشاد احمد کی صورت دکھائی دی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے دروازہ پوری طرح کھول دیا پھر وہ مجھے اپنے ساتھ کمرے کے اندر لے گیا۔

دیگر متعلقین اور متعلقات وہاں موجود تھے۔ میں نے سب سے پہلے اس گھر کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ تین کمروں پر مشتمل ایک درمیانے درجے کا گھر تھا۔

ایک ہی سائز کے دو کمرے پہلو بہ پہلو مکان کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے آٹھ فٹ کا ایک لمبا سا برآمدہ تھا۔ پھر گھر کا صحن شروع ہو جاتا۔ بائیں دیوار کے ساتھ ہی باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ ایک سیدھ میں بنے ہوئے تھے۔ گھر کا تیسرا کمرا بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور یہ مکان کے اگلے حصے میں بنا ہوا تھا۔ بیٹھک میں آمد و شد کے لئے دو دروازے استعمال ہوتے تھے جن میں سے ایک باہر گلی میں، داخلی دروازے کے برابر تھا اور دوسرا دروازہ اندر ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ میں نے اوپر جن متعلقین

اور متعلقات کا ذکر کیا ہے وہ سب اسی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ میرے ساتھ تھانے سے کانسٹیبل بصیر آیا تھا۔ وہ بھی اس وقت بیٹھک میں موجود تھا۔

میں نے ارشاد احمد کی رہنمائی میں کوشش کر کے اس گھر کا معائنہ مکمل کر لیا۔ عقبی دونوں کمروں میں سے ایک میں ارشاد اور اس کی بیوی نصرت رہتے تھے۔ دوسرا کمرا گم شدہ شاہدہ کے استعمال میں رہتا تھا۔ مذکورہ کمرے میں ضرورت کی وہ ہر شے موجود تھی جو کسی شخص کی زندگی گزارنے کے لئے اہم اور لازم ہو۔ میں نے اس کمرے کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا۔

اسی کھوج کے دوران میں نے شاہدہ کے کپڑوں والے ٹرنک میں سے کام کی دو اشیاء برآمد کر لیں۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ ان میں سے ایک بوسکی کا جیبی رومال تھا اور دوسرا کسی کاپی سے پھاڑا ہوا ایک لائن دار کاغذ اور یہ دونوں برآمدات بڑی ہی سنسنی خیز کہانی سنا رہی تھیں!

اس وقت میرے علاوہ شاہدہ کا باپ ارشاد احمد بھی کمرے میں موجود تھا۔ میں نے ٹرنک کی تلاشی ارشاد کے سامنے ہی لی تھی لہٰذا مذکورہ دونوں اشیاء اس کی نظر سے اوجھل نہ رہ سکیں۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ ارشاد احمد اگرچہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن کاپی کے صفحے پر درج تحریر اور رومال کی کڑھائی کو وہ بہ خوبی سمجھ اور پڑھ سکتا تھا اور یہ پڑھنا، سمجھنا ہی اس کی وحشت ناک حیرت کا سبب تھا۔

بوسکی کے رومال کے ایک کونے میں ایک دل کڑھا ہوا تھا جس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے سرخ ریشمی دھاگے کا استعمال بڑی مہارت اور خوبصورتی سے کیا گیا تھا۔ اس ریشمی دل کے نیچے سبز دھاگے سے لفظ ''راجو'' کاڑھا گیا تھا۔ یہ ''راجو'' جو کوئی بھی تھا، یا تو اس نے وہ ریشمی رومال شاہدہ کو دیا تھا اور یا پھر شاہدہ نے وہ رومال راجو کے لئے کاڑھا تھا۔

کاپی والے صفحے کی تحریر خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ اس صفحے پر صرف تین سطریں درج تھیں

......کل شام پانچ بجے ......مویشی منڈی میں ملوں گا ...... میں خود تمہیں تلاش کر لوں گا ......

ان سطور کے اختتام پر کسی کا نام تحریر نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو مخاطب کر کے وہ پیغام دیا گیا تھا لیکن شاہدہ کے صندوق سے برآمد ہونے کا مطلب سیدھا سیدھا یہی تھا کہ وہ خفیہ پیغام شاہدہ ہی کے لئے تھا جو وقوعہ سے ایک روز قبل تحریر کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس میں ''کل شام'' کے الفاظ اس جانب اشارہ کرتے تھے۔ ''تلاش کر لوں گا'' یہ ظاہر کرتا تھا، پیغام دینے والا کوئی مرد ہے۔ بوسکی کے رومال پر کڑھا ہوا دل اور راجو یہ سوچنے پر مجبور کرتے تھے کہ وہ

پیغام راجو نے شاہدہ کے لئے تحریر کیا ہوگا۔ یہ تمام تر منطقی خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ اگلے ہی لمحے ارشاد احمد کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''تھانے دار صاحب! یہ سب کیا ہے.....؟''

اس وقت ہم دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا اور ...... یہ اچھا ہی تھا! ورنہ کسی تحقیق و تفتیش سے پہلے ہی یہ سنسنی خیز انکشافات جنگل کی آگ کی مانند قرب و جوار میں پھیل جاتے اور عین ممکن تھا، کارِ سرکار کے سلسلے میں مجھے کسی دشواری اور پیچیدگی کا سامنا کرنا پڑتا!

میں نے اپنی آواز کو حتیٰ الامکان دھیما رکھتے ہوئے ارشاد احمد نے کہا۔ ''یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہئے کیونکہ یہ رقعہ اور رومال تمہاری بیٹی کے ٹرنک کے اندر سے برآمد ہوئے ہیں۔''

اس کے چہرے پر گہری ندامت کے آثار جھلملائے۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ کسی شریف باپ کو شرمندگی سے زمین میں گڑ جانا چاہئے۔ میں ارشاد احمد کی جذباتی کیفیت اور محسوسات کو بڑی اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ اس کی حالت سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا دقت نہ ہوئی کہ وہ اس وقت کسی قسم کی اداکاری کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے جھلکنے والی ندامت اور آواز سے پھوٹنے والی شرمندگی سولہ آنے اصلی اور حسبِ حال تھی۔ وہ اپنی بیٹی شاہدہ کے ان معاملات سے قطعی ناواقف تھا۔ اس وقت وہ صرف اور صرف ایک بے بس اور لاچار بوڑھا باپ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے اس کی کیفیت اور پوزیشن کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنے لہجے کو حتیٰ الوسع دھیما اور نرم بنایا پھر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ارشاد احمد! اس وقت تمہارے گھر میں محلے دار بھرے ہوئے ہیں۔ میں پہلے ان کو فارغ کرلوں پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔''

''اس موضوع'' کے الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے وہ ریشمی رومال اور کاپی کا صفحہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ وہ ممنونیت سے لبریز آواز میں بولا۔

''آپ بہت عظیم ہیں تھانے دار صاحب! کسی کی عزت رکھنا آپ کو آتا ہے۔'' اس کی آواز اس قدر بھرائی ہوئی تھی کہ یوں محسوس ہوتا تھا، الفاظ میں سے آنسو ٹپکنے لگیں گے۔ اسی بھیگے ہوئے انداز میں اس نے بات کو مکمل کرنے کی کوشش کی۔ ''اب آپ اسی طرح میری بیٹی شاہدہ کو بھی عزت و آبرو سے ڈھونڈ نکالیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر.....''

میں نے ارشاد احمد کے منوں بوجھ تلے دبے ہوئے ضعف زدہ شانے کو تسلی آمیز انداز میں تھپکتے ہوئے قطع کلامی کی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارشاد احمد! عظیم صرف وہی ذاتِ پاک ہے جو میرا اور تمہارا خالق ہے۔ عزت اور ذلت دینا بھی صرف اسی کے اختیار میں ہے۔ میں تو اپنی بساط بھر کوشش کروں گا۔ اگر اسے منظور ہوا تو تمہاری بیٹی صحیح سلامت واپس آ جائے گی۔ تم شاہدہ کے لئے دعا کرو۔''

اس کی آنکھوں میں فرطِ جذبات نے نمی بھر دی میں نے بوسکی کے ریشمی رومال اور کاپی کے پیغاماتی صفحے کو اپنی جیب میں رکھا اور ارشاد احمد سے کہا۔

''آؤ، ادھر بیٹھک میں چلتے ہیں۔ وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے خاموشی سے میرے ساتھ ہولیا۔

ہم بیٹھک میں پہنچے تو مجھے دیکھتے ہی وہ تمام افراد ایسے خاموش ہو گئے جیسے میں کوئی اہم اعلان کرنے والا ہوں۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ میں نے بیٹھک تک پہنچنے سے پہلے ہی صحن میں ان کی باتوں کی بھنبھناہٹ سن لی تھی۔

میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک شخص نے قدرے برہمی سے سوال کیا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے یہ کس چکر میں ہمیں بٹھا رکھا ہے؟ ہمیں اور بھی بہت سارے کام ہیں۔''

سوال کرنے والے کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ خاصا اکتایا ہوا اور بیزار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ ''زیادہ گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ تم پہلے جا کر اپنے ضروری کام نمٹا لو۔ جب فرصت ملے تو آ جانا۔ میں یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرلوں گا۔''

''میں اپنی بیوی کو یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟'' وہ بدستور خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

اس شخص نے بیوی کا ذکر کیا تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ خالدہ کا شوہر تھا۔ کیونکہ گم شدہ شاہدہ کی تینوں مذکورہ سہیلیوں میں سے صرف خالدہ ہی شادی شدہ تھی۔ تنویر اور شمیم ابھی تک کنواری تھیں۔ ان لوگوں کے بارے میں ابتدائی اور ضروری معلومات مجھے ارشاد احمد سے حاصل ہو چکی تھیں۔ خالدہ کے شوہر کا نام رجب علی تھا۔ وہ موسیٰ کالونی میں رہتا تھا۔ ریل بازار میں اس کے کپڑے کی ایک چلتی ہوئی دکان تھی۔

''تم غالباً خالدہ کے شوہر ہو!'' میں نے رجب علی کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔

''جی ہاں، آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا ہے۔'' اس کا لہجہ بھی اعتدال پر آ گیا۔

میں نے کہا۔ ''رجب علی! میں نے کسی شوق میں یا تفریح کی خاطر آپ لوگوں کو یہاں جمع نہیں کیا۔ یہ ایک گمبھیر اور سنگین معاملہ ہے۔ گم شدہ شاہدہ آخری مرتبہ جن لوگوں کے ساتھ دیکھی گئی ہے ان میں ایک تمہاری بیوی خالدہ بھی ہے۔ شاہدہ، خالدہ، تنویر اور شمیم ایک ساتھ مویشی منڈی کی طرف گئی تھیں۔ باقی سب تو اپنے گھروں کو واپس پہنچ گئیں، صرف شاہدہ ہی ابھی تک لا پتہ ہے اس لئے شاہدہ کی سہیلیوں سے پوچھ گچھ کرنا بہت ضروری ہے۔'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تم سب لوگوں کو تو ارشاد کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے گھر میں یہ میٹنگ رکھ لی ورنہ میں تو ایک ایک کو تھانے بلا کر تفتیش کرنے والا تھا۔ کچھ سمجھ میں آیا کہ نہیں؟''

میری اس وضاحت کے بعد اس کے دماغ کے اندر بیٹھی ہوئی گرمی بالکل ہی جاتی رہی۔ بڑی نرمی سے بولا۔ ''میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ گیا جناب! بس ذرا سی مہربانی یہ کریں کہ پہلے میری بیوی کو فارغ کر دیں۔ مجھے کل صبح ہی صبح واپس موسیٰ کالونی جانا ہے اس لئے گھر جا کر تیاری بھی کرنی ہے۔''

اس کی یہ درخواست خاصی معقول تھی لہٰذا میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے رجب علی! میں پہلے تمہاری بیوی کا نمبر لگاتا ہوں۔''

اس کے بعد میں ارشاد احمد کی بیٹھک میں جم کر بیٹھ گیا اور تمام افراد کو گھر کے دوسرے حصے میں منتقل کر دیا۔ پھر میں ایک ایک پارٹی کو باری باری اپنے پاس بلانے لگا۔ پہلا نمبر خالدہ اور رجب علی کا تھا۔

خالدہ سے پوچھ تاچھ کے دوران رجب علی خاموش بیٹھا ہمیں دیکھتا رہا۔ میں نے پورے دس منٹ تک گھما پھرا کر خالدہ سے متعدد سوالات کئے لیکن اس کے جوابات میں سے کوئی بھی ایسی بات گرفت میں نہ لا سکا جو شاہدہ کی تلاش میں کچھ روشنی دکھا کر میرا کام آسان کر دیتی۔ اس نے یہی بتایا کہ شاہدہ مویشی منڈی سے صحیح سلامت واپس لوٹی تھی اور اس نے اسے اپنی گلی میں داخل ہوتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

جب مجھے اپنے مطلب کی ایک بھی بات معلوم نہ ہوئی تو میں نے ایک دوسرے زاویے سے اسے گھسنا چاہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ خالدہ کی عمر پچّیس سال کے قریب تھی۔ وہ مائل بہ فربہی بدن کی مالک ایک خوش شکل عورت تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک اس کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ خالدہ کی بہ نسبت رجب علی ایویں سا ہی تھا۔ وہ اس کا پاسنگ دکھائی دیتا تھا۔ ان

دنوں میں ''دیکھنے اور دکھانے'' کے حوالے سے کوئی میل نہیں تھا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور خالدہ سے پوچھا۔ ''خالدہ! شادی سے پہلے تم نور پورہ ہی میں رہتی تھیں۔ بلکہ تم نے تو اسی محلے میں آنکھ کھولی ہے اور شادی کے بعد بھی گاہے گاہے یہاں آتی رہی ہو جیسا کہ ابھی آئی ہوئی ہو۔ اس لئے مجھے امید ہے، تم اس محلے کے لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہو گی۔ میری یہ امید غلط تو نہیں ہے؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''اگرچہ محلے کے تمام لوگوں سے میرا میل جول نہیں رہا لیکن بہرحال، میں انہیں جانتی ضرور ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اب ذرا سوچ کر بتاؤ، کیا نور پورہ میں راجو نامی کوئی بندہ بھی رہتا ہے؟''

''راجو!'' اس نے ذہن پر زور دینے والے انداز میں اس لفظ کو دہرایا اور بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''جی ہاں، رہتا ہے۔'' پھر مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ''آپ فقیرے موچی کے بیٹے راجو کی بات کر رہے ہیں ناں؟''

''تم مجھ سے سوال نہیں کرو۔ صرف میرے سوالات کے جواب دو۔'' میں نے قدرے تنبیہی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اب مجھ اس راجو کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ جو کہ فقیرے موچی کا بیٹا ہے؟''

اس کی سمجھ میرے طریقۂ تفتیش کو اپنے اندر سما نہ سکی۔ الجھن زدہ لہجے میں وہ میرے استفسار کا جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''میں نے جس راجو کا ذکر کیا ہے اس کی عمر پانچ چھ سال ہو گی۔ وہ ذہنی طور پر معذور ہے۔ سارا دن محلے کی گلیوں میں اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے...... اور بس!''

اس کی وضاحت نے میرے ذہن کو صاف کر دیا۔ میں بوسکی کے رومال پر کشیدہ ''راجو'' کو تلاش کر رہا تھا، فقیرے موچی کا یہ ایب نارمل پانچ سالہ بیٹا میرا مطلوبہ راجو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اتمامِ حجت کے طور پر خالدہ سے پوچھا۔

''تمہارا مطلب ہے، اس کے علاوہ نور پورہ میں کوئی اور راجو نہیں بستا؟''

''جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

میں نے اس جوڑے کو فارغ کر کے دوسری پارٹی کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہ پارٹی دو افراد پر مشتمل تھی یعنی شمیم اور اس کا باپ یعقوب!

شمیم کی عمر لگ بھگ بیس سال رہی ہو گی۔ وہ ایک شوخ و شنگ لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے والد یعقوب کی نور پورہ میں پرچون کی دکان تھی۔ میں نے شمیم سے بھی وہی سوالات کئے جو اس سے پہلے خالدہ سے کر چکا تھا اور اس نے بھی خالدہ کے جوابات سے ملتے جلتے جوابات دیئے یعنی شمیم کے انٹرویو سے بھی کوئی خاص بات سامنے نہ آ سکی۔ راجو کے حوالے سے بھی اس کا خیال خالدہ جیسا ہی تھا۔ وہ بھی ایب نارمل راجو کے سوا کسی راجو نامی شخص سے واقف نہیں تھی۔ میں نے اس پارٹی کو نمٹا کر آخری پارٹی کو اندر بلا لیا۔

تنویر اٹھارہ اُنیس سال کی ایک سانولی سلونی اور دھان پان لڑکی تھی۔ اس کا باپ مشتاق ایک ٹیلر ماسٹر تھا لیکن وہ اپنی ماں رقیہ بیگم کے ساتھ آئی تھی۔ تنویر کی آنکھوں میں مجھے ایک خاص قسم کی تیزی و طراری دکھائی دی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جسے ہر وقت کھوج رہتی ہو۔ اس کے اندر تجسّس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے ایک بے چین اور بے قرار لڑکی نظر آئی۔

میں جب اس سے وہ تمام سوال کر چکا جو خالدہ اور شمیم سے کئے تھے تو اس نے کہا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے راجو کے بارے میں اتنی شد و مد سے کیوں پوچھا ہے؟''

شمیم اور خالدہ نے مجھ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا، تنویر متجسس فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذہین لڑکی بھی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تنویر! تم شاہدہ کی گہری سہیلی ہو اس لئے میں تمہیں یہ بات بتا رہا ہوں۔ تم فی الحال اس بات کو اپنے تک رکھنا۔'' پھر میں نے اس کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تم بھی رقیہ بیگم! بہت محتاط رہنا۔ فی الحال اس بات کو پھیلنا نہیں چاہئے۔''

ان دونوں نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

میں نے بوسکی والے کڑھے ہوئے رومال اور کاپی کے صفحے والی تحریر کے بارے میں انہیں بتایا۔ تاہم یہ دونوں چیزیں انہیں دکھائی نہیں۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری بات سنتی رہی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں تنویر سے استفسار کیا۔

''کیا تم راجو نامی کسی ایسے لڑکے کو جانتی ہو جو شاہدہ میں دلچسپی لیتا ہو؟''

''جناب! ہمارے محلے میں تو ایسا کوئی راجو نہیں رہتا۔ یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولی۔

''تمہیں شاہدہ کے ایسے کسی معاملے کی خبر تو ہو گی۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں

کہا۔ ''سہیلیاں عموماً اپنی ایسی باتیں ایک دوسرے سے چھپا کر نہیں رکھتیں۔''

''شاہدہ بہت ہی گھنّی لڑکی تھی تھانے دار صاحب!'' وہ بدستور پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''اس نے کبھی کسی راجو کا ذکر نہیں کیا...... لیکن......!''

وہ بولتے بولتے ''لیکن'' پر آ کر اٹکی اور خاموش ہو گئی۔

میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''لیکن کیا؟''

وہ پُرخیال انداز میں بولی۔ ''مجھے شک تو تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے لیکن شاہدہ کے مسلسل انکار نے کبھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی مہلت نہ دی۔ اب آپ اتنا کھل کر بتا رہے ہیں تو میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہو رہا ہے کہ شاہدہ کا کوئی چکر ضرور تھا۔ اسی لئے مویشی منڈی میں وہ......''

وہ ایک مرتبہ پھر بولتے بولتے رک گئی۔ اس کے ادھورے جملے نے میرے اندر تجسّس کو بھڑکایا تو میں نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔ ''مویشی منڈی میں کیا ہوا تھا؟''

''ہوا تو کچھ بھی نہیں تھا جناب۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''لیکن شاہدہ کی ایک حرکت مجھے شک میں مبتلا کر رہی ہے۔ پہلے میں نے اس طرف دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ آپ نے راجو کے حوالے سے ایک خاص سمت توجہ دلائی ہے تو وہ واقعہ میرے ذہن میں کھلبلی مچا رہا ہے۔''

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں تنویر سے پوچھا۔ ''شاہدہ نے مویشی منڈی میں ایسی کون سی حرکت کی تھی جو اب تمہارے ذہن کو الجھا رہی ہے؟''

وہ چند لمحات تک سوچنے کے بعد تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''ہمارا یونہی بیٹھے بٹھائے مویشی منڈی کی طرف جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ تجویز شاہدہ ہی کی تھی اور چونکہ ہم سب کو پسند آئی تھی لہٰذا ہم تھوڑی سیر و تفریح کے لئے ادھر نکل گئے۔ مویشی منڈی کے ساتھ ہی مختلف اشیائے صرف و استعمال کے اسٹال بھی لگے ہوئے تھے۔ سوچا، اگر کوئی چیز پسند آ گئی تو خرید بھی لیں گے۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے رکی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ہم ان اسٹالز اور مویشیوں کے میلے ٹھیلے کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ ہمیں محسوس ہوا، شاہدہ ہمارے ساتھ نہیں۔ ہم نے اس کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھا۔ کسی کو بھی اس کی غیر حاضری کا سبب معلوم نہیں تھا لہٰذا ہم پریشانی سے اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگے۔ بالآخر وہ ہمیں ایک طرف سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ہمارے قریب پہنچی

اور اس سے پہلے کہ ہم اس سے کوئی سوال کرتے، الٹا اس نے ہم سے پوچھ لیا، ہم اسے پیچھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟ یہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والی بات تھی خالدہ نے ہم سے کہا، ہم نے تمہیں نہیں چھوڑا بلکہ تم خود ہی پیچھے رہ گئی ہو گی۔ شاہدہ نے گھبراہٹ آمیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''میں ایک اسٹال پر چوڑیاں دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد نظر اٹھائی تو تم تینوں غائب تھیں۔ بڑی مشکل سے تمہیں ڈھونڈنے کے بعد پایا ہے۔ دیکھ رہی ہو، یہاں کتنا رش ہے۔ لگتا ہے، ہر شخص جانور خریدنے کے لئے اس منڈی میں پہنچا ہوا ہے!'' شاہدہ کی وضاحت خاصی بودی تھی لیکن اس وقت ہمارے ذہن میں اس کے حوالے سے، پہلے سے کوئی بات موجود نہیں تھی لہٰذا ہم نے اس کی بات کا اعتبار کر لیا۔ لیکن اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ شاہدہ نے ہم سے بہانہ کیا تھا۔ اگر ہم اسے پیچھے چھوڑ آئے تھے تو اسے ادھر ہی سے نمودار ہونا چاہئے تھا لیکن وہ ہمیں دوبارہ دوسری جانب دکھائی دی تھی۔ بہرحال، ہم نے رونق میلہ دیکھا اور شام سے پہلے گھر آ گئے۔''

تنویر نے اپنے طولانی بیان میں میرے مطلب کی بہت سی باتیں اگل دی تھیں۔

میں چند لمحات تک گہری نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر کہا۔ ''تنویر! تم ایک بیدار مغز اور ذہین لڑکی ہو۔''

میرے منہ سے اپنی تعریف سن کر وہ خوش ہو گئی۔

میں نے اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے شمیم اور خالدہ سے بھی کرید کرید کر ایک ایک واقعے کے بارے میں پوچھا ہے لیکن کسی نے مجھے شاہدہ کے ''غائب'' ہونے کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس معمولی سے غیر معمولی واقعے کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ صرف تم نے مجھے بتایا ہے۔ یہ تمہاری حاضر دماغی اور ذہانت کا کھلا ثبوت ہے۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! اب آپ میری ذہانت کے اس مظاہرے کو کام میں لائیں اور جلد از جلد شاہدہ کو ڈھونڈ نکالیں۔''

''میں شاہدہ کی بازیابی کے لئے انشاء اللہ پوری کوشش کروں گا۔''

پھر میں نے ان ماں بیٹی کو ضروری ہدایات دینے کے بعد وہاں سے رخصت کر دیا۔

ارشاد احمد اور اس کی بیوی نصرت میرے پاس بیٹھک میں آ گئے۔ نصرت نے فکر مند لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ''تھانے دار صاحب! میری بیٹی کا کوئی سراغ ملا آپ کو؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں، ملا تو ہے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ میں اس سراغ کی انگلی تھام کر کس طرح تمہاری بیٹی شاہدہ تک پہنچتا ہوں۔''

میں چند لمحات تک بہ غور ان کا جائزہ لیتا رہا پھر ارشاد سے پوچھا۔ ''میں نے تمہارے ذمے ایک کام لگایا تھا۔ تم نے اس سلسلے میں کیا پیش رفت کی ہے؟''

وہ عجیب سی، خالی خالی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کون سا کام تھانے دار صاحب؟''

حد سے بڑھی ہوئی پریشانی نے اس کی یادداشت کو بھی بڑی حد تک متاثر کر ڈالا تھا۔ وہ اس وقت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری دکھائی دیتا تھا۔ نصرت بی بی کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔

ارشاد احمد جب تھانے میں مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اس سے کہا تھا، وہ اپنے عزیز رشتے داروں سے رابطہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کہیں شاہدہ ان میں سے کسی کے گھر تو نہیں پہنچ گئی۔ لیکن شاہدہ کے ٹرنک سے برآمد ہونے والی اشیاء اور تنویر کی نشان دہی نے حالات کا رخ پھیر دیا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ شاہدہ اپنی مرضی اور منصوبہ بندی سے کسی راجو کے ساتھ گھر سے فرار ہوئی تھی۔

میرے خیالات اور تجویز کے جواب میں ارشاد احمد نے بتایا تھا کہ وہ یعنی اس کی بیٹی شاہدہ چپ چپاتے یوں کسی رشتے دار کے گھر نہیں جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی میرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا تھا کہ ان کے رشتہ دار وزیر آباد، قلعہ دیدار سنگھ، پنڈی بھٹیاں، کھیالی اور تھیڑی سانسی وغیرہ میں رہتے تھے۔ میں نے یاد دلانے کے لئے جب اس کا حوالہ دیا تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''نہیں تھانے دار صاحب! مجھے اس بات کا موقع نہیں مل سکا۔''

میں نے اس کی پریشانی کو بانٹتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ تم ان رشتے داروں کے ایڈریس مجھے نوٹ کروا دو۔ میں اپنے طور پر معلوم کروانے کی کوشش کروں گا۔''

اس نے میری ہدایت کے مطابق اپنے رشتے داروں کے نام اور پتے مجھے لکھوا دیئے۔

میں نے انہیں چند ضروری باتوں کی تاکید کی اور وہاں سے اٹھ گیا۔

❀❀❀

ہم تھانے پہنچے تو اے ایس آئی مزمل کو وہاں موجود پایا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا اور پوچھا۔ ''تم کب آئے ہو؟''

''آپ کے جاتے ہی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہاں پہنچا تو پتہ چلا، آپ پانچ منٹ پہلے نور پورہ کی طرف گئے ہیں۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''وہ جھورا بکروال کہاں ہے، وہ مجھے نظر نہیں آ رہا؟''

''جھورا ابھی دس منٹ پہلے مویشی منڈی کی طرف گیا ہے۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''میں نے اسے آپ کے انتظار میں بٹھا رکھا تھا۔ جب کافی دیر ہو گئی تو اس نے کہا، تھوڑی دیر کے لئے میں اسے جانے دوں۔ وہ مویشی منڈی کی صورت حال کا جائزہ لے کر فوراً واپس آ جائے گا۔''

''ہاں، مجھے واقعی ادھر کافی وقت لگ گیا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''بس معاملہ ہی ایسا تھا کہ میں وہاں رکنے کے لئے مجبور ہو گیا۔'' میں نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر سرسری انداز میں کہا۔ ''ویسے میں نے تم لوگوں کے تھیڑی سانسی روانہ ہوتے ہی ایک بندہ مویشی منڈی کی طرف بھیجا تھا تاکہ وہ جھورے کے بیٹے صفدر کو باپ کی خیر خیریت سے آگاہ کر سکے۔'' پھر میں نے مزمل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تھیڑی سانسی کی کیا رپورٹ ہے؟''

''خوشیا...... میرا مطلب ہے وہ خطرناک بندہ ہاتھ نہیں لگا جو ڈاکٹر بشارت کو شدید زخمی کر کے فرار ہو گیا تھا۔''

مذکورہ شخص نے ڈاکٹر بشارت کو اپنا نام خوشیا بتایا تھا جب کہ جھورے کے پاس کام حاصل کرنے کے لئے اس نے خود کو اکرام اللہ ظاہر کیا تھا اور تھیڑی سانسی کے کسی خوشیا کا حوالہ بھی دیا تھا۔ ان واقعات سے یہی ظاہر ہوتا تھا وہ شخص تھیڑی سانسی سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نے اسی تحقیق و تفتیش کے لئے مزمل کو تھیڑی سانسی بھیجا تھا۔ تھیڑی سانسی والا خوشیا چونکہ جھورے کا گہرا شناسا تھا اس لئے میں نے جھورے کو بھی اے ایس آئی کے ساتھ کر دیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی سے استفسار کیا۔ ''مزمل! تم لوگوں نے تھیڑی سانسی میں اچھا خاصا وقت صرف کیا ہے۔ اس دوران تمہیں اس خطرناک بندے کا شجرہ تک نکال لینا چاہئے تھا۔ تم اتنی دیر تک وہاں کیا کرتے رہے ہو؟''

''جناب! آپ کی دعا سے میں اچھا خاصا کام نمٹا کر آیا ہوں۔'' اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''ہم بہ آسانی حنیفو کو قابو کر سکتے ہیں۔''

''حنیفو؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون ہے؟''

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''یہ وہی خطرناک اور جنونی شخص ہے جناب جو ڈاکٹر بشارت کے سامنے خوشیا تھا اور جھورے کے سامنے اکرام اللہ بن گیا لیکن اس کا اصل نام

حنیف عرف حنیفو ہے اور وہ تھیڑی سانسی ہی کا رہنے والا ہے۔''

اے ایس آئی کی رپورٹ خاصی سنسنی خیز تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے جلدی سے کہا۔ ''رکو مت، بولتے جاؤ۔ میں اس حنیفو کے بارے میں مکمل معلومات چاہتا ہوں۔ سمجھ گئے؟''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' اس نے ایک طویل اور گہری سانس خارج کی پھر مجھے اپنی کارکردگی کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

اے ایس آئی مزمل کے مطابق جھورا سیدھا اسے اپنے دوست خوشیا کے پاس لے گیا تھا جو تھیڑی سانسی میں مٹی کے برتن بنانے کا کام کرتا تھا۔ اس کے اسپیشل آئٹمز میں مٹی کی ہانڈیاں، مٹکے اور آب خورے شامل تھے۔ خوشیا نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا پھر جب جھورے نے اسے اکرام اللہ کے بارے میں بتایا اور اس کا تفصیلی حلیہ بھی بیان کر دیا تو خوشیا فوراً سمجھ گیا، کس کا ذکرِ شر ہو رہا ہے۔ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور کہا۔

''اس نالائق کا نام حنیف عرف حنیفو ہے۔ یہ کام چور شخص کسی مصرف کا نہیں۔ اس کی ایک خوبصورت بیوی اور ایک معصوم سی بچی ہے لیکن یہ ان کی نگہداشت کے لئے ٹِک کر کوئی معقول کام نہیں کرتا۔ چھوٹی موٹی چوری چکاری اور ہیرا پھیری کے کاموں میں اس کا دل لگتا ہے۔ اس کے کرتوتوں کی وجہ سے ساری تکلیفیں اللہ رکھی اور کلثوم کو اٹھانا پڑتی ہیں (کلثوم اس کی چار سالہ بچی اور اللہ رکھی اس کی بیوی کا نام تھا) ایک روز میں اسے اس کی نالائقیاں گنواتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا تو الٹا اس نے مجھ سے پوچھا، چاچا خوشیا! تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ مجھے کوئی کام وام تو ملتا ہی نہیں۔ میں نے فوراً پیش کش کر دی، میرے پاس آٹھ دس مزدور کام کرتے ہیں۔ تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ۔ میں جس حساب سے انہیں اجرت دیتا ہوں، تمہیں بھی دے دوں گا۔ لیکن اس نے فوراً بہانہ جڑ دیا۔ اس کی کام کرنے کی نیت ہی نہیں تھی اس لئے جلدی سے بولا، چاچا! تمہارے کام میں ہاتھ پاؤں اور منہ کو مٹی میں پوتنا پڑتا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا! میں نے پوچھا، اوئے نالائق! انسان مٹی سے بنا ہے اور مرنے کے بعد بھی اسے مٹی ہی میں جانا ہے۔ تمہیں مٹی میں ہاتھ پاؤں ڈالتے ہوئے موت کیوں آتی ہے؟ اس پر اس نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا، مٹی کی وجہ سے مجھے جلدی بیماری ہونے لگتی ہے، میں سمجھ گیا، وہ کام کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا۔''

اے ایس آئی سانس لینے کی غرض سے تھوڑی دیر کو متوقف ہوا پھر حنیفو کے حوالے سے خوشیا کا بیان دہراتے ہوئے مزید بتانے لگا۔

"میں نے بھی اس کی جان نہ چھوڑی اور کہا ادھر شہر کی مویشی منڈی میں آج کل میرے ایک یار نے کاروبار چمکا رکھا ہے۔عید قربان کی وجہ سے اس کا دھندا عروج پر ہے۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ، میرا بتانا۔ وہ تمہیں کوئی کام دے دے گا۔اس نے بددلی سے کہا، اچھا چاچا! جاتا ہوں میں تمہارے دوست جھورے کے پاس۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ وہ تمہارے پاس واقعی چلا جائے گا۔تم بتا رہے ہو تو مجھے یقین کرنا پڑ رہا ہے۔"

خوشیا کی بات ختم ہوئی تو جھورے نے اسے حنیفو کے تازہ ترین "کارنامے" کے بارے میں تفصیلاً بتایا کہ کس طرح وہ مویشیوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم لے کر فرار ہو گیا تھا۔علاوہ ازیں، اس نے "بشارت کلینک" پر جس بربریت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے بھی خوشیا کو آگاہ کیا گیا۔ یہ واقعات خوشیا کو پتہ چلے تو وہ اسی وقت غصے سے بولا، تم لوگ ادھر ہی بیٹھو میں حنیفو کو یہاں بلاتا ہوں۔ ابھی اس کو کھری کھری سناتا ہوں۔ پھر اس نے اپنے ایک مزدور ملازم کو حنیفو کے گھر بھیج دیا۔تھوڑی دیر بعد وہ بندہ واپس آیا اور اس نے بتایا کہ حنیفو گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بیوی اللہ رکھی کی زبانی پتہ چلا کہ وہ صبح ہی صبح اپنے ایک دوست سکندر سے ملنے قلعہ دیدار سنگھ چلا گیا ہے اس کی واپسی کے بارے میں اللہ رکھی کچھ نہیں جانتی۔ وہ اکثر دو دو، تین تین دنوں کے لئے گھر سے غائب رہتا تھا۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد اے ایس آئی مزمل نے کہا۔

"خوشیا اور جھورے میں بڑی گہری دوستی معلوم ہوتی ہے، خوشیا نے دل کھول کر ہماری آؤ بھگت کی اور کافی دیر تک اس لئے بٹھائے رکھا کہ شاید حنیفو واپس لوٹ آئے اور وہ اس کی گوشمالی کر سکے لیکن جب حنیفو کی آمد کے آثار پیدا نہ ہوئے تو ہم واپس آ گئے۔"

میں نے بڑی توجہ سے اے ایس آئی مزمل کا بیان سنا اور اس کے خاموش ہونے پر استفسار کیا۔"کیا تم خود جا کر حنیفو کی بیوی سے ملے تھے؟"

میرے اس سوال پر اس نے جزبز ہوتے ہوئے بتایا۔"نہیں ملک صاحب! میں حنیفو کے گھر نہیں جا سکا۔"

"اگر تم اس کے گھر جا کر اللہ رکھی سے چند سوال جواب کر لیتے تو ممکن ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی۔" میں نے سرزنش والے انداز میں کہا۔"کم از کم یہ تو پتہ چل ہی جاتا کہ وہ اپنے جس دوست سکندر سے ملنے گیا ہے، وہ قلعہ دیدار سنگھ میں کس جگہ رہتا ہے؟ اس طرح ہمیں حنیفو تک پہنچنے میں آسانی ہو جاتی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!" وہ نادم سا ہو کر بولا۔"واقعی مجھ سے کوتاہی

ہو گئی۔"

"لگتا ہے مجھے خود ہی کل صبح تھیڑی سانسی جانا ہو گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پھر ہمارے درمیان شاہدہ کی گمشدگی اور اس سلسلے میں حاصل ہونے والی تازہ ترین معلومات پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ بظاہر ان دو واقعات میں کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا تھا، سوائے اس کے کہ حنیفو (اب تصدیق ہو جانے کے بعد وہ جنگلی شخص خوشیا تھا اور نہ ہی اکرام اللہ۔ وہ اول آخر حنیفو ہی تھا) کی جیب سے گرنے والے پرس میں ڈاکٹر بشارت نے لگ بھگ دو ہزار روپے رکھے دیکھے تھے جو اس رقم کا تخمینہ ہو سکتا تھا...... ارشاد احمد کے گھر میں جمع ہونے والی کمیٹی کے بارہ سو روپے اور مویشیوں کی فروخت سے حاصل ہونے والے آٹھ سو روپے۔ لیکن یہ محض ایک قرین قیاس اندازہ تھا اور کوئی بڑا سبب اس اندازے کو ایک لمحے میں باطل کر سکتا تھا۔ لیکن میری چھٹی حس بار بار مجھے ہوشیار کر رہی تھی کہ ان دونوں واقعات میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور موجود ہے۔ یہ ایک طرح سے اس کیس کے دو سرے ہیں۔ اگر ایک سرا میرے ہاتھ لگ گیا تو میں با آسانی دوسرے سرے تک رسائی حاصل کر لوں گا۔

انہی خیالات کے تانے بانے میں اُلجھتے ہوئے میں اس رات کافی دیر تک سوچ نگر کی سیر کرتا رہا پھر پتہ نہیں رات کو کون سے پہر میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلی صبح میں نے کانسٹیبل مراد کو ساتھ لیا اور سیدھا تھیڑی سانسی پہنچ گیا۔ سب سے پہلے میں نے جھورے کے دوست خوشیا سے ملاقات کی خوشیا کا کاروبار نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ کوئی فرلانگ بھر جگہ میں پھیلا ہوا تھا۔ ہم دونوں اس وقت یونیفارم میں تھے۔ خوشیا نے بڑی خوش دلی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں کا مالک ایک جفاکش اور محنتی شخص تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میں ملک صفدر حیات ہوں۔ یہ سارا علاقہ میرے تھانے کی عملداری میں آتا ہے۔ کل میرا ایک اے ایس آئی تمہارے دوست جھورے کے ہمراہ آیا تھا۔"

"اوہ...... اچھا اچھا!" وہ جلدی سے بولا۔"انہیں کم بخت حنیفو کی تلاش تھی جو......"

"مجھے بھی اسی کم بخت کی تلاش یہاں تک لے کر آئی ہے۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔"تم مجھے حنیفو کے گھر تک پہنچا دو تو بڑی مہربانی ہو گی۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اچانک پوچھا۔"کیا وہ قلعہ دیدار سنگھ سے واپس آ گیا ہے؟"

"جناب! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں، اس میں مہربانی والی کون سی بات ہے۔"

بڑے اخلاق سے بولا۔ ''قانون کی مدد کر کے مجھے ہمیشہ خوشی حاصل ہوئی ہے۔ میں خود آپ کے ساتھ اس کے گھر تک چلتا ہوں لیکن تھوڑی خاطر تواضع کے بعد۔ آپ پہلی مرتبہ میرے ڈیرے پر آئے ہیں، کچھ کھائے پیئے بغیر کیسے جا سکتے ہیں!''

''تم حنیفو کے گھر تک میری رہنمائی کر دو تو میں سمجھوں گا، تم نے قانون کی اور میری بہت بڑی خدمت کر دی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خاطر تواضع کا پروگرام پھر کسی موقع کے لئے ملتوی کر دو۔ تمہاری یہ پیشکش میں اپنے ریکارڈ میں درج کر لیتا ہوں۔ مجھے جب بھی موقع ملا، میں تمہارے پاس دعوتِ شیراز اُڑانے چلا آؤں گا۔''

ایک لمحے کو رک کر میں نے پوچھا۔ ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا...... کیا حنیفو قلعہ دیدار سنگھ سے واپس تھیٹری سانسی آ گیا ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا اور بتایا۔ ''مجھے خود بھی بڑی شدت سے اس کا انتظار ہے۔ اس نے وہاں کے ڈاکٹر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تو خیر ہے ہی افسوس ناک، اس کے علاوہ اس نے میرے دوست جھورے کو مالی نقصان پہنچایا ہے، اس کی وجہ سے میں سخت غصے میں ہوں۔ میں حنیفو کی ایسی خبر لوں گا کہ مدتوں یاد رکھے گا۔''

خوشیا نے میری خاطر مدارات کے لئے بہت زور مارا لیکن میں نے بڑی خوبصورتی سے اسے ٹال دیا۔ چنانچہ ٹھیک دس منٹ بعد ہم اس کی معیت میں حنیفو کے گھر پہنچ گئے۔ وہ ہمیں وہاں چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔ ''مجھے ذرا اپنے کام کو دیکھنا ہے۔ آپ کو جب بھی میری ضرورت محسوس ہو، کسی کو بھی میری طرف بھیج دیں۔ میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔''

میں اسے رخصت کر کے حنیفو کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اللہ رکھی سے خوشیا نے میرا تعارف کرا دیا تھا اس لئے اللہ رکھی نے کسی حیل و حجت کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہمیں گھر کے اندر لے گئی۔ تاہم وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی اور یہ گھبراہٹ اس وقت سے اس پر طاری تھی جب میں نے اسے بتایا تھا، میں حنیفو کے سلسلے میں ضروری پوچھ گچھ کرنے وہاں آیا ہوں۔

اندر بیٹھتے ہی اس نے فکر مندی سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! حنیفو تو خیر سے ہے نا؟''

اللہ رکھی کے اس جملے سے ظاہر تھا وہ خاصی شوہر پرست قسم کی بیوی تھی۔ ایک نالائق اور نکھٹو شخص کے لئے بھی وہ گہری تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جو لوگ دوسروں کی خیریت کے دشمن ہوں، ان کی خیریت کو کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ نامراد جب میرے ہتھے چڑھ گیا تو سمجھ لو، پھر اس کی کوئی خیریت تمہیں نظر نہیں آئے گی۔''

''ہائے میں مر جاں!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''حنیفو نے کسی کے ساتھ ایسا کیا کر دیا ہے کہ آپ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟'' اس کی تشویش اور پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

اللہ رکھی اس وقت گھر میں اکیلی ہی تھی۔ اس کی چار سالہ بچی کلثوم کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیلنے گئی ہوئی تھی۔ میں نے مختصر مگر صاف صاف الفاظ میں اللہ رکھی کو اس کے شوہر کے ''کارناموں'' سے آگاہ کیا تو وہ دل تھام کر رہ گئی، گلوگیر لہجے میں بولی۔

''میں نے اسے بڑا سمجھایا ہے کہ ایسے چکروں سے باز آ جائے لیکن کیا کروں، میری کسی بات کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر چونکے ہوئے لہجے میں اچانک بولی۔

''اب سمجھی میں۔ اس کے پاس پیسے کہاں سے آئے ہوں گے۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''تم کن پیسوں (رقم) کی بات کر رہی ہو؟''

''کل صبح جب وہ قلعہ دیدار سنگھ جا رہا تھا تو اس نے مجھے پورے ایک سو روپے دیئے تھے۔'' اللہ رکھی نے بتایا۔ ''میں نے پوچھا بھی کہ اتنی بڑی رقم اس کے پاس کہاں سے آ گئی؟ اس نے کہا، میں آم کھاؤں، پیڑ گننے کی ضرورت نہیں۔ اس نے بتایا کہ واپسی میں اسے دو چار دن بھی لگ سکتے ہیں اس لئے وہ مجھے کھلا ڈلا خرچہ دے کر جا رہا ہے۔ یہ تو مجھے اب پتہ چل رہا ہے کہ......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر باقاعدہ آنسو بہانے لگی۔

میں نے قدرے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے شوہر نے جو کچھ کیا ہے، وہ تو تمہیں اور تمہاری بچی کو بھی بھگتنا ہو گا۔ مجھے بتاؤ، وہ قلعہ دیدار سنگھ میں جس سکندر سے ملنے گیا ہے اس کا گھر وہاں کس طرف واقع ہے۔ میں یہاں سے اٹھ کر سیدھا قلعہ دیدار سنگھ جاؤں گا۔''

''سکندر وہاں کے ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔'' اللہ رکھی نے بتایا۔ ''وہ جہانگیر کا بیٹا ہے۔ ان لوگوں کے چودھری خاندان سے بڑے قریبی اور گہرے تعلقات ہیں۔ سکندر کو ڈھونڈنے میں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔''

میرے لئے اتنی سی رہنمائی کافی تھی۔ میں اللہ رکھی کے پاس سے اٹھا اور تھانے آ گیا۔

قلعہ دیدار سنگھ کا رخ کرنے کے لئے خاص تیاری کی ضرورت تھی۔ کم از کم ایک عدد ہتھ کڑی تو ہونی ہی چاہئے تھی ناں! اگر خوش قسمتی سے حنیفو ہاتھ لگ جاتا تو استقبال کے لئے اسے آہنی زیور تو پہنانا ہی پڑتا۔

❋❋❋

غروبِ آفتاب سے پہلے حنیفو میرے تھانے کی حوالات میں موجود تھا۔

قلعہ دیدار سنگھ میں اسے تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ سکندر وہاں خاصا معروف تھا اور چودھری خاندان سے تعلق نے اسے اور بھی شہرت دے رکھی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو پتہ چلا۔ حنیفو سکندر کے ڈیرے پر تھا۔ حنیفو نے یہ بالکل غلط مشہور کر رکھا تھا کہ سکندر اس کا دوست تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کے درمیان آقا اور غلام والا رشتہ تھا۔ سکندر، حنیفو کے لئے سرپرست کی حیثیت رکھتا تھا اسی لئے اس کی گرفتاری کی راہ میں سکندر نے روڑے اٹکانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی اور حنیفو کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔

حنیفو نے ڈاکٹر بشارت کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا تھا، اس کے بدلے میں اس کی خاطر تواضع از حد ضروری تھی۔ میں نے اسے حوالدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''تم خوب طبیعت سے رات بھر اس کی مہمانداری کرو۔ میں صبح اس سے ملاقات کروں گا۔''

اگلی صبح میں تھانے پہنچا تو حنیفو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔

میں نے کڑی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''تم نے ڈاکٹر بشارت کو کیوں قتل کیا؟''

یہ پہلا سوال تھا جو میں نے حنیفو سے کیا ورنہ گرفتاری کے وقت میں نے اس سے کچھ کہا اور نہ ہی اس کی سننے کی کوشش کی۔ میرا سوال سن کر وہ اس طرح اچھلا جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا ڈاکٹر بھی......؟''

اس کے ادھورے جملے نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ادھورا جملہ بہت ہی سنسنی خیز کہانی کا پیش لفظ محسوس ہو رہا تھا۔ علاوہ ازیں اس کی بے ساختگی نے اس میں حقیقت کا بھرپور رنگ بھر دیا تھا۔ میں اس جملے میں پوشیدہ مفہوم تک پہنچ گیا۔

میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''تو تم نے ڈاکٹر بشارت کو قتل کرنے سے پہلے کسی اور کو بھی موت کے گھاٹ اتارا ہے؟''

''نن...... نہیں...... کچھ نہیں......'' وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ہکلایا۔

''مم...... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا......''

بات ختم کرتے ہی وہ بے حد ہراساں نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے پر بننے والا اُلجھنوں کا جال صاف بتا رہا تھا کہ نادانستگی میں وہ سچ اگل بیٹھا ہے۔ میں نے ڈاکٹر بشارت کو قتل کرنے والی بات محض اسے ڈرانے کے لئے کی تھی۔ یہ ایک حسین اتفاق تھا کہ میرا وہ داؤ نہایت ہی مفید ثابت ہوا۔ میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے، رات بھر کی خاطر داری تمہیں کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔ مجھے تین چار دن کے لئے تمہیں مہمان بنا کر رکھنا پڑے گا، پھر کہیں جا کر تمہاری زبان کھل سکے گی۔''

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات چغلی کھا رہے تھے کہ سچی بات اس کی زبان سے پھسل گئی ہے۔ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی واپس نہیں آ سکتے۔ میں نے اس کے ذہن کا مکمل حال لینے کے لئے اسے ایک مرتبہ پھر حوالدار کے حوالے کر دیا اور کہا۔

''یہ ایک قتل کا اقرار کر چکا ہے، تم نے اس سے دوسرے قتل کا اقرار کروانا ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ خواہ مخواہ کی ضد چھوڑ دے۔ اگر بات اس کی سمجھ نہ آئے تو زبان کھلوانے والے آلات کا استعمال بھی جائز ہے۔''

حنیفو تھر تھر کانپتے ہوئے حوالدار کے ساتھ چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے ٹرائل روم سے اس کے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں ان آوازوں میں شامل اذیت دیکھ کر بخوبی سمجھ گیا، حوالدار نے کون کون سے زبان کشا آلات اس پر آزمائے ہوں گے۔ ان آلات کی اثر پذیری مسلمہ تھی۔

دوپہر سے پہلے حنیفو الف کے مانند سیدھا ہو گیا اور اس نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا۔ فرار کی کوئی راہ نہ دیکھ کر اقبالِ جرم کرنے ہی میں اسے بہتری محسوس ہوئی حالانکہ میں جانتا تھا، اس کے لئے اب بہتری کی گنجائش کہیں بھی نہیں تھی۔ اسے جب دوبارہ میرے سامنے لایا گیا تو وہ روتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب...... میں نے راجو اور اس کی ساتھی لڑکی کو قتل کیا ہے لیکن ڈاکٹر بشارت کے قتل کا الزام مجھ پر خواہ مخواہ ڈالا جا رہا ہے۔ میں نے اسے صرف زخمی کیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''چلو، ڈاکٹر کے قتل کا الزام میں واپس لیتا ہوں۔ سمجھ لو، وہ زندہ ہے اب بتاؤ۔ تم نے راجو اور شاہدہ کو کیوں قتل کیا؟''

وہ میرے بدلتے ہوئے پینترے پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا پھر لرزتی ہوئی

آواز میں بولا۔ ''تو...... آپ نے ڈاکٹر کے حوالے سے...... جھوٹ بولا تھا؟''

''میرے جھوٹ اور سچ سے تم جیسے شیطانوں کو کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے نفرت آمیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم جیسے کمینوں اور وحشیوں کی زبان کھلوانے کے لئے ہمیں پتہ نہیں، کون کون سی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے۔'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے دھاڑ کر کہا۔

''تم نے ابھی تک سوال کا جواب نہیں دیا۔ بتاؤ، تم نے راجو اور شاہدہ کو موت کے گھاٹ کیوں اتارا؟''

یہ سوال اور اس کا جواب ''اقرارِ جرم'' سے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ راجو اور شاہدہ کے قتل کو قبول کر چکا تھا لہٰذا قتل کا سبب بتانے میں بھی اس نے مجھ سے ''محنت'' نہ کروائی۔ میں اس کی بیان کردہ کہانی کو مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ان میں سے بہت ساری باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

راجو کا تعلق قلعہ دیدار سنگھ سے تھا۔ حنیفو اسے صورت سے پہچانتا تھا لیکن ان کے درمیان کبھی علیک سلیک نہیں ہوئی تھی۔ اس نے وقوعہ کے روز جب راجو کو مویشی منڈی میں ایک لڑکی کے ساتھ راز و نیاز کرتے دیکھا تو اس کے اندر تجسّس جاگ اٹھا۔ وہ اس وقت مویشی فروش کے روپ میں تھا اس لئے کوئی اسے شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بڑی کامیابی سے ان دونوں کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ چپکے سے منڈی سے باہر آئے تو وہ ان کے پیچھے ہی تھا۔ اس وقت تک رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ پھر جب وہ دونوں قدرے ویران علاقے میں آ کر گندے نالے کی پُلیا پر بیٹھ گئے تو حنیفو بھی دبے قدموں ان کے قریب، پُلیا کے عقب میں چھپ گیا۔ اس پُلیا سے سڑک زیادہ دور نہیں تھی جہاں سے لاہور اور قلعہ دیدار سنگھ کے لئے بس مل جاتی تھی۔ حنیفو کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ راجو اس لڑکی کو بھگا کر کہیں لے جا رہا تھا۔ پُلیا پر بیٹھے بیٹھے لڑکی نے اپنے پرس سے ایک بھاری رقم نکال کر راجو کے حوالے کی جسے اس نے اپنے بٹوے میں رکھ لیا۔ رقم کے بارے میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اسی وقت حنیفو کے دل میں میل اتر آیا۔ ابھی تک تو وہ اندرونی تجسّس سے مجبور ہو کر ان کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا، رقم کا معاملہ سامنے آیا تو لالچ نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود کر دی پھر اس رقم کے حصول کے لئے اس نے راجو اور شاہدہ کو قتل کر دیا۔

جھورے کے آٹھ سو روپے اس کی جیب میں موجود تھے۔ اس نے یہ رقم بھی راجو والے سیاہ بٹوے میں ڈالی اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ راستے میں ایک زیر تعمیر عمارت کے قریب سے گزرا تو ایک دیوار میں سے نکلے ہوئے سریے نے اس کی پنڈلی کو بری طرح زخمی کر دیا۔ اندھیرے کے باعث وہ اس خطرناک سریے کو نہیں دیکھ سکا۔ وہ زخمی ٹانگ کے ساتھ کچھ آگے آیا تو اسے ڈاکٹر بشارت کا کلینک نظر آ گیا اور وہ پٹی کروانے کے لئے کلینک کے اندر داخل ہو گیا۔ کلینک کے اندر جو واقعات پیش آئے ان کا تفصیلی ذکر اس کہانی کے ابتدائی حصے میں کیا جا چکا ہے۔

جب حنیفو اپنی بات مکمل کر چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''اوئے کم بخت! تم نے ڈاکٹر بشارت کو ایسے وحشیانہ انداز میں زدوکوب کیوں کیا؟''

اس نے ایک مفرور قاتل کی نفسیات کے عین مطابق جواب دیا۔ ''میں نے اس رقم کے حصول کی خاطر دو انسانی جانوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔ جب وہ سیاہ بٹوا ڈاکٹر کے ہاتھ میں پہنچا تو اچانک مجھ پر ایک جنون سوار ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، وہ رقم گئی میرے ہاتھ سے بس......'' وہ لمحے بھر کو رکا اور ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''بس، میں نے ڈاکٹر سے وہ بٹوا چھیننے کے لئے اس کے سر اور منہ پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیئے۔ اس وقت میری پہلی ترجیح یہ تھی کہ جیسے بھی ہو، وہ بٹوا مجھے مل جائے۔ میں نے جھورے کی رقم بھی اس بٹوے میں رکھ دی تھی اور میں بٹوا حاصل کر کے کلینک سے نکل گیا۔''

بعد ازاں حنیفو کی نشان دہی پر راجو اور شاہدہ کی لاشیں گندے نالے کی پُلیا کے نیچے سے برآمد کر لی گئیں۔ جب یہ معاملہ کھل گیا تو مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ راجو قلعہ دیدار سنگھ میں شاہدہ کے تایا کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا اور وہیں ان میں انڈراسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ راجو، شاہدہ کو مویشی منڈی سے لے کر کہاں جا رہا تھا؟

اس سوال کا جواب صرف دو افراد کے پاس تھا یعنی راجو اور شاہدہ......! اور وہ دونوں ہی کوئی جواب دینے کے لئے اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے تھے۔

قلعہ دیدار سنگھ میں راجو کے گھر والوں پر جو قیامت گزری ہو گی اس سے انکار ممکن نہیں لیکن جب شاہدہ کی لاش کو ارشاد احمد کے حوالے کیا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسی رونے کے دوران اس نے دہائی دینے والے انداز میں مجھ سے ایک دل پاش سوال کیا۔

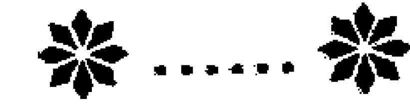
''تھانے دار صاحب! آپ نے تو مجھے تسلی دی تھی کہ اگر اللہ کو منظور ہوا تو میری بیٹی صحیح سلامت واپس آ جائے گی۔ میں شاہدہ کے لئے دعا کروں۔ لیکن دیکھ لیں، شاہدہ واپس نہیں آئی۔ آپ بتائیں، یہ اللہ کو منظور نہیں تھا یا پھر موت اللہ سے بھی زیادہ طاقت ور ہوتی ہے؟''

میں اس کی جذباتی کیفیت کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ اس لئے اس سے کسی بحث وتکرار کی ضرورت نہ سمجھی اور محض تسلی دلاسے کی باتیں کرنے لگا۔ وہ میری اس ہمدردی سے شانت ہونے کی بجائے برہم ہوگیا۔ بڑے خطرناک لہجے میں مجھ سے گویا ہوا۔

''تھانے دار صاحب! آپ میرے سوال کا چاہے جواب نہ دیں لیکن کان کھول کر سن لیں، یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ آج کے بعد میں آپ کو نظر نہیں آؤں گا۔ جب شاہدہ زندہ نہیں رہی تو میں بھی جی کر کیا کروں گا۔ خدا حافظ!''

اس کے بعد وہ تھانے سے چلا گیا۔ میں اس کے جذباتی دعوے کو ایک دل شکستہ اور خستہ حال باپ کا نوحہ سمجھا اور بوجھل جی کے ساتھ ان واقعات پر غور کرنے لگا۔

تین دن کے بعد ارشاد احمد کی موت کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا کہا پورا ہوگیا تھا۔ واقعی، وہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی تھی!



مفرور ڈاکو

اس تھانے میں تعینات ہوئے مجھے صرف دو دن ہوئے تھے۔ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ آج کا دن کام کے حوالے سے خاصا غیر مصروف گزرا تھا۔ کوارٹر کے دروازے پر دستک کا مطلب تھا، تھانے میں میری ضرورت پیش آ گئی تھی۔ میں بستر سے اٹھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔

کھلے ہوئے دروازے میں سے میری نگاہ ایک عورت پر گئی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ ایک عورت کو اس وقت اپنے کوارٹر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ پتہ نہیں، کون سی مجبوری اسے کھینچ کر میرے پاس لے آئی تھی۔

میں نے سرتاپا تنقیدی نظر سے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ وہ درمیانے قد کی مالک تھی۔ اس کی جسامت کا اندازہ لگانے میں مجھے مشکل پیش آئی کیونکہ اس نے پورے وجود کو سفید ریشمی چادر میں لپیٹ، بلکہ چھپا رکھا تھا۔ مجھے صرف اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں یا پھر پاؤں۔ انہی دو چیزوں سے میں نے اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ اس طرح رازداری کے ساتھ لپٹ لپٹا کر رات کو گھر سے نکلنا بتاتا تھا، اس کے معاملے کی نوعیت خاصی سنگین ہوگی......!

میں نے بمشکل پانچ سیکنڈ تک خاموشی سے اسے گھورا پھر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''میرا نام نوری ہے۔'' پردے کی اوٹ میں سے اس کی دھیمی آواز سنائی دی۔

نسوانی آواز اور زنانہ نام نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

میں نے نوری سے پوچھا۔ ''تم اس وقت میرے کوارٹر پر کیوں آئی ہو؟''

''مجھے آپ سے ایک بہت ہی ضروری کام ہے تھانے دار جی!'' وہ بدستور دھیمے لہجے میں بولی۔

میں نے چند لمحات تک اس کی بات پر غور کیا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑی رسانیت سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم میرے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں دس منٹ میں تیار ہو کر

ادھر ہی آتا ہوں۔"

"تھانے میں نہیں۔" اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ "آپ ادھر ہی میری بات سن لیں۔ کوارٹر کے اندر۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کوارٹر کے اندر ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا تو میں چوکنا نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ فوری طور پر میرا ذہن کسی گہری سازش کی طرف گیا تھا۔ مجھ سے پہلے اس تھانے کا جو انچارج تھا، اسے محکمے نے معطل کر دیا تھا۔ اس کے خلاف بدعنوانی اور رشوت ستانی کی اتنی زیادہ شکایات اوپر جمع ہو چکی تھیں کہ افسرانِ بالا کو اس کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس وقت میرا ذہن مذکورہ تھانے کے انچارج رفیق سیال کے بارے میں بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ رفیق سیال سے میری کبھی کوئی دوستی یا دشمنی نہیں رہی تھی۔ ممکن ہے، اپنے ساتھ ہونے والی محکمہ جاتی کارروائی کا ذمہ دار وہ مجھے سمجھتا ہو اور مجھے کسی چکر میں پھنسا کر ذلیل و رسوا کرنے کے لئے اس نے کوئی منصوبہ بنا لیا ہو۔ نوری اس کی آلۂ کار ہو سکتی تھی۔ حالات محتاط رہنے کا تقاضا کرتے تھے!

میں نے ایک سیکنڈ میں یہ سب سوچا اور نوری سے کہا۔ "بی بی! میں تمہیں اپنے کوارٹر کے اندر نہیں بلا سکتا۔ تمہیں جو بھی کہنا ہے ادھر تھانے چل کر ہی کہنا ہو گا۔"

"آپ مجھے کوئی غلط عورت نہ سمجھیں تھانے دار جی!" وہ لجاجت سے بولی۔ "میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ صرف دس منٹ کی بات ہے۔ میں اپنی بات کہہ کر جیسے خاموشی سے آئی ہوں ویسے ہی واپس بھی چلی جاؤں گی۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے اضطراری انداز میں اپنے دائیں بائیں اور پیچھے نگاہ ڈالی۔ اس کی بے چینی سے ظاہر ہوتا تھا یا تو اسے کسی کی آمد کا انتظار تھا یا پھر وہ کسی کی آمد سے خوف زدہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے وہاں کھڑا دیکھ لے۔

اس الجھی ہوئی صورتِ حال نے مجھے اور زیادہ محتاط بنا دیا۔ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "بی بی! تمہیں دس منٹ بات کرنا ہے یا پھر دس گھنٹے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سرکار نے یہ کوارٹر مجھے آرام کرنے کے لئے دیا ہے۔ میں اپنی ذمہ داریوں کو تھانے ہی میں پورا کرتا ہوں۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے کوئی ضروری کام ہے تو تمہیں تھانے میں چلنا ہو گا!"

وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ "آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں تھانے دار جی!"

"سمجھ رہا ہوں۔ اسی لئے تو یہ مشورہ دے رہا ہوں۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

"میں تھانے میں جا سکتی تو پھر ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی......!"

اس کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا۔

"نوری! تھانے چلنے میں کیا قباحت ہے؟"

"اگر میں وہاں چلی گئی تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔" وہ ایک مرتبہ پھر پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

اس کے اس مبہم اور پراسرار انداز نے میرے تجسّس کو ہوا دی۔ میں نے ایک چال چلتے ہوئے اس سے کہا۔ "نوری! میں تمہیں اپنے کوارٹر کے اندر بلا لوں گا لیکن تمہیں پہلے بتانا ہو گا، تمہارے تھانے میں جانے سے کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے؟"

ایک لمحے کے لئے وہ مجھے متامل نظر آئی پھر بولی۔ "جناب! میں اس وقت جس شخص کی شکایت لے کر آپ کے پاس آئی ہوں وہ ادھر تھانے میں موجود ہے۔"

اس کے انکشاف نے چونکانے کے ساتھ ہی مجھے تذبذب میں بھی ڈال دیا۔ "تم کس شخص کی بات کر رہی ہو؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"وہ......وہ ہے نا اپنا مصطفیٰ!" اس نے جواب دیا۔

"مصطفیٰ!" میں نے زیرِ لب دہرایا۔ "کیا وہ اس علاقے کا کوئی غنڈا بدمعاش ہے جو تم اس سے اس قدر خوف زدہ نظر آ رہی ہو؟"

"جناب! مصطفیٰ میرے خاوند کا نام ہے۔" نوری نے بتایا۔ "اگر اس نے مجھے تھانے میں دیکھ لیا تو بس پھر میری خیر نہیں۔ وہ میری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دے گا۔"

اس کی خوف زدگی پر مجھے دل ہی دل میں بہت ہنسی آئی۔ تاہم میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔ "نوری! بتاؤ، اس تھانے کا انچارج کون ہے؟"

"آپ ہیں جناب! اور کون ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں تھانے دار ہوں تو پھر تھانے داری بھی میں ہی کروں گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں اپنے خاوند سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"جناب! وہ خاوند تو بعد میں ہے، پہلے پولیس والا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "ہے تو ایک معمولی سا سپاہی لیکن کسی حوالدار سے بھی زیادہ رعب جماتا ہے۔"

اس کی وضاحت سے میں چونکا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تمہارا گھر والا بھی پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتا ہے؟ یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"کک......کیا آپ مصطفیٰ کو نہیں جانتے؟" وہ حیرت سے بولی۔ "وہ تو آپ کے عملے میں شامل ہے......کانسٹیبل مصطفیٰ......!"

"اوہ!" میں نے متاسفانہ انداز میں ایک گہری سانس لی۔ "تم بھی رات میں بجھارتیں ڈالنے آئی ہو۔ بات کو اتنا گھما پھرا کر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھی سیدھی طرح کہہ سکتی تھیں، تم کانسٹیبل مصطفیٰ کی بیوی ہو!"

"غلطی ہوگئی تھانے دار جی!" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "دراصل میں بہت پریشانی میں یہاں آئی تھی اس لئے شاید صحیح طریقے سے اپنا مقصد آپ کو بتا نہیں سکی۔" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ "اب تو آپ میری مجبوری کو سمجھ گئے ہیں ناں؟"

نوری نے آخری جملہ اس انداز میں ادا کیا جیسے کہہ رہی ہو، میری مجبوری سمجھ میں آ گئی ہے تو مجھے اپنے کوارٹر کے اندر آنے کی اجازت دے دیں......! بات ختم کر کے وہ ایک مرتبہ پھر اضطراری اور فکرمندانہ نظر سے گردونواح کا جائزہ لینے لگی۔

میں نے ایک لمحہ اس کی درخواست پر غور کیا پھر اس کی مجبوری اور پریشانی دیکھتے ہوئے اسے کوارٹر کے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ پتہ نہیں، بے چاری اپنے شوہر کا کون سا دُکھڑا رونے آئی تھی!

وہ مئی کے آخری ایام تھے۔ دن کے ساتھ ساتھ رات بھی اچھی خاصی گرم ہونے لگی تھی۔ میں نے سونے کے لئے صحن میں چارپائی ڈال رکھی تھی۔ ان دنوں کمرے میں سونا تو گویا جہنم کے دروازے پر بیٹھ کر زندگی گزارنے کے مترادف تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے صحن میں سونا قدرے سکون بخش تھا۔ میں نے نوری کو اسی چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہا جو میں نے اپنے سونے کے لئے بچھا رکھی تھی اور خود اس کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں داخل ہوگیا۔

نوری کو کوارٹر کے اندر لاتے ہوئے میں نے احتیاطاً بیرونی دروازے کو اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ دروازے کے کواڑ نیم وا انداز کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے کمرے سے ایک کرسی نکالی اور باہر آ گیا۔ اس کے بعد میں نے اس کرسی کو چارپائی کے نزدیک بچھایا اور نوری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "ہاں، اب بتاؤ کہ تمہیں مصطفیٰ سے کون کون سی شکایت ہے؟"

اس نے شکایات کا ایک بڑا سا گٹھڑ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے بڑی توجہ سے اس کی بپتا سنی۔ اس کے بیان میں کوئی بھی غیر معمولی اور نہایت اہم نکتہ مجھے نظر نہ آیا۔ وہ عام سے شکوے گلے تھے جو عموماً بیویوں کو اپنے شوہروں سے ہوتے ہیں۔ مثلاً مصطفیٰ اس کا خیال نہیں رکھتا۔ وہ کوئی جائز فرمائش بھی کر دے تو چیخنے چلانے لگتا ہے اور اگر اس کا غصہ حد سے بڑھ جائے تو مار پیٹ پر بھی اتر آتا ہے۔ وہ بڑے وحشیانہ انداز میں ہاتھ پاؤں چلا کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ دوسری عورتوں میں بھی دلچسپی لیتا ہے اور اپنی تنخواہ کا

بیشتر حصہ وہ نامحرم پرائی عورتوں پر لٹا دیتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

نوری کی پوری بات سننے کے بعد میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں مصطفیٰ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے، وہ آئندہ تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔"

"تھانے دار جی! مجھ پر بات نہ آئے۔" وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔ "اگر مصطفیٰ کو پتہ چل گیا کہ میں نے آپ سے اس کی شکایت کی ہے تو وہ کُوٹ کُوٹ کر میری ہڈیوں کا سُرمہ بنا دے گا۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بڑے طریقے، سلیقے سے اس سے بات کروں گا۔ تمہاری جانب اس کا شک نہیں جائے گا۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار جی!" وہ ایک پُرسکون سانس خارج کرتے ہوئے دعائیہ انداز میں بولی۔ "آپ مجھے کوئی نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں ورنہ وہ پہلے والے تھانیدار......"

نوری بولتے بولتے رک گئی۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا ہوا پہلے والے تھانے دار کو؟"

اس کا ادھورا اشارہ سابق انچارج رفیق سیال کی طرف تھا۔ اگرچہ میں اس کا اشارہ پوری طرح سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی اپنے اندازے کی تصدیق ضروری سمجھی۔ اس نے تھوڑے تامل کے بعد میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ سابق تھانہ انچارج کے لئے اس کے انداز سے نفرت جھلکتی تھی۔

"میں ایک روز مصطفیٰ کی یہی شکایت لے کر اس تھانے دار کے پاس بھی آئی تھی۔ اس نے میری تو پتہ نہیں، سنی یا نہیں سنی البتہ اس دوران وہ ہوس بھری نظر سے میرے سراپا کو کھوجتا رہا۔ لگتا تھا، کمبخت نے زندگی میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی۔"

وہ لمحے بھر کے توقف کے بعد تلخی سے بولی۔ "میں تو اس کے پاس آ کر ہی پچھتا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مصطفیٰ کو ایک دن میں سیدھا کر کے رکھ دے گا۔ تھانے دار جی! عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ خاص طور پر مرد کے حوالے سے یہ کچھ زیادہ ہی تیزی دکھاتی ہے۔ میں نے اس تھانے دار کی آنکھوں میں ہوس کے سائے لہراتے ہوئے دیکھ لئے تھے اس لئے فوراً سمجھ گئی، وہ مجھ سے کھوکھلا وعدہ کر رہا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے جانے لگی تو اس کی نیت کھل کر سامنے آ گئی۔ بھوکی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"نوری! تمہاری تو قسمت پھوٹ گئی۔ پتہ نہیں، تمہارے ماں باپ نے کیا دیکھ کر تمہیں

مصطفیٰ کے پلے باندھ دیا ہے، تمہارے سامنے تو وہ بالکل لنگور لگتا ہے۔ ہیرے جیسی لڑکی کو رول دیا بے وقوف والدین نے۔ تمہاری قدر و قیمت تو صرف میرے جیسا کوئی جوہری ہی جان سکتا ہے۔" پھر وہ بڑے بھونڈے انداز میں ہنسا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ "مجھے امید ہے، تم آتی جاتی رہو گی!"

اس سے زیادہ کھلے الفاظ میں وہ شیطان اپنے عزائم کا اظہار کیا کرتا؟ میں نے اس کی نیت کو بھانپ لیا۔ ان لمحات میں مجھے اپنی حماقت پر سخت غصہ آ رہا تھا، میں وہاں جا کر پچھتا رہی تھی۔ میں نے یہی سوچا کہ اس خبیث کے سامنے گرمی دکھانا مناسب نہیں ہو گا اس لئے کسی طرح سچا جھوٹا یقین دلا کر میں نے اس سے جان چھڑائی اور گھر آ گئی۔

اس شیطان کی اولاد نے بعد میں مصطفیٰ کو پتہ نہیں، کیا پٹی پڑھائی کہ وہ اور ہی زیادہ میرا دشمن ہو گیا۔ اب تو وہ بچوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ ان معصوموں کے سامنے ہی مجھے رُوئی کی طرح پنج کر رکھ دیتا ہے۔ ننھے ذہن اس کے رویے سے سخت خوف زدہ ہیں۔ مصطفیٰ کا نام سنتے ہی ان کے چہرے اس طرح وحشت زدہ ہو جاتے ہیں جیسے کوئی خطرناک ڈاکو انہیں تہس نہس کرنے آ رہا ہو!"

بات کے اختتام تک اس کی آواز اچھی خاصی بھیگ گئی مجھے وہ خاصی دکھی اور مصیبت زدہ عورت محسوس ہوئی۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے اس سے پوچھا۔

"نوری! مصطفیٰ سے تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"دو مہینے پہلے ساتواں سال لگا ہے جی!"

"کیا وہ شروع ہی سے ایسا ہے؟"

"شادی کے بعد ایک سال تک وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہا تھا۔" نوری نے بتایا۔ "مارنے کوٹنے اور چیخنے چلانے والا مرض بعد میں پیدا ہوا ہے۔ اب تو میں اتنی تنگ آ گئی ہوں کہ جی چاہتا ہے، نہر میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دوں۔ لیکن معصوم بچوں کی محبت مجھے ایسا نہیں کرنے دیتی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تمہارے کتنے بچے ہیں نوری؟" میں نے استفسار کیا۔

اس نے جواب دیا۔ "دو ...... بچہ بڑا ہے، اس کی عمر پانچ سال ہے۔ بچی اس سے چھوٹی اور تین سال کی ہے۔" پھر اس نے مجھے اپنے بچوں کے نام جاوید اور نگہت بتائے۔

ایک سوال کافی دیر سے میرے ذہن میں چکرا رہا تھا اور اس کی چکراہٹ میری سوچ کو الجھا رہی تھی۔ میں نے اس پھانس کو نکالنے کی خاطر نوری سے پوچھ لیا۔

"تمہیں سابق تھانے دار کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود بھی تم تاریک رات میں تن تنہا اپنے خاوند کی شکایت لے کر میرے پاس آ گئی ہو۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر میں بھی اس شخص کی طرح ہوس کا پجاری ثابت ہوا تو پھر تم کیا کرو گی؟"

اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔ "تھانے دار جی! آپ کو ہمارے علاقے میں آئے ہوئے ابھی دو دن ہی ہوئے ہیں لیکن لوگوں کو آپ کے بارے میں بہت کچھ پتہ چل چکا ہے، خاص طور پر آپ کی ایمانداری، شرافت اور انصاف پسندی کے قصے چاروں طرف گردش کر رہے ہیں۔ مجھے تو مصطفیٰ نے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہر انسان کو اپنی قبر میں جانا ہے اس لئے حق، سچ بات کرنا چاہئے۔ مصطفیٰ کی دیگر بری عادتیں اور غصہ اپنی جگہ لیکن اس کی اس خوبی کو میں تسلیم کرتی ہوں کہ وہ ایک فرض شناس اور محنتی پولیس والا ہے۔ اس نے ہمیشہ قانون کا ساتھ دیا ہے اور قانون توڑنے والوں کے ہاتھ پاؤں توڑنے سے کبھی دریغ نہیں کیا اس لئے پچھلے تھانے دار سے اس کی کبھی نہیں بن سکی۔ آپ کے آنے پر مصطفیٰ نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بتایا ہے کہ اب اس علاقے اور علاقے کے تھانے کا ہر بگڑا تگڑا معاملہ الف کے مانند سیدھا ہو جائے گا۔ میں نے سوچا..."

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "میں نے سوچا دوسرے معاملات کو تو آپ سیدھا کرتے ہی رہیں گے، کیوں نہ میں سب سے پہلے اس مصطفیٰ ہی کو سیدھا کروا لوں ...... اور جہاں تک آپ کی ذات پر بھروسہ کرنے کی کوشش ہے تو اس کے لئے میں یہی کہہ سکتی ہوں، میرے دل نے گواہی دی تھی کہ آپ ایک اچھے اور نیک دل انسان ثابت ہوں گے اور دیکھ لیں......" اس نے ایک مرتبہ پھر بات کو نامکمل چھوڑا اور طویل سانس خارج کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"دیکھ لیں تھانے دار جی! میرے دل کی گواہی کتنی سچی ثابت ہو رہی ہے۔ اگرچہ میں نے اس وقت اپنے جسم کو ایک بڑی چادر میں اچھی طرح لپیٹ رکھا ہے اس کے باوجود بھی آپ نے ایک مرتبہ بھی آنکھیں پھاڑ کر یا نظر بھر کے مجھے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔"

اس نے بڑی گہری بات کی تھی۔ میں نے دو چار مرتبہ تنقیدی نظر سے اسے دیکھا ضرور تھا، خاص طور پر جب کھلے ہوئے دروازے میں پہلی مرتبہ اس پر میری نظر پڑی تھی۔ لیکن یہ جائزہ اس دیکھنے کے زمرے میں نہیں آتا تھا جس کا حوالہ نوری نے دیا تھا۔ یہ سچ ہے، عورت مرد کی نگاہ اور نیت کو بھانپنے میں کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔ پتہ نہیں، یہ اس کی چھٹی حس کا اعجاز ہے

یا پھر ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں بھی اس کے لئے ہر لمحہ آمادۂ تعاون رہتی ہیں۔

نوری دس منٹ کا کہہ کر میرے کوارٹر میں آئی تھی اور اب اسے یہاں بیٹھے ہوئے لگ بھگ آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا لیکن اس دوران میں یا تو صرف اس کی آنکھوں کو دیکھ سکا تھا یا پھر ایک مرتبہ اس کا بایاں ہاتھ لمحاتی طور پر چادر سے باہر نکل آیا تھا اور میں اس ہاتھ کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ نوری نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت میں چاندی کا ایک چھلا پہن رکھا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے سرخ نگینے جڑے ہوئے تھے۔ نوری کی آنکھوں کا رنگ بادامی تھا۔

رات اپنے سفر کو تیزی سے آگے بڑھا رہی تھی لہٰذا میں نے نوری سے کہا۔ ''اب تم بے فکر ہو کر اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں جلد از جلد تمہارے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ''تھانے دار جی! مصطفیٰ کو میرے یہاں آنے کے بارے میں سن گن نہیں ملنی چاہئے۔''

''میں نے کہا ہے ناں، تم ہر حوالے سے مطمئن ہو کر یہاں سے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں بڑی سیاست سے اس معاملے کو نمٹا دوں گا۔''

اس نے ممنونیت بھرے انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لئے مڑی۔

میں نے اپنی معلومات کی غرض سے پوچھ لیا۔ ''تم لوگ احمد نگر کے کس حصے میں رہتے ہو؟''

میں جس قصبے میں تھانے دار بن کر پہنچا، اس کا نام احمد نگر تھا۔ اس قصبے کے درمیان سے ایک بڑی نہر شرقاً غرباً گزرتی تھی جس نے احمد نگر کو شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس نہر کے آس پاس کا سارا علاقہ بہت زرخیز تھا۔ دور تک سرسبز کھیت مسکراتے لہلہاتے دکھائی دیتے۔ البتہ احمد نگر کے جنوب مشرق میں ان کھیتوں کے آگے ایک گھنا جنگل واقع تھا جس سے متعلق عجیب و غریب کہانیاں مشہور تھیں۔ نوری نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''ہم جی، احمد نگر جنوبی میں رہتے ہیں۔''

میرا تھانہ احمد نگر شمالی میں واقع تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ نہر کا پل عبور کر کے وہاں پہنچی تھی۔ احمد نگر کے قریب سے ایک پختہ سڑک گزرتی تھی جس پر چھوٹا بڑا ہر نوعیت کا ٹریفک دیکھنے کو مل جاتا تھا۔ یہ سڑک نہر کے اوپر ایک ''کراس'' بناتے ہوئے جاتی تھی۔ یعنی سڑک کا رخ شمالاً جنوباً تھا۔ نہر کا پل ایک طرح سے شمالی اور جنوبی احمد نگر کو ملانے کا باعث بھی تھا۔

ملن اور جدائی کے معاملات میں پلوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ دو بچھڑے ہوؤں کے بیچ

چاہے فاصلوں کی کتنی بڑی بھی خلیج حائل کیوں نہ ہو، ایک پل انہیں ایک دوسرے کی بانہوں میں لے آتا ہے۔ محبت کرنا ایک عظیم کام ہے اور محبت کرنے والے لائق ستائش۔ لیکن دو محبت کرنے والوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرنے والے شخص کی عظمت کی ناپ تول ممکن نہیں......!

نوری کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اپنے خاوند کی جو شکایت لے کر میرے پاس آئی تھی وہ انتہائی معمولی نوعیت کی تھی لیکن اس کی ہمت، کوشش اور انداز منفرد اور غیر معمولی تھا۔ رات کی تاریکی میں کسی عورت سے اتنی بڑی جرأت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

تھانے سے اٹھتے وقت میں چند اہم فائلیں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ سوچا تھا، سونے سے پہلے ان کا مطالعہ کروں گا۔ اس مقصد کے لئے میں نے وہ فائلیں اپنی چارپائی کے نزدیک ایک چھوٹی میز پر رکھ دی تھیں۔ لیکن اب انہیں اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کیں اور چند لمحات کے بعد نیند سے گلے جا ملا۔

٭٭٭

آئندہ روز میں جیسے ہی تھانے پہنچا، میں نے کانسٹیبل مصطفیٰ کو اپنے کمرے میں بلا لیا لیکن مجھے بتایا گیا کہ مصطفیٰ تھانے میں موجود نہیں۔ میں نے یہ اطلاع دینے والے سے پوچھا۔ ''کیا وہ صبح ہی صبح گھر چلا گیا ہے؟''

''جناب! ابھی تو وہ تھانے پہنچا ہی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''گھر تو وہ کل رات کو گیا تھا۔''

کانسٹیبل کا جواب مجھے ہضم نہیں ہوا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا رات کو میرے اٹھنے کے بعد اس نے بھی چھٹی کر لی تھی؟''

''جناب! مصطفیٰ کی آج کل دن کی ڈیوٹی ہے۔'' کانسٹیبل نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے میں کسی نئے نئے امیر یا نئے نئے فقیر کا کردار ادا کر رہا ہوں۔ ''وہ کل رات کو آپ کے اٹھنے سے پہلے ہی گھر جا چکا تھا۔''

میں الجھ کر رہ گیا۔ مصطفیٰ کی بیوی نوری رات دس بجے میرے کوارٹر پر آئی تھی اور وہ تھانے کا رخ محض اس لئے نہیں کرنا چاہ رہی تھی کہ وہاں اس کا خاوند مصطفیٰ موجود تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا، مصطفیٰ کی ڈیوٹی رات کی تھی لیکن میرے سامنے کھڑا کانسٹیبل کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ میں نے اپنی الجھن کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور چہرے کے تاثرات پر

قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ مصطفیٰ جیسے ہی تھانے پہنچے، اسے میرے پاس بھیج دینا۔ مجھے اس سے ایک ضروری کام ہے۔''

کانسٹیبل نے ایڑی بجائی۔ ''اوکے سر!'' اور کمرے سے نکل گیا۔

اس تھانے کی انچارج سنبھالے آج مجھے تیسرا دن تھا۔ میں تھانے کے اسٹاف سے فرداً فرداً مل چکا تھا اور ان کی ذمہ داریاں بھی میرے علم میں آ چکی تھیں۔ ہوسکتا ہے، نیا نیا ہونے کی وجہ سے میں بھول گیا ہوں یا ابھی ذہن نشین نہ ہوا کہ کہ میرے تھانے کے کس شخص کی ڈیوٹی دن کی ہے اور کس کی رات کی۔ لیکن مصطفیٰ کی بیوی تو اس معاملے میں غلطی نہیں کرسکتی تھی۔ اگر اس نے کہا تھا، مصطفیٰ ڈیوٹی پر ہے تو اس کا مطلب تھا، اس کی ڈیوٹی رات کی تھی...... اور اگر ایسا نہیں تھا تو پھر نوری نے جھوٹ بولا تھا۔ اب یہ سوال سر اٹھا کر کھڑا ہوگیا کہ نوری کو جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

میں اس ممکنہ سوال کے ممکنہ جواب یا جوابات پر غور کر ہی رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا، مصطفیٰ نے تھانے میں قدم رکھ دیا ہے۔ بتانے والے کو میں نے حکم دیا کہ وہ مصطفیٰ کو فوراً میرے کمرے میں بھیج دے۔ چند لمحات کے بعد مصطفیٰ میرے سامنے موجود تھا۔

اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ یہی کانسٹیبل مصطفیٰ ہے۔ مصطفیٰ کی عمر اٹھائیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ متناسب جسامت کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے چہرے پر مناسب سائز کی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ پیشانی کی لکیروں اور آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا، وہ ایک غصیلا اور کڑک شخص ہوگا۔ اس حوالے سے نوری کی شکایت میں وزن نظر آتا تھا۔

مصطفیٰ نے نہایت ہی سنجیدہ انداز میں مجھے سلام کیا اور بولا۔ ''ملک صاحب! آپ نے مجھے کسی ضروری کام سے بلایا ہے!''

اس کی سنجیدگی اور متانت کو دیکھ کر میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ ''تم بیٹھو گے تو ضروری کام بتاؤں گا نا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

وہ خاموشی سے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ ''مصطفیٰ! تمہاری ڈیوٹی رات کی نہیں تھی؟''

''نو سر!'' وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''پچھلے کچھ عرصے سے میں دن میں ڈیوٹی دے

رہا ہوں۔''

مصطفیٰ کے اس سنجیدہ جواب نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ اگر وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا تو پھر نوری نے دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ مصطفیٰ کی بات کی تو تھانے کا پورا عملہ گواہی دے سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا، نوری نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر کیوں؟''

اس ''کیوں'' کا جواب یا تو نوری دے سکتی تھی اور یا پھر مصطفیٰ۔ میں مصطفیٰ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے الجھن بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! سب خیریت تو ہے ناں؟'' اس کے انداز میں تشویش جھلکتی تھی۔

میں یہ تو سمجھ گیا کہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے لیکن کیا گڑبڑ ہے، اس کو سامنے لانا ابھی باقی تھا۔ میں نے مصطفیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ خیریت نہیں ہے تو؟''

''تو ......تو میں کیا بتا سکتا ہوں جناب؟'' وہ حیرت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''تو ......تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ گزشتہ رات دس بجے تم کہاں تھے؟''

اس نے متاملانہ نظر سے مجھے دیکھا اور جواب دیا۔ ''اس وقت میں اپنے گھر میں تھا جنابِ عالی!''

''تم احمد نگر جنوبی میں رہتے ہو ناں؟'' میں نے اپنی تصدیق کی خاطر اس سے پوچھ لیا۔

اس نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹائیں اور جواب دیا۔ ''جی ہاں، جی ہاں!''

''تمہارے گھر میں تو سب خیریت ہے ناں مصطفیٰ؟'' میں نے پوچھا۔

''جی، میرے گھر والے سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

''بیوی بچے سب راضی خوشی ہیں؟''

''بیوی...... بچے......؟''

مصطفیٰ نے یہ دونوں الفاظ اتنی حیرت سے دہرائے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کسی ان دیکھی، ان سنی مخلوق کا ذکر کردیا ہو۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی رسانیت سے کہا۔

''میں تمہارے بچوں جاوید اور نگہت کی بات کر رہا ہوں۔''

''بچے؟'' اس نے مضحکہ خیز انداز میں دہرایا پھر مجھ سے پوچھ بیٹھا۔ ''ملک صاحب! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے لیکن یہ تو بتائیں، بغیر شادی کئے بچے کیسے ہوسکتے ہیں؟''

''کیا تم شادی شدہ نہیں ہو؟'' میں نے تعجب خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اتنا خوش قسمت کہاں جناب!'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''تین مرتبہ منگنی ہو کر ٹوٹ چکی ہے۔ آپ تو مجھے شادی کی بشارت دے رہے ہیں۔ نہ صرف شادی کی بلکہ دو بچوں کی خوش خبری بھی سنا رہے ہیں۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''لگتا ہے، کسی مخالف نے میرا مذاق بنانے کے لئے آپ کو میرے بارے میں غلط سلط بتایا ہے۔ اگر آپ کو میری بات پر اعتبار نہ آ رہا ہو تو میں گواہی کے لئے چاچا، چاچی کو تھانے لا سکتا ہوں۔''

اس کی جینوئن سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہو گیا، وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اتمام حجت کے طور پر میں نے اسے پوچھ لیا۔

''کیا نوری تمہاری بیوی نہیں ہے؟''

''نہ نوری اور نہ ہی کوئی غفوری!'' وہ قطعیت سے بولا۔

اب تو مجھے یقین ہو گیا، اپنا نام نوری بتا کر جس عورت نے گزشتہ رات میرے کوارٹر میں مجھ سے ملاقات کی تھی وہ کوئی بہت ہی بڑا ڈرامہ تھی۔ اس نے یہ ناٹک کسی خاص مقصد کے تحت کیا تھا۔ کس مقصد کے تحت؟ فی الحال، اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ اس لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ سر دست میں مصطفیٰ کو نوری کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا تاوقت یہ کہ اس کے ڈرامے کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہ لگ جائے۔

''ملک صاحب! یہ نوری کون ہے؟'' مصطفیٰ نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔ ''اور آپ نے میرے جن دو بچوں جاوید اور نگہت کا ذکر کیا ہے وہ آپ کو کہاں ملے تھے؟''

مجھے فی الحال مصطفیٰ کو ان سوالات کے جوابات نہیں دینا تھے اس لئے میں نے اسے بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا اور کہا۔ ''میں یہ پیش گوئی کر رہا تھا، تمہاری شادی نوری نامی لڑکی سے ہو گی جس سے تمہارے دو بچے جاوید اور نگہت پیدا ہوں گے۔ کیا سمجھے؟''

''آپ کے منہ میں گھی شکر ملک صاحب!'' وہ وفورِ مسرت سے کھل اٹھا پھر یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ تھانے داری کے ساتھ ساتھ نجوم وغیرہ کا کام بھی کرتے ہیں؟''

مصطفیٰ نے یہ سوال میری پیش گوئی کے حوالے سے کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں نجوم اور علمِ نجوم کو مانتا ہوں۔ لیکن نجومی نہیں ہوں۔ جس طرح ہر علم کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسے ہی علم

نجوم کی بھی حدود و قیود مقرر ہیں اور سچے اہلِ علم ان سرحدوں کو کبھی نہیں پھلانگتے۔ اس نوعیت کی چھلانگ کارخانۂ قدرت میں مداخلت کے مترادف ہے۔ سمجھ دار ماہر نجوم بڑی دانش مندی سے اپنی زبان کا استعمال کرتا ہے۔ اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ بھی کسی کو جواب دہ ہے۔ وہ محض راہ نمائی کرتا ہے لیکن جو مستند نجومی نہیں ہوتے وہ علم کی عزت و توقیر کو نظر میں نہیں رکھ سکتے۔ انہیں صرف اپنے ذاتی مفاد سے غرض ہوتی ہے۔ وہ اپنے پاس آنے والے پریشان حال لوگوں کا پیٹ کاٹ کر اپنا پیٹ بھرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ وہ ستاروں سے متعلق اتنی بے تکلفی سے بات کرتے ہیں جیسے وہ ان کے آباد و اجداد میں سے ہوں۔ بے چارے ستاروں کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ نام نہاد نجومی کس طرح ان کی مٹی خراب کر رہے ہیں تو ہو سکتا ہے وہ غیرت کے مارے آسمان پر ہی خود کشی کر لیں اور ان کے بے جان، بے نور لاشے قادرِ مطلق سے بہ زبانِ خاموشی یہ سوال کر رہے ہوں ...... کیا تم نے انسان کو اسی لئے اشرف المخلوقات بنایا تھا کہ وہ آفاقی مشعلوں پر بہتان باندھتا رہے؟ ہم تو قندیلِ راہ بانی ہیں، مشعلِ آسمانی ہیں۔ حضرتِ انسان کے ہاتھوں بے توقیری سے تو اچھا ہے، ہم بجھ جائیں!''

میں لمحہ بھر کو متوقف ہوا تو مصطفیٰ کو ایک محویت کے عالم میں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔

میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس لئے بے بہرہ و بے ضمیر قسم کے جھوٹے نام نہاد نجومیوں کو ہمیشہ یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اپنی دکان داری چمکانے اور مصیبت زدہ افراد کو خوف زدہ کر کے لوٹنے کے لئے وہ ستاروں سے منسوب کر کے جو بھی الٹی ٹیڑھی کہانیاں بیان کرتے ہیں وہ ایک دن انہی پر الٹ سکتی ہیں۔ کاتبِ تقدیر نے ان کا مقسوم بھی کسی ستارے کو تھما رکھا ہے۔ وہ ستارہ اپنے قبیلے کی بے عزتی برداشت نہیں کرے گا اور ایک دن تنگ آ کر وہ انہیں ایسے عذاب میں مبتلا کر دے گا کہ ان کی زندگی نمونۂ جہنم بن کر رہ جائے گی ...... لیکن افسوس کہ ایسے مُردہ ضمیروں کا دیدۂ عبرت اس وقت بھی وا نہیں ہوتا اور وہ اپنی تباہی و بربادی کا الزام دوسروں پر تھوپتے نظر آتے ہیں۔''

''ملک صاحب!'' میں خاموش ہوا تو مصطفیٰ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ تھانے دار ہیں یا نجومیوں کے محتسب! مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے، اللہ نے آپ کو نام نہاد نجومیوں کے احتساب کے لئے خاص طور پر پیدا کیا ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نام نہاد شخص چاہے زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہو، وہ غلط کام ہی کر رہا ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، وہ کسی نہ کسی جرم میں مبتلا ہوتا ہے اور ...... ہر قسم کے مجرموں کی سرکوبی کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ اب تو تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے

میں یہاں صرف تھانے داری کرنے آیا ہوں۔"

"جی ملک صاحب! بالکل سمجھ میں آ گیا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ کے سائے تلے کام کر کے مجھے بہت کچھ سمجھنے اور سیکھنے کو ملے گا۔"

میں نے زاویہ تبدیل کرتے ہوئے اس سے پوچھ لیا۔ "سیکھنے اور سکھانے کا کام تو جاری رہے گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم اپنے چاچا، چاچی کو گواہی کے لئے کیوں تھانے لا رہے تھے؟ تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی کہاں ہیں؟"

میرے سوال کے جواب میں اس نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ مصطفیٰ، احمد نگر جنوبی میں اپنے چاچا اسحاق اور چاچی مریم کے پاس رہتا تھا۔ اسحاق اور مریم ایک عمر رسیدہ بے اولاد جوڑا تھے۔ مصطفیٰ محض ان کی تنہائی دور کرنے کے لئے ان کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا اپنا گھر احمد نگر سے شمال میں واقع ایک گاؤں گھمن پورہ میں تھا۔ اس کا باپ اشفاق، گھمن پورہ میں زمینداری کرتا تھا۔ مصطفیٰ سے چھوٹا ایک بھائی اور ایک بہن تھی اور ان دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ مصطفیٰ کا بھائی مرتضیٰ گھمن پورہ ہی میں رہتا تھا اور کھیتی باڑی میں اپنے باپ کا بھرپور ہاتھ بٹاتا تھا۔ مرتضیٰ کا ایک تین سالہ بیٹا رضوان تھا۔ مصطفیٰ مہینے میں ایک آدھ چکر گھمن پورہ کا لگا لیا کرتا تھا۔

اس تناظر میں نوری اور اس کا شبینہ ڈرامہ سراسر فراڈ دکھائی دیتا تھا۔ کوئی شخص جب فراڈ کرتا ہے تو اس کے پیچھے اس کا کوئی ظاہری یا پوشیدہ مقصد ضرور ہوتا ہے۔ نوری اپنا کون سا مقصد حاصل کرنے کے لئے گزشتہ رات میرے کوارٹر پر آئی تھی، یہ جاننے کے لئے میں نے مصطفیٰ سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ مجھے خاصا معقول، سلجھا ہوا اور بردبار شخص دکھائی دیا تھا۔

لیکن مجھے اپنے ارادے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ کیونکہ اسی وقت ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آ کر اطلاع دی۔

"ملک صاحب! جنوبی میں ایک عورت کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

جنوبی سے اس کی مراد احمد نگر جنوبی تھی۔ قصبے کے ان دونوں حصوں کو عموماً شمالی اور جنوبی کہا جاتا تھا۔ مصطفیٰ چونکہ جنوبی سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کے کان کچھ زیادہ ہی کھڑے ہو گئے۔ میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔

"قتل ہونے والی عورت کون ہے؟"

"ابھی تک اس کی شناخت نہیں ہو سکی۔" اس نے بتایا۔ "اس کی لاش ادھر کھیتوں میں

پڑی ہے۔"

میں نے تمام موضوعات کو لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور کانسٹیبل مصطفیٰ کو اپنے ساتھ لے کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ نوری اور اس کے کارنامے پر بعد میں بھی بات ہو سکتی تھی۔ اس عورت کا قتل اس سے کہیں زیادہ سنگین معاملہ تھا۔ جلد ہی ہم وقوعہ پر پہنچ گئے۔

جنوبی (احمد نگر جنوبی) سے اگر مزید جنوب کی طرف جائیں تو کھیتوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ تھا۔ اس کے بعد جنوب مشرق کی سمت میں گھنا جنگل شروع ہو جاتا۔ یہ جنگل مشرقی رخ میں پھیلتے پھیلتے بالآخر آگے جا کر بڑی نہر کے قریب پہنچ جاتا تھا۔ جائے وقوعہ لہلہاتے کھیتوں اور جنگل کے درمیان تھی۔ وہاں چند مقامی لوگ جمع تھے۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور لاش کے قریب پہنچ گیا۔

وہ ایک جواں سال عورت کی لاش تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہو گی۔ جسم مائل بہ فربہی۔ اس نے سفید شلوار کے اوپر پھول دار قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں عام سی زنانہ سینڈل تھی۔ اس سینڈل کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال سرسرایا لیکن یہ خیال اتنا غیر واضح تھا کہ میں اس پر توجہ نہ دے سکا۔ میں اکڑوں بیٹھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

لاش اس وقت جہاں پڑی تھی اس جگہ کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت نہ ہوئی کہ اس عورت کو قتل بھی وہیں پر کیا گیا تھا۔ عورت کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ گردن کٹنے سے بے تحاشا خون کا اخراج ہوا تھا اور اس کی گواہی ان کھیتوں کی زمین دے رہی تھی۔ کوئی نہایت ہی تیز دھار آلہ اس بدقسمت کی گردن پر آزمایا گیا تھا۔ اس کی لاش کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ بلاشبہ ایک حسین اور پُرکشش عورت رہی ہو گی لیکن موت کے بے رحم تھپیڑے نے اس کی ساری خوبصورتی اور رعنائی کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ موت ایک سنگین اور سفاک حقیقت ہے جس کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی۔

میں عورت کی لاش کا معائنہ کر ہی رہا تھا کہ ایک چیز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس عورت نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت میں چاندی کا ایک چھلا پہن رکھا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے سرخ نگینے جڑے ہوئے تھے۔ اس چھلے کو دیکھ کر میرے ذہن میں روشنی کا تیز جھماکا ہوا اور پلک جھپکتے میں مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اس چھلے کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مقتولہ کی سینڈل والا اچنبھا بھی سمجھ میں آ گیا۔ میرے دل نے پکار کر کہا، میں نوری کی لاش پر کھڑا ہوں۔

میں نے مزید تصدیق کی خاطر اس کی آنکھوں کو کھول کر دیکھا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو

گئی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بادامی تھا۔ گزشتہ رات جب وہ میرے کوارٹر پر آئی تھی تو میں نے اس کی سینڈل، آنکھیں اور چاندی کا یہی چھلا دیکھا تھا۔ یہ چھلا بھی ایک اتفاق کے تحت مجھے اس کے بائیں ہاتھ میں نظر آ گیا تھا ورنہ اس اللہ کی بندی نے تو خود کو اس طور سرتاپا چادر میں لپیٹ رکھا تھا کہ اس کا ایک رواں بھی دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں پر جمع ہونے والے افراد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا۔ ''تم میں سے کوئی شخص اس عورت کو جانتا ہے؟''

سب نے نوری کی لاش کی طرف دیکھا، اس کے بعد وہ سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، پھر نفی میں گردنیں ہلاتے ہوئے لاش کی شناخت سے انکار کر دیا۔ اگر وہ لوگ نوری کو نہیں جانتے تھے تو اس کا یہی مطلب تھا، نوری کا تعلق احمد نگر جنوبی سے نہیں تھا۔

اس صورتِ حال نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا دیا۔ نوری گزشتہ رات اپنی مظلومیت کی دکھ بھری داستان سنانے میرے پاس آئی تھی اور اس نے خود کو کانسٹیبل مصطفیٰ کی بیوی ظاہر کیا تھا۔ نہ صرف بیوی بلکہ وہ خود کو مصطفیٰ کے دو بچوں جاوید اور نگہت کی ماں بھی کہہ رہی تھی۔ جب کہ مصطفیٰ بے چارے کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ابھی تک مصطفیٰ کو نوری کی اسٹوری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اب بتانے کا وقت آ گیا تھا۔ میں تھانے میں مصطفیٰ سے گفتگو کرتے ہوئے اسی طرف آ رہا تھا کہ عورت کے قتل کی اطلاع نے اس موضوع کو موقوف کرنے پر مجبور کر دیا۔

مصطفیٰ سے بات کرنے سے پہلے میں نے ایک انتہائی ضروری کام کی طرف توجہ دی وہاں موجود لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

''تم سب لوگ جنوبی کے رہنے والے ہو یا تم میں سے کوئی بندہ شمالی سے بھی تعلق رکھتا ہے؟''

جواب میں مجھے بتایا گیا، وہ سب افراد جنوبی سے تعلق رکھتے تھے۔

میں نے ایک نوجوان کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ''جوان! تمہارا نام کیا ہے؟''

''فرزند علی!'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''فرزند علی! تم بھاگ کر احمد نگر شمالی جاؤ اور وہاں سے چار پانچ بندوں کو اپنے ساتھ لے کر فوراً یہاں آ جاؤ تاکہ لاش کی شناخت کا مسئلہ تو حل ہو۔''

''اچھا جی، میں جاتا ہوں۔'' وہ بڑے عزم سے بولا۔

میں نے تاکید کی۔ ''دیر نہیں ہونی چاہئے۔ فٹافٹ جاؤ اور فوراً سے پیشتر آؤ۔''

''ہُنے گیا تے ہُنے آیا جی۔'' اس نے چٹکی بجائی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں پھر ان لوگوں کی طرف مڑا اور پوچھا۔ ''یہ کھیت کس کی ملکیت ہے؟''

میرا اشارہ اس کھیت کی سمت تھا جہاں ہم اس وقت کھڑے تھے۔ ایک شخص نے جواب دیا۔ ''یہ کھیت بابا جلال دین کے ہیں۔''

اس شخص کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ پکی عمر کا ایک بابا، آگے بڑھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں ہوں جی جلال دین۔''

جلال دین کے نام سے اپنا تعارف کرانے والے اس شخص کی عمر پینسٹھ کے قریب رہی ہو گی۔ وہ ایک جفاکش اور صحت مند بوڑھا تھا۔ رنگ سانولا اور سر پر پگڑی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی سی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی جس کے بال پوری طرح سفید ہو چکے تھے جو اس کی شخصیت کو پُر تاثر بناتے تھے۔ میں نے جلال دین نامی اس زمیندار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بابا! کیا تمہارے پاس کوئی چادر یا کوئی دوسرا کپڑا ہے؟''

وہ گیا اور ایک چادر لے کر واپس آ گیا۔

''میں پٹھوں (چارے) کے لئے یہ چادر لے کر آیا تھا۔'' اس نے وہ چادر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ لے لیں۔''

میں نے بابا جلال دین کے ہاتھ سے وہ چادر لی اور اسے پھیلا کر نوری کی لاش پر ڈال دیا، پھر بابا جلال دین سے پوچھا۔

''تمہیں کب پتہ چلا، اس واردات کے بارے میں؟''

یہ بات شاید میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ نوری کی لاش کو بابا جلال دین نے دریافت کیا تھا اور اسی نے اپنے بیٹے سلطان کو تھانے دوڑا کر اس سانحے کی اطلاع دی تھی۔ جلال دین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''تھانے دار صاحب! میں اور میرا بیٹا سلطان آج صبح حسبِ معمول کھیتوں میں آئے اور اپنا کام شروع کر دیا۔ پہلے ہمیں اپنے مویشیوں کے لئے پٹھوں وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا لہٰذا ہم اسی کام میں جت گئے۔ میں درانتی سے پٹھے کاٹتا ہوا کھیت کے اندر آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا کہ اس عورت کی لاش پر میری نظر پڑ گئی۔'' اس نے اشارے سے نوری کی لاش کے بارے میں بتایا اور ایک جھرجھری لیتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''میں نے اسی وقت کام کو روک دیا اور اپنے بیٹے کو آواز دے کر ادھر آنے کو کہا۔ سلطان اس وقت کھیت کے دوسرے حصے میں پٹھے کاٹ رہا تھا۔ میری پکار پر وہ بھاگتا ہوا اس طرف آ

گیا، پھر لاش دیکھ کر وہ بھی میری طرح خوف زدہ اور پریشان ہو گیا۔ ہم تھوڑی دیر تک اس لاش کے بارے میں غور کرتے ہوئے ڈرتے سہمتے رہے، پھر ہم نے آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ انہی افراد میں سے کسی نے مشورہ دیا، ہمیں فوراً تھانے میں اس واقعے کی اطلاع پہنچانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے سلطان کو آپ کی طرف دوڑا دیا۔''

بابا جلال دین کے بیان میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اس لاش کے بارے میں کوئی مفید معلومات حاصل ہو سکتی۔ میں نے وہاں موجود افراد سے فرداً فرداً کرید کرید کر مقتولہ کے بارے میں مختلف زاویوں سے سوال کئے لیکن ایسا کوئی نکتہ سامنے نہ آیا جس سے مقتولہ کی شناخت ہو جاتی یا اس کے قتل کا محرک جاننے میں کوئی مدد مل سکتی۔ نوری کی شناخت کا معاملہ لٹک کر رہ گیا۔ میں اگر نوری کہہ کر اس کا تذکرہ کر رہا ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس کا نام واقعی نوری تھا۔ یہ تو وہ نام تھا جو گزشتہ رات اس نے مجھے بتایا تھا۔ اس کے متعدد جھوٹوں کا پول کھل جانے کے بعد اب مجھے یہ نام بھی فرضی اور بوگس ہی معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے کانسٹیبل مصطفیٰ کو ایک طرف بلایا اور دوسرے لوگوں سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو کر ہم دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے مصطفیٰ سے استفسار کیا۔

''کیا تم مقتولہ کو نہیں جانتے؟''

''ملک صاحب! اگر مجھے اس بدنصیب عورت کے بارے میں ایک لفظ بھی پتہ ہوتا تو میں خاموش نہ رہتا۔'' کانسٹیبل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہے۔''

''اس کا نام غالباً نوری ہے!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

مصطفیٰ نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''نوری ...... یہ نام تو آپ نے پہلے بھی میرے سامنے لیا تھا......! ہاں، مجھے یاد آ گیا۔ آپ نے پوچھا تھا، کیا نوری میری بیوی نہیں......!'' اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! یہ نوری کا کیا چکر ہے؟''

''چکر تمہارے سامنے ہے۔'' میں نے نوری کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! خدا کے واسطے مجھے آسان الفاظ میں سمجھائیں۔ ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مصطفیٰ! اس عورت نے مجھے اپنا نام نوری بتایا تھا

اور گزشتہ رات یہ تمہاری شکایت لے کر میرے کوارٹر میں آئی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ نہ صرف تمہاری بیوی ہے بلکہ اس کے بطن سے تمہارے دو بچے بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ اسی لئے آج صبح میں تم سے اس قسم کے سوالات کر رہا تھا!''

وہ تعجب خیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا، اس عورت نے خود کو مجھ سے منسوب کر کے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔''

''یہ جھمیلا فی الحال میری سمجھ سے بھی باہر ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کانسٹیبل سے کہا۔

''مصطفیٰ! ہم دونوں نے مل کر اس عورت کے راز تک پہنچنا ہے۔ کیا میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟''

میرے آخری جملے میں بڑا اہم اور طاقت ور سوال چھپا ہوا تھا۔ مصطفیٰ نے چونک کر میری آنکھوں میں دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ملک صاحب! میں زبانی کلامی آپ کو، اپنے قابلِ بھروسہ ہونے کا یقین نہیں دلا سکتا۔ آپ مجھ پر اعتماد کر کے قدم اٹھائیں، میرا عمل سب کچھ ثابت کر دے گا۔''

میں نے ستائشی نظر سے مصطفیٰ کو دیکھا اور کہا۔ ''مجھے تم سے کسی ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ زبانی کلامی بڑھ چڑھ کر بولنے والے اور بڑے بڑے دعوے کرنے والے بعد میں بودے اور کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے، میں تم پر اعتبار کر کے کوئی غلطی نہیں کروں گا۔''

''آپ میری عزت افزائی کر رہے ہیں۔'' مصطفیٰ نے کہا۔ ''اور یہ میرے لئے بڑے فخر کی بات ہے۔''

اس تسلی کے بعد میں نے کانسٹیبل مصطفیٰ کو گزشتہ رات اپنے کوارٹر میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے متذبذب انداز میں کہا۔

''یہ بات ذہن میں سما نہیں رہی کہ اس عورت نے میرا نام کیوں استعمال کیا؟ یقیناً اس عمل کے پیچھے اس کا کوئی گہرا مقصد چھپا ہو گا۔''

''ہمیں اپنی کوشش سے اس مقصد تک پہنچنا ہے مصطفیٰ!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ بھی معلوم کرنا ہے، اس کا قاتل کون ہے!''

مصطفیٰ نے گہری نظر سے چادر کے نیچے ڈھکی ہوئی نوری کی لاش کی جانب دیکھا اور متفکر لہجے میں بولا۔ ''میں تو محسوس کر رہا ہوں، اس عورت کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت استعمال

کر کے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"

"تم بالکل میرے انداز میں سوچ رہے ہو مصطفیٰ!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں، ہماری خوب نبھے گی۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"مصطفیٰ! اصل مجرم وہ ہے جس نے بڑے شاطرانہ انداز میں نوری کو اپنے کسی خاص مقصد یا مفاد کے لئے استعمال کیا ہے۔ نوری کا قتل بھی اسی شخص کے ایماء پر کیا گیا ہوگا۔ ہمیں جلد از جلد اس مجرم ذہن تک رسائی حاصل کرنا ہے۔"

مصطفیٰ نے بڑے معنی خیز انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ "ملک صاحب! مقتولہ کا جھوٹ کھل جانے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ اس کا نام نوری ہی ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مصطفیٰ! یہ قطعی ضروری نہیں ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "اور جب تک مقتولہ کی مکمل شناخت نہیں ہو جاتی، ہم آپس میں گفتگو کے دوران اسے نوری ہی سمجھ کر بات کریں گے۔"

"لیکن کاغذی کارروائی میں ہر جگہ اس کا نام "نامعلوم مقتولہ" درج ہوگا!" مصطفیٰ نے کہا۔

"بالکل درست!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ پوچھنے لگا۔ "ملک صاحب! یہ مسئلہ تو حل ہو ہی جائے گا۔ یہ نوری ہے یا ناری! آپ مجھے بتائیں، یہ میری کون سی شکایت لے کر آپ کے پاس پہنچی تھی؟"

میں نے کہا۔ "مصطفیٰ! تم نے نوری اور ناری کی اچھی ترتیب پیش کی ہے۔ یہ مقتولہ کو پیش آمدہ حالات پر پوری طرح فٹ بیٹھتی ہے۔" پھر میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

"یہ مجھے بتانے آئی تھی کہ تم بہت ظالم اور سفاک ہو۔ اسے بری طرح مارتے پیٹتے ہو۔ بچوں کو بھی بڑے فرعونانہ انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہو۔ گھر میں خرچہ نہیں دیتے بلکہ اپنی سرکاری تنخواہ کا زیادہ تر حصہ پرائی عورتوں پر لٹاتے رہتے ہو......"

میں نے لمحہ بھر کو رک کر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ یہ باتیں سن کر خیالوں کی دنیا میں گم ہو گیا تھا۔ میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ دکھ بھری کہانی سنا کر اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔

تمہارے کان کھینچ کر ایسی ڈانٹ لگاؤں کہ تم بندے دے پُتر بن جاؤ۔ بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ کھینچنے سے کان لمبے ہو جاتے ہیں اور کان کھنچوا کر ڈانٹ کھانے والا بندے دا پُتر نہیں بلکہ کھودے دا کُھر بن جاتا ہے!"

میری اس لطیف چوٹ نے اس کو تصور کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! آپ مذاق بہت اچھا کرتے ہیں۔"

"یہ بات تو تم اب کہہ رہے ہو ناں!" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اگر واقعی نوری تمہاری بیوی ہوتی اور اس کی شکایت پر میں تمہارے کان بھی کھینچ دیتا تو شاید تمہیں میری یہ حرکت مذاق نہ لگتی بلکہ میری اس جابرانہ سنجیدگی پر تم میرے لئے اپنے دل کو میلا کر سکتے تھے۔"

وہ ایک مرتبہ پھر تصورات کی نگری میں پہنچ گیا۔ میں اس کی محرومی اور نفسیاتی مسئلے کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ بیوی کے ذکر پر اس کی محرومی اور ناکامی کچھ زیادہ ہی شدت سے عود کر آتی تھی۔ اس کی منگنی متعدد بار ٹوٹ چکی تھی اور شادی ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ لہٰذا بیوی......اس کی بیوی کا تذکرہ اسے دنیائے تسکین اور جہانِ راحت میں پہنچا دیتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فرزند علی واپس لوٹ آیا۔ اس کے ساتھ تین اور افراد بھی تھے جن کا تعلق احمد نگر شمالی سے تھا۔ نوری کے قتل کی اطلاع وہاں تک پہنچ چکی تھی اور وہ لوگ میرے بلانے پر نوری کی لاش کی شناخت کے لئے ادھر آئے تھے۔ میں نے ان کے نام پوچھے۔ ان میں سے ایک احمد یار، دوسرا محمد مشتاق اور تیسرا علی نواز تھا۔ میں نے مختصراً انہیں نوری کو پیش آنے والے اندوہ ناک واقعے کے بارے میں بتایا پھر لاش کے قریب لے جا کر نوری کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

وہ تینوں سنسنی خیز نظروں سے نوری کے مُردہ چہرے کا جائزہ لیتے رہے۔ اس دوران میں ان کے چہروں پر نمودار ہونے والے تاثرات کو نوٹ کرتا رہا اور اس کوشش کے نتیجے میں مجھے سراسر مایوسی ہوئی۔ ان میں سے کسی کے چہرے یا آنکھوں میں ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ نوری کے صورت آشنا ہیں۔ پھر اگلے ہی لمحے انہوں نے میرے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

"میں نے اس عورت کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" احمد یار حتمی لہجے میں بولا۔

محمد مشتاق بولا۔ "مجھے تو یہ کسی دوسرے ہی علاقے کی لگتی ہے۔ اگر جنوبی اور شمالی سے اس کا تعلق ہوتا تو میں فوراً اسے پہچان لیتا۔"

"میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔" علی نواز نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "یہ بات تو طے

ہے کہ یہ عورت ہمارے قصبے سے تعلق نہیں رکھتی۔ ممکن ہے، یہ کسی کے گھر میں مہمان آئی ہوئی ہو!''

علی نواز نے ایک اہم نکتہ اٹھایا تھا۔ میں نے اس کی بات پر غور کیا تو اس نکتے میں مجھے اچھا خاصا وزن نظر آیا۔ اگرچہ یہ نکتہ اس کہانی سے کوئی میل نہیں کھاتا تھا جو گزشتہ رات نوری نے میرے کوارٹر میں آ کر مجھے سنائی تھی۔ تاہم کیس کے اس پہلو کو چیک کرنا ضروری تھا۔

میں نے موقع پر موجود اہم اور سمجھ دار افراد کے بیان قلم بند کئے۔ اس کے بعد احمد نگر شمالی اور احمد نگر جنوبی کے ایک ایک شخص کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ اپنے اپنے علاقے کی مسجد میں یہ اعلان کروائے کہ اگر کسی شخص کے گھر آئی ہوئی کوئی مہمان عورت غائب ہے تو وہ فوراً تھانے میں اطلاع دے۔ یا پھر براہِ راست موقع پر چلا آئے۔

یہ ایک طرح کی موہوم سی کوشش تھی جس کے نتیجے میں مقتولہ کی شناخت کا پانچ فیصد امکان تھا۔ اس کے بعد میں موقع کی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نے ضروری کارروائی مکمل کر دی۔ مشیر نامہ تیار ہو چکا تھا اور تھوڑی دیر پہلے دونوں طرف کی مساجد میں مہمان عورت کی گم شدگی کا اعلان ہو گیا تھا لیکن ابھی تک مجھے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی جس سے مقتولہ کی شناخت کے سلسلے میں کوئی پیش رفت ہو سکتی۔

میں نے کچھ اور دیر جائے وقوعہ پر رک کر انتظار کیا۔ جب کسی اطلاع کی امید نہ رہی تو میں نے نوری کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے سرکاری ہسپتال بھجوا دیا۔

جائے واردات پر میرا اب کوئی کام نہیں رہا تھا لہٰذا کانسٹیبل کے ساتھ میں واپس تھانے آ گیا۔

***

دوپہر کے کھانے کے بعد مصطفیٰ میرے کمرے میں آ گیا اور ہمارے درمیان نوری کے قتل کے ساتھ ہی دوسرے موضوعات پر بھی بات ہونے لگی۔

میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''مصطفیٰ! نوری کے ساتھ جو بھی واقعہ پیش آیا ہے وہ اس کے کسی دشمن کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو گا، وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی، ہم اس کے قاتل کا سراغ نہیں لگا سکتے۔''

''ملک صاحب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ کسی اتفاقی حادثے کا شکار ہو گئی ہو۔ کسی نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو اور اس کی مزاحمت پر قتل کر کے چلا گیا ہو۔'' مصطفیٰ نے عقل کے

گھوڑے دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس بات کا بھی امکان ہے، نوری نے حملہ آور کو پہچان لیا ہو...... اور اس ڈر سے کہ وہ دوسروں کو حملہ آور کے کارنامے کے بارے میں بتا دے گی، اس نے نوری کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔''

''اس زاویے سے میں نے بھی سوچا تھا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن فوراً ہی اس امکان کو ذہن سے خارج کرنا پڑا۔ اس قسم کے مجرمانہ حملے کے آثار نہ تو نوری کی لاش پر کہیں نظر آتے ہیں اور نہ ہی جائے وقوعہ پر دکھائی دیتے ہیں۔'' میں نے چند لمحات کے لئے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں نوری کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے اور قتل کی یہ واردات گزشتہ رات نصف شب کے آس پاس ہوئی ہے۔ جائے وقوعہ پر گرنے والا مقتولہ کا خون اور کٹی ہوئی شہ رگ بڑے واضح انداز میں اس جانب اشارہ کرتی ہے۔ کیا تم نے نوری کی گردن کو غور سے نہیں دیکھا؟''

''دیکھا ہے ملک صاحب!'' وہ کچھ سوچنے کے دوران سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''اور میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں لیکن.....''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر تھوڑا متوقف ہوا پھر الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی، نوری کے قاتل تک پہنچنے کے لئے آغاز کہاں سے کیا جائے؟''

''یہ بات میری سمجھ میں آ چکی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات کئی زاویوں سے ظاہر اور ثبت شدہ ہے کہ نوری کی لاش کھیتوں میں جس مقام پر پائی گئی ہے، اسے قتل بھی اسی جگہ پر کیا گیا ہے۔''

کانسٹیبل مصطفیٰ گہری دلچسپی سے میری طرف متوجہ رہا۔ میں نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا واضح مطلب یہی ہے، قاتل بھی اس کے ساتھ اس مقام تک آیا تھا، لہٰذا.....'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر کہا۔ ''اگر ہم کسی کھوجی کی مدد لیں تو قاتل کا کھرا حاصل کیا جا سکتا ہے۔''

''اوہ!'' وہ چونک کر بولا۔ ''آپ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں ملک صاحب!'' پھر تجویز دینے والے انداز میں کہا۔ ''یہ کھرا دو مقامات سے نکلوانا ہو گا جناب!''

''دو مقامات؟'' اب کی بار میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے وضاحت سے بتانے لگا۔ ''ملک صاحب! گزشتہ رات

نوری آپ سے ملنے کوارٹر پر آئی تھی اور ملنے کے بعد واپس بھی گئی تھی۔ اگر اس کے قدموں کے نشانات کا تعاقب کیا جائے تو یہ معلوم ہو سکتا ہے وہ کہاں سے آئی تھی اور کہاں گئی تھی؟“
اس نے سانس لینے کی غرض سے توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔
”اسی طرح جائے وقوعہ سے کھرا اٹھانے پر یہ پتہ چل سکتا ہے، قاتل اور مقتولہ کس رخ سے وہاں پہنچے تھے اور نوری کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد قاتل نے کدھر کا رخ کیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ملک صاحب!“
”تم بالکل درست سمت میں دوڑ رہے ہو مصطفیٰ!“ میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ اس کی حاضر دماغی نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میں نے اسی سے پوچھ لیا۔ ”کیا قصبہ احمد نگر میں کوئی کھوجی وو جی بھی پایا جاتا ہے؟“
”کوئی ایسا ویسا جناب!“ وہ آنکھیں اور ہاتھ ایک ساتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔
میں نے استفسار کیا۔ ”میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”جناب! ہمارے علاقے میں ایک بہت ہی پہنچا ہوا کھوجی ہے، تاج دین۔ وہ پنج وقتہ نمازی ہے۔“
”پھر تو وہ اسم بامسمیٰ ہوا ناں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”ایسے نیک اور پرہیزگار شخص سے تو پہلی فرصت میں ملواؤ مصطفیٰ!“
”ٹھیک ہے جناب! میں آج ہی اسے بلواتا ہوں۔“
”تم نے کہا ہے، تاج دین بہت ہی پہنچا ہوا کھوجی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہم نوری مرڈر کیس میں اس سے کوئی مدد لے سکتے ہیں؟“
”ضرور لے سکتے ہیں جناب!“ کانسٹیبل نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”اگر کچھ اور عرصہ تاج دین یونہی بے کار بیٹھا رہا تو اسے زنگ لگ جائے گا۔ رفیق سیال نے تو اسے کبھی خدمت کا موقع نہیں دیا۔“
میں نے تیقن سے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو مصطفیٰ! میں تاج دین کے جوہر کو ضرور آزماؤں گا۔ جتنی جلدی ہو سکے تم اسے میرے پاس لے آؤ۔ کھوج کے کام میں ہمیں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔“
کانسٹیبل مصطفیٰ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں ابھی اس کی طرف جاتا ہوں“ اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ”اس وقت وہ مسجد ہی میں مل جائے گا۔ ظہر کی نماز کا وقت چل رہا ہے۔“
میں نے پوچھا۔ ”کھوجی تاج دین شمالی میں رہتا ہے یا جنوبی میں؟“

”شمالی میں جناب!“ مصطفیٰ نے جواب دیا۔ ”اس کا گھر مسجد کے قریب ہی ہے۔ اگر وہ نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے نکل بھی گیا تو میں اسے گھر میں پکڑ لوں گا۔“
”ٹھیک ہے، تم فوراً اس کی طرف روانہ ہو جاؤ۔“
اور وہ روانہ ہو گیا۔
آدھے گھنٹے کے بعد کانسٹیبل مصطفیٰ، کھوجی بابا تاج دین کے ساتھ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کھوجتی ہوئی نظر سے تاج دین کا جائزہ لیا اور اس کی شخصیت میں مجھے وہ تمام تاثرات اور اشارے نظر آئے جو کسی بھی معقول اور شریف النفس انسان میں موجود ہونے چاہئیں۔ اس کی عمر ساٹھ کے قریب تھی۔ اس نے مناسب داڑھی رکھی ہوئی تھی لیکن اس عمر میں بھی اس کی داڑھی کے تمام تر بال سیاہ تھے۔ سر پر اس نے سفید ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کھوجی بابا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
”تاج دین! تمہیں یہ تو پتہ چل ہی گیا ہو گا، میں نے کس مقصد کے لئے تمہیں تھانے بلایا ہے؟“
”جی ہاں، آپ کے بھیجے ہوئے کانسٹیبل نے مجھے کچھ تفصیل تو بتائی ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔
میں نے کہا۔ ”جو تفصیل باقی بچی ہے، میں سنا دیتا ہوں۔ بس تم خود کو کام کے لئے تیار کر لو۔“
”یہ تو آپ کی عزت افزائی ہے تھانے دار صاحب!“ وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا، اب محکمہ پولیس کو میرے ہنر کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن آپ کے بلاوے نے امید جگائی ہے کہ میری ہڈیاں زنگ لگنے سے بچ جائیں گی۔“
میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مخبر اور کھوجی ہر دور میں محکمۂ پولیس کی ضرورت رہے ہیں۔ ان کی اہمیت اور حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ جب تک میں اس تھانے میں ہوں، گاہے بہ گاہے تمہیں زحمت دیتا رہوں گا۔ تم فکر نہ کرو تاج دین! تمہاری ہڈیوں کو زنگ نہیں لگنے دیا جائے گا۔“
وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔
آئندہ دس پندرہ منٹ میں، میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد ضروری ہدایات دیں اور کہا۔ ”میں کانسٹیبل مصطفیٰ کو تمہاری مدد کے لئے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تم اپنے کام کا آغاز کہاں سے کرنا چاہتے ہو؟ ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ یہ کام نہایت

راز داری سے ہونا چاہئے۔''

''راز داری والے معاملے کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔'' وہ یقین دلانے والے انداز میں بولا۔''اور جہاں تک کام کے آغاز کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے، میں آپ کے کوارٹر کی طرف پہلے جانا چاہوں گا اور اس کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔''

وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا۔ میں خاموش سوالیہ نظر سے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔''کھیتوں کی بہ نسبت آپ کے کوارٹر کی طرف لوگوں کی آمد و رفت کے امکانات زیادہ ہیں لہٰذا پہلے ادھر کی زمین کو چیک کرنا ہوگا۔ یہاں کا کھرا زیادہ غیر محفوظ ہے۔''

وہ ایک معقول اور عملی وجہ بیان کر رہا تھا۔ میں نے اس کی بات کی تائید کر دی پھر مصطفیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مصطفیٰ! تاج دین اپنا ٹیکنیکل کام کرے گا۔ تم اس کی ضروری مدد کے ساتھ ہی اپنی آنکھیں اور ذہن کو بھی کھلا رکھنا۔ احمد نگر شمالی اور جنوبی میں ایک عورت کے قتل اور دریافت ہونے والی اس کی لاش کی خبر مشہور ہو چکی ہے۔ چونکہ مقتولہ کا تعلق شمالی اور جنوبی دونوں جگہوں سے نہیں ہے لہٰذا تمہیں مختلف قسم کی باتیں اور تبصرے سننے کو ملیں گے۔ لوگوں کی باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے، کسی کی زبان سے کوئی ایسی بات پھسل جائے جو مقتولہ کی شناخت اور قاتل تک رسائی کے سلسلے میں مددگار ثابت ہو!''

''میں اس بات کو دھیان میں رکھوں گا ملک صاحب!'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

میں بھی اٹھ کر ان کے ساتھ اپنے کوارٹر تک آیا کیونکہ کھرے کا کام وہیں سے شروع ہونا تھا۔ میرا کوارٹر تھانے کے عقب میں مشرقی جانب واقع تھا اور اس کے پیچھے ایک کھلا میدان تھا جہاں شام میں قصبے کے نوجوان فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ میدان کے بعد احمد نگر شمالی کے رہائشیوں کے مکانات شروع ہو جاتے تھے۔

تاج دین نے میرے کوارٹر کے داخلی دروازے سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ دس منٹ تک وہ بڑے ماہرانہ انداز میں وہاں کی زمین کا معائنہ کرتا رہا۔ میں اسے نوری کے بارے میں تفصیلاً بتا چکا تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''تھانے دار صاحب! آپ کے کوارٹر تک آنے جانے والے بہت سے قدموں کے آثار موجود ہیں جن میں ظاہر ہے، آپ کے اور میرے قدموں کا کھرا بھی شامل ہے لیکن خوش خبری یہ ہے کہ میں نے ایک عورت کی سینڈل کے نشانات کو بالکل الگ تلاش کر لیا ہے۔ لگتا ہے، پچھلے آٹھ دس دن میں اس طرف صرف یہی ایک عورت آئی ہے کیونکہ اس کے سوا مجھے

کسی اور عورت کا کھرا دکھائی نہیں دے رہا۔''

تاج دین نے پہلے ہی قدم پر ایک خوش گوار کامیابی حاصل کر لی تھی۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کی کوشش کو سراہا۔ ستائشی الفاظ کام کرنے والے کا حوصلہ بڑھا دیتے ہیں اور وہ زیادہ محنت، زیادہ تن دہی سے کام میں جُت جاتا ہے۔ تاج دین کے چہرے پر نظر آنے والا ولولہ بھی اسی بات کی نشان دہی کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''تاج دین! اب تم اپنے ہُنر کو کام میں لاؤ۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ شام سے پہلے یہ معلوم کرو کہ وہ عورت کہاں سے آئی تھی اور کوارٹر سے نکلنے کے بعد وہ کس طرف گئی تھی؟''

''میں کوشش کرتا ہوں سرکار!'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا اور نوری کے قتل اور قاتل کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ابھی تک میں یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ مقتولہ کا نام نوری ہی تھا یا محض خانہ پُری کے لئے اس نے مجھے یہ نام بتایا تھا۔ جب تک اس واردات کا کوئی سرا ہاتھ نہ لگ جاتا، کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ میرے واثق اندازے کے مطابق اس کی شہ رگ کو کسی تیز دھار آلے کی مدد سے کاٹا گیا تھا یعنی آلۂ قتل کوئی تیز دھار چھری یا خنجر ہو سکتا تھا۔ میں نے جائے وقوعہ کا دور دور تک اچھی طرح معائنہ کیا تھا تاکہ اگر قاتل نے آلۂ قتل وہیں کسی جگہ پھینک دیا ہو تو مجھے مل جائے لیکن اس تلاش میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

میں نوری مرڈر کیس میں ذہن کو الجھائے بیٹھا تھا کہ اے ایس آئی شہزاد کی صورت دکھائی دی۔ وہ میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا اجازت طلب نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے نگاہ ملی تو وہ بڑے ادب آداب سے بولا۔

''ملک صاحب ...... حاضر ہو سکتا ہوں؟''

''ہاں، ہاں ...... آؤ شہزاد۔'' میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔''بھئی یہ تمہارا اپنا تھانہ ہے۔''

''اور تھانے دار صاحب؟'' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔''جب تھانہ تمہارا ہے تو تھانہ انچارج بھی تمہارا ہی ہوا ناں۔ آؤ بیٹھو......''

وہ ایک کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔''ملک صاحب! میں آپ سے ایک شکایت کرنے آیا ہوں۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”کس کی شکایت کرنے آئے ہو شہزاد؟“

شہزاد اس تھانے میں اے ایس آئی کی حیثیت سے فرائض ادا کر رہا تھا۔ تھانے کے تمام عملے سے میرا فرداً فرداً تعارف تو ہو چکا تھا لیکن ابھی تک زیادہ گھلنا ملنا صرف کانسٹیبل مصطفیٰ ہی سے ہوا تھا۔ پتہ نہیں، وہ کیوں مجھے اپنا اپنا سا اور قابلِ بھروسہ لگا تھا۔ اس کا انداز اور گفتگو بتاتے تھے، وہ کانسٹیبل کے عہدے سے ترقی کر کے بہت اوپر جائے گا۔ کب؟ اس بارے میں، میں نہیں جانتا تھا۔

اے ایس آئی شہزاد میرا استفسار سن کر چند لمحات تک متذبذب رہا پھر تامل کرتے ہوئے بولا۔ ”ملک صاحب! آپ میری بات کا برا تو نہیں منائیں گے۔ دراصل یہ شکایت مجھے آپ ہی سے ہے۔“

بات مکمل کرنے کے بعد اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے ڈر رہا ہو کہ میں اس جرأت کی پاداش میں اسے سولی پر چڑھا دوں گا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”میں تمہارے جیسے بہادر اور نڈر لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ تم میں اتنا حوصلہ تو ہے کہ اپنے سینئرز سے ان کی شکایت کر سکو۔ بتاؤ، تمہیں مجھ سے کیا شکوہ پیدا ہو گیا ہے؟ اگر میرے بس میں ہوا تو میں تمہاری شکایت دور کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”ملک صاحب ...... میں محسوس کر رہا ہوں جیسے آپ کسی بات پر مجھ سے ناراض ہوں۔“ وہ محتاط لہجے میں بولا۔

”بھئی! مجھے اس تھانے کا چارج سنبھالے ہوئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ میں بھلا تم سے کس بات پر ناراض ہوں گا۔ میرا خیال ہے، ہم آج پہلی مرتبہ باقاعدہ گفتگو کر رہے ہیں۔ بتاؤ، تم نے میری کس بات سے اندازہ لگایا کہ میں تم سے خفا ہوں؟“

وہ وضاحت کرتے ہوئے معتدل لہجے میں بولا۔ ”ملک صاحب! میں عہدے کے اعتبار سے اے ایس آئی ہوں۔ ایک اے ایس آئی کسی کانسٹیبل سے اچھا خاصا سینئر ہوتا ہے۔ لیکن آپ نے اس عورت کے قتل کے سلسلے میں مجھے اعتماد میں لے کر کوئی کارکردگی دکھانے کا موقع نہیں دیا۔“

اس نے بات ختم کی تو میں اس کی تکلیف کو بھانپنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے یہ بات بری طرح چبھی تھی کہ میں نے اس کے مقابلے میں کانسٹیبل مصطفیٰ کو زیادہ اہمیت دے دی تھی۔ میرے اسی رویے کا شکوہ کرنے وہ میرے پاس چلا آیا تھا۔ اس کی شکایت ایک حد تک جائز بھی تھی لیکن میرا کام کرنے کا ایک اپنا انداز ہے اور میں اسی کو فالو کرتا ہوں۔

کسی تھانے میں تھانہ انچارج کی حیثیت ایک باپ کی سی ہوتی ہے اور وہاں کا عملہ اس کی اولادوں کی مانند۔ تھانے دار کو بہ خوبی علم ہوتا ہے کہ ان کی کون سی اولاد کتنے پانی میں ہے۔ ایک کامیاب باپ اسی مناسبت سے اپنی اولادوں سے کام لیتا ہے۔ میں کانسٹیبل مصطفیٰ کی صلاحیت اور قابلیت کو جان گیا تھا لہٰذا یہ سمجھنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ اے ایس آئی شہزاد، کانسٹیبل مصطفیٰ سے بری طرح جیلس ہو رہا تھا۔ ان کی باہمی چپقلش اور رنجش کو بعد میں دیکھا جا سکتا تھا، سردست میں نے اے ایس آئی کی اشک شوئی ضروری سمجھی اور بڑے واضح انداز میں کہا۔

”شہزاد! میں اپنے عملے میں کسی ایک کو کسی دوسرے پر فوقیت محض قابلیت اور کارکردگی کی بناء پر دیتا ہوں۔ تم اپنا مقابلہ کسی کانسٹیبل سے مت کرو۔ میں اس مرڈر کیس کے سلسلے میں تم سے بھی کام لوں گا ...... اور وہ ایک کانسٹیبل کے مقابلے میں زیادہ بڑا کام ہو گا!“

”شکریہ ملک صاحب!“ وہ بڑی رسانیت سے بولا۔ ”آپ نے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ”میرے دل میں ایک بات آئی اور میں نے کہہ دی۔ سابق انچارج صاحب کے سامنے زبان کھولنے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا پڑتا تھا۔ وہ بری طرح جھاڑ دیتے تھے۔ آپ کے بارے میں مجھے پتہ چلا ہے، آپ بڑے ہمدرد اور مہربان ہیں اس لئے میں نے آپ کو اپنے احساسات سے آگاہ کیا ہے۔ اگر میری بات آپ کو بری لگی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔“

”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں شہزاد!“ میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ”میں کڑک قسم کا تھانے دار صرف جرائم پیشہ افراد کے لئے ہوں۔ تھانے کا عملہ تو میرے گھر کے افراد کی طرح ہے۔ مجھے تمہاری جرأت سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ ایسا کرو......“

میں نے پُرسوچ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ منتظر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ شہزاد بھی مصطفیٰ کی طرح سابق تھانہ انچارج رفیق سیال سے خاصا شاکی اور متنفر نظر آتا تھا۔ اسی حوالے سے میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا تھا۔ یہ ایک طرح سے شہزاد کا گلہ دور کرنے کا موقع بھی تھا۔

مین نے نامکمل بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔ ”شہزاد! تمہاری کارکردگی کو دیکھنے کی ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں۔“

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''جیسا کہ تم بھی جانتے ہو، سابق تھانے دار صاحب کو کن وجوہ کی بناء پر اس تھانے سے ہٹایا گیا ہے۔ مجھے شک ہے، اس اجنبی عورت کا قتل اور اس کی لاش کا اس تھانے کی حدود میں پایا جانا رفیق سیال کی کوئی سازش ہے۔ میں اس کی جگہ تعینات کیا گیا ہوں۔ وہ مجھے پریشان کرنے کے لئے کوئی بھی اوچھی حرکت کر سکتا ہے...... یا کروا سکتا ہے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، میری بات نے اس پر کوئی خاص اثر کیا ہو۔ میں سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ قدرے پُرجوش لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ سابق انچارج صاحب بہت ہی کینہ پرور اور منتقم مزاج شخصیت تھے۔ ان کو یہاں سے ہٹانے میں اگرچہ آپ کا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ اپنے اعمال اور کرتوتوں کے سبب گئے ہیں لیکن اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ وہ آپ کو تنگ کرنے کے لئے کوئی الٹی سیدھی حرکت کر ڈالیں۔'' وہ سانس لینے کے لئے تھما پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میرے لئے کیا حکم ہے ملک صاحب؟''

''تمہارے لئے صرف اتنا حکم ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنے ذرائع استعمال کرو اور نہایت ہی رازداری کے ساتھ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ تمہارے سابق انچارج صاحب آج کل کن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اس دوران اگر اس نامعلوم مقتولہ کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہو تو فوراً مجھے بتانا۔ کیا تم یہ کام کر لو گے؟''

''کیوں نہیں جناب......'' وہ سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''میں بہت جلد آپ کو کوئی خوش آئند رپورٹ دوں گا۔''

وہ تھوڑی دیر مزید میرے پاس بیٹھا پھر کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے مجھ سے ایک جائز شکایت بڑے معقول انداز میں کی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھرپور اداکاری سے کام لے رہا ہو۔ اس کے رویے، انداز اور بیان میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مجھے چبھ رہی تھی۔ لیکن باوجود کوشش کے بھی اس وقت میں اس چبھن کا سبب نہ جان سکا۔ میں نے یہی سوچ کر اے ایس آئی شہزاد کو ذہن سے جھٹک دیا کہ کانسٹیبل مصطفیٰ سے اس کے بارے میں دریافت کروں گا۔



رات سے تھوڑی دیر پہلے بابا تاج دین اور کانسٹیبل مصطفیٰ واپس لوٹ آئے۔ میرے استفسار پر انہوں نے جو رپورٹ پیش کی وہ خاصی انکشاف انگیز اور سنسنی خیز تھی۔ کھوجی کے مطابق، کوارٹر میں آ کر مجھ سے ملنے والی عورت میدان والی سمت سے آئی تھی اور واپس بھی ادھر ہی گئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اس میدان میں نوری کا کھرا تلاش کرنے میں تمہیں بڑی دشواری ہوئی ہو گی۔ وہاں تو قصبے کے نوجوان روزانہ شام کو فٹ بال کھیلتے ہیں۔ درجنوں قدموں کے نشانات میں کسی مخصوص آدمی کے پاؤں کے نشانات کو فالو کرنا آسان کام نہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!'' تاج دین نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن یہ ایک اتفاق یا ہماری خوش قسمتی سمجھ لیں کہ مقتولہ جس کا نام آپ نوری بتا رہے ہیں...''

''یہ فرضی نام ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر تصحیح کر دی۔ ''اصلی نام تو اس وقت پتہ چلے گا جب اس قتل کا کوئی سرا ہاتھ آئے گا۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب!'' وہ دعائیہ انداز میں بولا۔ ''تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ یہ فرضی نوری میدان کے اندر سے نہیں گزری بلکہ کنارے کنارے چلتے ہوئے دوسری جانب پہنچی تھی۔ اس لئے اس کا کھرا پکڑ کر رکھنے میں مجھے ذرا مشکل پیش نہیں آئی۔ اسی دوران یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ بالکل اسی طرح میدان کے کنارے کے ساتھ چلتے ہوئے آپ کے کوارٹر میں بھی آئی تھی۔''

میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''میدان کے اس پار پہنچنے کے بعد وہ کہاں گئی تھی؟''

''جناب ملک صاحب!'' تاج دین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میدان کے دوسرے کنارے پر معائنے کے بعد پتہ چلا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی مرد بھی تھا جو وہاں رک کر اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔''

مرد کا ذکر سنتے ہی میں چونک اٹھا، جلدی سے پوچھا۔ ''اس کے بعد وہ کہاں گئی؟''

''میں نے بڑی محنت سے اس کے کھرے کو پکڑے رکھا اور اسی سمت چل پڑا جدھر وہ دونوں گئے تھے۔'' کھوجی بابا تاج دین نے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔ ''چند قدم کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ نوری نامی وہ عورت اسی مرد کے ساتھ میدان تک آئی تھی کیونکہ ان دونوں کے وہاں تک پہنچنے کا کھرا بھی مجھے مل گیا تھا۔ وہ جس سمت سے آئے تھے، اسی طرف

واپس جارہے تھے۔"

وہ سانس لینے کے لئے رکا تو میں نے سوال کیا۔ "اس کا مطلب ہے، تم نے سراغ لگا لیا ہے، نوری اور اس کا ساتھی مرد کدھر سے آئے تھے؟"

"جی ہاں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "میں ان کے کھرے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اس طرح ہم دونوں ڈیرے تک پہنچ گئے۔

"ڈیرے تک؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "کس کا ڈیرا؟"

کانسٹیبل نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی، بولا۔ "ملک صاحب! شمالی کے اختتام پر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ادھر ہی تھوڑا آگے کھیتوں کا ڈیرا بنا ہوا ہے۔ یہ چودھری دلدار کا ڈیرا ہے۔ تاج دین اسی ڈیرے کی بات کر رہا ہے۔"

"چودھری دلدار کا ڈیرا......!" میں نے خود کلامی کے انداز میں دہرایا۔ "ان دونوں کا چودھری دلدار سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق تو آپ معلوم کریں گے جناب!" تاج دین نے نرمی سے کہا۔ "میں تو کھرے کی رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔"

چودھری دلدار، احمد نگر کا ایک با اثر اور طاقت ور زمیندار تھا۔ اس کی عالی شان ذاتی حویلی احمد نگر شمالی میں واقع تھی۔ میں فی الحال چودھری دلدار کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ ابھی تک میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کھوجی سے پوچھا۔

"تمہاری اس رپورٹ میں اور کیا درج ہے؟"

"جناب! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اس ڈیرے سے نکلنے والا ایک اہم کھرا بھی پکڑ لیا ہے۔" کھوجی تاج دین نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"کھرے کی اہمیت کا اندازہ تو اس وقت ہوگا جب تم کچھ تفصیل بیان کرو گے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جناب! چودھری دلدار کے اس ڈیرے سے نکلنے والے دو گھڑ سواروں کا کھرا میں نے تلاش کیا ہے۔ ان دو گھڑ سواروں میں ایک تو نارمل صحت اور وزن کا مالک ہے اور دوسرا یا تو بہت زیادہ موٹا ہے یا پھر اس نے اپنے ساتھ کسی سنگل پسلی کو بھی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کر رکھا تھا کیونکہ اس گھوڑے کے پاؤں بہت زیادہ دباؤ کو ظاہر کر رہے ہیں۔ دونوں گھوڑوں کے کھروں میں وزن کے حوالے سے نمایاں فرق نظر آتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے گھڑ سواروں کا نہیں بلکہ ان کے گھوڑوں کا کھرا تلاش کیا

ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر ایک خاص نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم جس سنگل پسلی سوار کا ذکر کر رہے ہو، وہ کوئی عورت ہو؟"

اس نے چونک کر اضطراری نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "ایسا بالکل ممکن ہے۔ پتہ نہیں، اس طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا۔"

"تم اپنی تحقیق کی جو رپورٹ پیش کر رہے ہو اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ان دو گھوڑوں پر دو مرد اور ایک عورت سوار ہو کر چودھری دلدار کے ڈیرے سے نکلے تھے، یعنی ایک گھوڑے پر ایک مرد اور دوسرے گھوڑے پر مرد اور عورت ایک ساتھ!" میں نے تجزیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "اب تم بتاؤ، ان دونوں گھوڑوں کا کھرا کیا بتاتا ہے؟"

تاج دین زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ "جناب! میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں نے ایک اہم کھرا پکڑا ہے۔ اب میں اس کھرے کی اہمیت آپ کے سامنے لاتا ہوں...... ویسے اتنا بتا دوں، ابھی آپ نے جو اندازہ قائم کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ بہرحال......"

وہ لمحے بھر کو رکا تو میں متجسس سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "دونوں گھوڑوں کا کھرا مخصوص دباؤ کے ساتھ ڈیرے سے نہر کے کنارے پہنچا پھر نہر کے ساتھ ساتھ پُل کی جانب بڑھنے لگا۔" تاج دین جس نہر کا ذکر کر رہا تھا وہ مشرق سے مغرب کی سمت بہتی تھی اور احمد نگر کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس قصبے کو شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کرتی چلی جاتی تھی۔ تاج دین کے مطابق گھڑ سوار نہر کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"انہوں نے نہر کا پُل عبور کیا پھر دوسرا یعنی جنوبی کنارہ پکڑ کر مشرق کی سمت بڑھنے لگے۔ کچھ آگے جانے کے بعد جیسے ہی جنوبی کی حدود ختم ہوئی، وہ لوگ کھیتوں میں اتر آئے اور جنوبی کی آبادی سے تھوڑا فاصلہ رکھتے ہوئے کھیتوں میں آگے بڑھ کر وہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں مقتولہ نوری کی لاش ملی ہے...... یعنی جائے وقوعہ پر!"

تاج دین کے اس انکشاف پر میں اچھل پڑا۔ اس نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ میں مضطرب ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، وہ سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اور یہیں پر آپ کی بات درست ثابت ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے، آپ نے جس عورت کے گھوڑے پر سوار ہونے کا اندازہ قائم کیا ہے وہ یہی مقتولہ یعنی نوری ہو۔ ان دونوں نے نوری کو کھیتوں میں قتل کیا اور آگے بڑھ گئے......!"

"آگے بڑھ گئے یا...... واپس لوٹ آئے؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔
کھوجی تاج دین مضبوط لہجے میں بولا۔ "آگے جناب...... آگے!"
"آگے کہاں؟" میری الجھن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔
نوری کی لاش، احمد نگر کے جنوبی کھیتوں میں پڑی ملی تھی وہاں سے پیچھے پلٹنے کا مطلب تھا، واپس نہر کی طرف یعنی شمالی سمت میں جانا اور آگے بڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا تھا، وہ گھنے جنگل میں گھسے ہوں گے۔ جائے واردات سے مشرق اور جنوب دونوں جانب گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔
تاج دین کے بجائے مصطفیٰ نے جواب دیا۔ "ملک صاحب! کھوجی بابا نے ان دونوں گھوڑوں کے سُموں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ان کے کھروں کا تعاقب کرتے ہوئے ہم جنگل کی سرحد تک جا پہنچے تھے لیکن اتنی دیر میں دن کا اختتام ہو گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور ان حالات میں جنگل میں داخل ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں کھرا ڈھونڈنا ممکن نہیں اس لئے ہم واپس آ گئے ہیں۔ کل صبح پھر ادھر کا رخ کریں گے۔ تب پتہ چلے گا وہ دونوں گھڑ سوار نوری کو قتل کر کے کس طرف فرار ہوئے ہیں۔"
تاج دین نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! جائے وقوعہ سے جنگل کی طرف گھوڑوں کا جو کھرا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے، دونوں گھوڑوں پر صرف ایک ایک بندہ سوار تھا۔ میں نے جنگل کے داخلی حصے میں زمین پر اس جگہ ایک خاص نشانی لگا دی ہے جہاں تک کھرا نکالا گیا ہے۔ انشاء اللہ کل صبح میں وہیں سے اپنے کام کا آغاز کروں گا۔" وہ لمحہ بھر کو رکا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔
"اس سلسلے میں آپ سے میری ایک درخواست ہے تھانے دار صاحب!"
"ہاں ہاں، کہو...... کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔
"اگر کانسٹیبل صاحب کا میرے ساتھ جانا بہت ضروری ہے تو پھر اسے سادہ لباس میں روانہ کریں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پولیس کی وردی خواہ مخواہ دیکھنے والوں کو متوجہ کرتی ہے جس سے کام میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ویسے میں کسی کی مدد کے بغیر زیادہ آسانی سے کام کر سکتا ہوں۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔"
میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے...... اس مسئلے پر صبح بات کریں گے۔ تم ذرا جلدی آ جانا۔"
"آپ کہیں گے تو میں فجر کی نماز ادا کرتے ہی ادھر آ جاتا ہوں۔" وہ بولا۔
"نہیں، اتنی بھی جلدی کی ضرورت نہیں تاج دین۔" میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے، میں آٹھ بجے آ جاؤں گا۔" تاج دین کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں، یہ مناسب وقت ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔
وہ رخصت ہو گیا۔
کھوجی تاج دین کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل مصطفیٰ سے کہا۔ "حالات و واقعات کا نقشہ کچھ کچھ ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ تم اسی علاقے کے رہنے والے ہو۔ مجھے بتاؤ، چودھری دلدار کے ڈیرے پر کون رہتا ہے؟"
چودھریوں اور بڑے زمینداروں نے اپنی زمینوں پر ڈیرے وغیرہ بنا رکھے ہوتے ہیں جہاں ان کے ذاتی ملازم رہتے ہیں۔ عموماً یہ ملازم کھیتوں کے معاملات کی نگرانی کرتے ہیں اور بڑے باخبر ہوتے ہیں۔" مصطفیٰ نے میرے سوال کے جواب مین بتایا۔
"ملک صاحب! میری معلومات کے مطابق اس ڈیرے پر چودھری دلدار کے دو ملازم رہتے ہیں جن میں سے ایک کا نام یعقوب عرف قوبا اور دوسرے کا نام امتیاز ہے۔ یہ لوگ ڈیرے کے آس پاس اور دور دراز تک پھیلی ہوئی چودھری دلدار کی اراضی کا نظام سنبھالتے ہیں۔"
"ٹھیک!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "جب تم تاج دین کے ساتھ ڈیرے کے آس پاس نوری اور اس کے ساتھی مرد کا کھرا تلاش کر رہے تھے تو کسی نے تمہیں دیکھا تو نہیں؟ میرا مطلب ہے، قوبا یا امتیاز میں سے کسی نے؟"
"نہیں جناب!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "بابا تاج بہت محتاط اور ہنر مند شخص ہیں۔ کسی کو ہماری کارروائی کا پتہ نہیں چل سکا۔" پھر اس نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ "کھوجی بابا کو یقین ہے، نوری اور اس کا ساتھی مرد ایک ساتھ اس ڈیرے پر گئے تھے۔ ہمیں اس ڈیرے کو ضرور چیک کرنا چاہئے۔"
"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اسی لئے تم سے ایسے سوال کئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہے گی کہ کھوجی تاج دین نا معلوم عورت (نوری) کے قتل کی تفتیش میں پولیس کا ساتھ دے رہا ہے لہٰذا ہمیں اسی وقت چودھری کے ڈیرے کا رخ کرنا چاہئے۔"
"ٹھیک ہے ملک صاحب!" مصطفیٰ نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میں گھر چلا جاؤں گا۔"
"تمہارے خیال میں چودھری دلدار کیسا آدمی ہے؟" میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔
"بس جی، کیا بتاؤں۔" وہ مبہم سا جواب دے کر خاموش ہو گیا۔

میں نے اصراری لہجے میں کہا۔

"جو بھی جانتے ہو، بتاؤ۔"

وہ تھوڑے تامل کے بعد بولا۔ "رفیق سیال کے زمانے میں چودھری دلدار تھانے آتا رہتا تھا۔ ان دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ مجھے یہ چودھری ذرا اچھا نہیں لگتا۔ بس جی، ادھر احمد نگر میں میرے چاچا، چاچی رہتے ہیں اس لئے چودھری دلدار کے خلاف کھل کر کچھ نہیں بول سکتا۔ آپ پر تو مجھے پکا اعتماد ہے اس لئے آپ کو بتا رہا ہوں۔ چودھری دلدار کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔"

مصطفیٰ کی رائے میری تفتیش کے لئے نئے در وا کر رہی تھی۔ رفیق سیال کو ہٹا کر مجھے اس تھانے میں تعینات کیا گیا تھا۔ اس واقعے کا اتنا ہی دکھ چودھری دلدار کو بھی ہوا ہوگا جتنا خود سابق تھانہ انچارج کو۔ میں اس وقت میں جس نا معلوم اور بدقسمت عورت کے قتل کی تفتیش کر رہا تھا، کھوج کے بعد اس کا تعلق چودھری کے ڈیرے سے ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا، اگر چودھری دلدار نہیں بھی تو کم از کم اس ڈیرے پر رہنے والے قوبا اور امتیاز نوری سے ضرور واقف ہوں گے۔ اس سنسنی خیز تعلق کے سامنے آنے کے بعد چودھری کے ڈیرے کو چیک کرنا نہایت ہی ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے کانسٹیبل مصطفیٰ کو ساتھ لیا اور ڈیرے کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس ڈیرے اور میرے تھانے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پندرہ منٹ میں ہم با آسانی وہاں پہنچ سکتے تھے۔ لہٰذا ہم نے پیدل جانے کا فیصلہ کیا۔ رات ہو چکی تھی اس لئے لوگوں کے ہماری طرف متوجہ ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے، اس کے باوجود بھی ہم نے وہ راستہ پکڑا جو آبادی سے تھوڑا ہٹ کر نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ اس طرف جاتا تھا۔ اس مختصر سے سفر کے دوران ہمارے درمیان گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے اے ایس آئی شہزاد کا خیال آ گیا۔ میں نے مصطفیٰ سے پوچھ لیا۔

"تم اے ایس آئی شہزاد کو کس حد تک جانتے ہو؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چونکنے کو میں نے اس کی تیزی سے مڑتی ہوئی گردن کے سبب محسوس کیا تھا۔ کیونکہ رات کی تاریکی چہرے کے تاثرات کو دیکھنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اس کی آواز سے بھی تشویش جھلکنے لگی، وہ بولا۔

"ملک صاحب! کیا آپ یہ سوال کسی خاص حوالے سے کر رہے ہیں؟"

"ہاں، خاص حوالہ ہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "اور وہ حوالہ تم ہو۔"

"میں......؟" اس کی تشویش الجھن میں بدل گئی۔ "میں کس طرح ملک صاحب؟"

"میں نے محسوس کیا ہے، شہزاد تم سے بڑی گہری محبت کرتا ہے!" میں نے کہا۔

"ہمارے درمیان کبھی ایسا رشتہ استوار نہیں ہو سکا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مصطفیٰ۔" میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔ پھر شہزاد سے ہونے والی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد کہا۔ "میں نے محسوس کیا ہے، وہ تم سے شدید حسد کرتا ہے۔ اس کی وجہ تم ہی بتا سکتے ہو۔"

"وہ حسد سے بھی چار ہاتھ آگے بڑھ کر مجھ سے سخت نفرت کرتا ہے ملک صاحب!" مصطفیٰ نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔"

جب میں نے مذکورہ وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اے ایس آئی انتہائی ناقابلِ اعتبار شخص ہے۔ وہ اس لحاظ سے کہ سابق تھانہ انچارج سے اس کی بہت بنتی رہی ہے۔ رفیق سیال کو جن الزامات اور بدعنوانیوں کے باعث یہاں سے ہٹایا گیا تھا ان معاملات میں شہزاد اس کے معاون کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔ شہزاد کے چودھری دلدار سے بھی بڑے اچھے تعلقات تھے بلکہ بعض معاملات میں شہزاد، چودھری اور رفیق سیال کے درمیان پُل کا کام کرتا رہا تھا۔ مصطفیٰ کا شعبہ کرپشن نہیں تھا اس لئے وہ رفیق سیال کی بہت زیادہ معاونت اور خدمت نہیں کر سکا تھا لہٰذا جب میں نے مصطفیٰ کو اپنے قریب آنے کا موقع دیا تو شہزاد فوراً جیلس ہو گیا۔

مصطفیٰ کی پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا۔

"بھئی! پھر تو یہ اپنا اے ایس آئی بہت ہی خطرناک بندہ ہے۔"

"بالکل جناب! اس پر بھروسہ کرنا کام کو خراب کرنے کے مترادف ہے۔" مصطفیٰ نے کہا۔

شہزاد سے ملاقات کے وقت مجھے جو بات چبھ رہی تھی اور اس کا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اب وہ معاملہ بالکل واضح ہو گیا تھا۔ وہ مکار شخص میرے سامنے بھرپور اداکاری سے کام لے رہا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ شہزاد کو یہ پتہ نہیں چلنے دوں گا کہ میں اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہوں۔ اس اداکار کو میں بے خبری میں اداکاری کی مار ہی ماروں گا۔ اس سلسلے میں، میں نے مصطفیٰ کو بھی ضروری باتیں سمجھا دیں اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں شہزاد کی موجودگی میں اسے ڈانٹ ڈپٹ کروں تو وہ خاموشی سے سر جھکا کر سنتا رہے۔ اس طرح میں شہزاد کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا، کانسٹیبل مصطفیٰ کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ میرے اس رویے کے نتیجے میں شہزاد کھل کر سامنے آ سکتا تھا۔ کسی عیار اور فریبی شخص کو

مکروفریب ہی سے چت کیا جاسکتا ہے!

میں نے مصطفیٰ سے کہا۔ ''کل تم تھانے آنے کی بجائے سادہ لباس میں سیدھے جنگل کی طرف چلے جانا اور اس مقام کے آس پاس رہ کر کھوجی تاج دین کا انتظار کرنا جہاں اس نے کھرے کے سلسلے میں کوئی نشانی وغیرہ لگا رکھی ہے۔ میں تاج دین کو سمجھا کر ادھر روانہ کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ''جو آپ کا حکم، میں وہی کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''جب تم لوگوں کا کام مکمل ہو جائے اور اس کام کے نتائج تمہاری سمجھ میں آ جائیں تو تم کھوجی کو فارغ کر دینا۔ اسے اپنے ساتھ تھانے لانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی مدد اور تعاون کی اگر مزید ضرورت محسوس ہوئی تو ہم دوبارہ اس کی خدمات حاصل کر لیں گے۔ اس کے بعد تم وردی پہن کر تھانے آ جانا۔'' میں سانس لینے کے لئے رکا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری غیر موجودگی میں، میں عملے کے ہر شخص خصوصاً شہزاد سے تمہارے بارے میں استفسار کروں گا۔ ظاہر ہے، کسی کو تمہاری غیر حاضری کا علم نہیں ہو گا۔ جب تم واپس آؤ گے تو تمہارے بغیر اطلاع غیاب پر مجھے تمہیں ڈانٹنے کا موقع مل جائے گا۔ جب تک نوری مرڈر کیس حل نہیں ہو جاتا، ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور یہ کیس ہم دونوں مل کر حل کریں گے۔ اس تھانے اور اس علاقے کے طرم خانوں کو میں بعد میں ٹھیک کر لوں گا۔ میں محسوس کر رہا ہوں بلکہ دیکھ رہا ہوں، یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔ ''بس ...... چند دن کی بات ہے!''

ہم باتیں کرتے اور منصوبے بناتے ہوئے ڈیرے پر پہنچ گئے۔

چودھری دلدار کا ڈیرا بھی عام ڈیروں جیسا ہی تھا۔ ایک کشادہ احاطے میں پچھلی جانب تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے وسیع و عریض صحن تھا جس میں تین چار درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ڈیرے کا داخلی گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اتنا بڑا گیٹ تھا کہ کوئی ٹریکٹر، ٹرالی یا ٹرک با آسانی اس میں سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ مصطفیٰ نے کہا۔

''ملک صاحب! آ جائیں ...... اتفاق سے گیٹ کھلوانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مگر اجازت لینے کی ضرورت ہے۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

کانسٹیبل میری بات کی تہہ میں پہنچ گیا۔ اس نے قدرے ندامت سے اثبات میں سر ہلایا

اور آگے بڑھ کر کھلے ہوئے گیٹ کے پٹ پر دستک دینے لگا۔ میں نے عقب سے کہا۔

''مصطفیٰ! جب تک کوئی شخص مجرم یا کم از کم ملزم ثابت نہ ہو جائے، ہمیں اس کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں نارمل اور شائستہ رویے کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ بغیر اجازت منہ اٹھا کر کسی کے گھر میں داخل ہو جانا اخلاقاً اور قانوناً جرم ہے۔ ہم تو قانون کے رکھوالوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر ہم ہی ان چھوٹے چھوٹے ضابطۂ اخلاق کا خیال نہیں رکھیں گے تو دوسروں کو قانون شکنی سے کیسے روک پائیں گے؟''

''آئی ایم سوری ملک صاحب!'' وہ شرمندگی سے بولا اور دوبارہ دستک دی۔

اس دستک کے جواب میں ایک ہٹا کٹا شخص نمودار ہوا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ گڑبڑا گیا۔ اس نے تاریکی کے باوجود بھی ہماری وردیاں دیکھ کر صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اچانک بھاگ کھڑا ہو گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

بڑے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آیئے سرکار! آیئے ...... اس وقت ڈیرے کی طرف۔ خیریت تو ہے ناں تھانے دار صاحب؟''

اس کی بات سے بہت سی اہم چیزیں کھل کر سامنے آ گئیں۔ نمبر ایک، وہ ہمیں اس ڈیرے پر دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ نمبر دو، اسے اپنے اعصاب پر اچھا خاصا کنٹرول حاصل تھا کیونکہ اس نے اپنی گھبراہٹ پر ایک لمحے میں قابو پا لیا تھا اور نمبر تین، اس نے مجھے نئے تھانے دار کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ بات ختم کرتے ہی اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ بھی کر دیا لہٰذا ہم ڈیرے میں داخل ہو گئے۔

کشادہ صحن میں تین چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر چادر بچھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں اس پہلوان نما شخص کی معیت میں چلتے ہوئے چارپائیوں کے قریب پہنچے تو اس نے چادر بچھی چارپائی کی جانب اشارہ کر دیا۔ اب وہ مزید سنبھل چکا تھا۔

''بیٹھیں مائی باپ! میرے لئے کیا حکم ہے؟''

''ہم بیٹھنے نہیں آئے۔'' میں نے ڈیرے میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا ساتھی کہیں نظر نہیں آ رہا؟''

''امتیاز اپنے گھر گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا اور اس جواب نے مجھے بتا دیا، اس وقت میں یعقوب عرف قوبا سے ہم کلام تھا۔ ''اس کی بیوی بیمار ہے۔'' پھر وہ معنی خیز انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''نغمہ اس احمق کو گاہے بہ گاہے اسی طرح بے وقوف بناتی رہتی ہے۔ کل بھی وہ اس

کی بیماری کا بتا کر چلا گیا اور آج بھی اس نے یہی کیا ہے۔ لگتا ہے مجھے چودھری صاحب کو بتانا پڑے گا۔ میں ڈیرے پر اکیلا تو نہیں رہ سکتا ناں! یا تو چودھری صاحب امتیاز کی بیوی کا علاج کروائیں یا پھر یہاں کے لئے کوئی دوسرا بندہ دیں۔ اب دیکھیں ناں، میں آپ کی کوئی خدمت شدمت بھی نہیں کر سکتا۔ اگر دوسرا بندہ موجود ہوتا تو میں اسے بھیج کر آپ کے لئے کچھ منگوا لیتا۔''

اس نے سانس لئے بغیر مجھے جتنی معلومات فراہم کر دیں، میں نے ان کے لئے ایک بھی سوال نہیں کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا، وہ محض اوپر سے سنبھلا تھا۔ اندر اس کے اب بھی اچھی خاصی گڑبڑ چل رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خالص تھانے دارانہ لہجے میں کہا۔

''قوبا! تم ہماری خدمت کے لئے زیادہ پریشان نہ ہو۔ ہم دراصل تمہاری خدمت کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ تمہیں چودھری دلدار اور امتیاز کی بیوی کے لئے بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کا علاج میں خود اپنی نگرانی میں کراؤں گا۔ تم اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو میں جو بھی پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے ناں؟''

''جناب! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ یک دم بے حد متفکر ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''میں اس سے بھی زیادہ خطرناک اور سنگین باتیں کر سکتا ہوں۔ شکر کرو، ابھی تک تم آزاد کھڑے ہو ورنہ یہی باتیں کرنے کے لئے میں تمہیں گرفتار کر کے تھانے بھی لے جا سکتا ہوں!''

اس کی الجھن اور پریشانی سوا ہو گئی۔ میں نے ایک خاص مقصد کے تحت ابتداء ہی میں خاصا جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا تاکہ اس پر واضح ہو جائے کہ میں ذرا وکھری ٹائپ کا تھانے دار ہوں۔ وہ متذبذب حالت میں کھڑا سہمی ہوئی نظر سے کبھی مجھے اور کبھی مصطفیٰ کو دیکھتا چلا گیا پھر لکنت زدہ انداز میں بولا۔

''مائی باپ! بتائیں تو سہی، آخر معاملہ کیا ہے؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے ''معاملے'' سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں کچھ نہیں جانتا...... آپ نے جو کچھ بھی پوچھا ہے، مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں...... آپ یقین کریں......''

وہ بولتے بولتے جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے انداز اور گھبراہٹ نے مجھے بتا دیا کہ دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ یہ پوری کی پوری دال ہی کالی ہے۔ میں نے اس ڈیرے پر مزید تفتیش کرنا ضروری نہ سمجھا اور یعقوب عرف قوبا کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ اس کے لئے مناسب مقامِ تفتیش یہی ہو سکتا تھا۔

جب ہم تھانے پہنچنے والے تھے تو میں نے مصطفیٰ کو مخصوص اشارہ کیا اور با آواز بلند کہا۔

''تم ذرا جا کر امتیاز کی بیوی کی خیریت معلوم کرو۔ قوبا کے بعد اس کا علاج بھی کرنا ہے اور ہاں...... صبح والی ڈیوٹی کو یاد رکھنا!''

وہ ''اوکے سر!'' کہتے ہوئے دوسرے راستے پر ہو لیا۔

میں نے مبہم اور معنی خیز انداز میں مصطفیٰ کو ہدایت کی تھی کہ وہ قوبا کے بیان کی تصدیق کے لئے امتیاز اور اس کی بیوی سے ضرور ملے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ امتیاز، احمد نگر میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ کھوجی تاج دین کے مطابق، دو گھڑ سوار اس ڈیرے سے گھنے جنگل کی طرف گئے تھے۔ امتیاز کی غیر حاضری یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ ان دو گھڑ سواروں میں کہیں ایک امتیاز ہی تو نہیں تھا......!

میں نے قوبا کو اپنے کمرے میں لا کر واشگاف الفاظ میں کہا۔

''میں تمہیں بچنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے یہ موقع گنوا دیا تو سمجھ لو، تمہارا چودھری دلدار اور اس کا پورا خاندان بھی تمہیں پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکے گا۔''

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ آپ یقین کریں، میں قاتل نہیں ہوں...... میں بے گناہ ہوں۔''

میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''تمہارے بے گناہ یا گناہ گار ہونے کا فیصلہ میں خود کروں گا۔ تم صرف میرے ان سوالات کے جوابات دو اور اس نکتے کو ذہن میں رکھو کہ میں یہ سوالات دہراؤں گا نہیں، قطعاً نہیں۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور انتہائی سفاک لہجے میں کہا۔

''جس نامعلوم عورت کی لاش جنوبی کے کھیتوں میں سے ملی ہے وہ کون تھی اور کہاں کی رہنے والی تھی؟ وہ گزشتہ رات یعنی قتل ہونے سے پہلے کس آدمی کے ساتھ تمہارے ڈیرے پر پہنچی تھی؟ اس رات ڈیرے پر جو دو گھڑ سوار روانہ ہوئے وہ کون تھے؟ وہ مقتولہ کو اپنے ساتھ کس مقصد سے لے کر گئے تھے اور ان کی منزل کہاں تھی؟ مذکورہ عورت کو قتل کرنے کے بعد

وہ کہاں غائب ہو گئے؟"

میں نے ڈیرے پر بھی اور یہاں تھانے میں بھی قوبا کو یہ نہیں بتایا کہ میری ان تمام تر معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔ کھوج کا کام ابھی اگلے روز بھی ہونا تھا لہٰذا اس مشن کو خفیہ رکھنا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے تاج دین اور مصطفیٰ کو بھی ہدایات دے کر سمجھا دیا تھا تاہم اے ایس آئی شہزاد کی طرف سے مجھے کھٹکا تھا۔ جب سے یہ پتہ چلا تھا، وہ چودھری دلدار سے گہرے روابط رکھتا تھا، بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت تھی۔ وہ کم بخت یہ بات جانتا تھا کہ میں نے کھوجی تاج دین کو تھانے بلوا کر کوئی اہم ذمہ داری سونپی تھی۔

قوبا نے وحشت زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے وہ تمام تر سوالات سنے اور ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلانے لگا۔ "آپ یقین کریں تھانے دار صاحب......!"

اس نے اسٹارٹ ہی لیا تھا کہ میں نے ایک زوردار دبکا مار کر اسے چپ کرا دیا۔ اس کی ڈھٹائی نے مجھے طیش دلا دیا تھا۔ میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے یقین کر لیا کہ تم انسان نہیں بلکہ حیوان ہو۔ تم جیسے جنگلی درندے شرافت کی زبان نہیں سمجھتے لہٰذا میں تمہیں سدھارنے کے لئے حوالدار جامی شاہ کے حوالے کر رہا ہوں۔ وہ خوف ناک سے خوف ناک تر درندوں کو بڑے نستعلیق انداز میں بولنا سکھا دیتا ہے!"

اور پھر میں نے جامی شاہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"حکم ملک صاحب؟" جامی شاہ نے میرے پاس آ کر کہا اور تیز نظر سے قوبا کو گھورنے لگا۔

جامی شاہ ایک لحیم شحیم اور قد آور حوالدار تھا۔ اس پر اس کے چہرے کی کرختگی اور قیامت ڈھاتی تھی۔ اس کا رنگ توے کو شرماتا تھا۔ آنکھ بھی "ڈیڑھ" ہی تھی اور وہ بھی ہر وقت سرخ ہی رہتی تھی جیسے خونِ کبوتر میں نہائی ہوئی ہو۔ واضح کر دوں کہ جامی شاہ کے چہرے پر دیکھنے والوں کو دونوں آنکھیں ہی نظر آتی تھیں لیکن صرف واقفانِ حال ہی جانتے تھے کہ ایک آنکھ میں روشنی نہیں۔ ناواقف ہمیشہ دھوکا کھا جاتے تھے کہ جامی شاہ ان کی طرف دیکھ رہا ہے جب کہ وہ مخالف سمت میں دیکھ رہا ہوتا تھا اور اگر وہ اس کے برعکس سمجھتے تو نتیجہ بھی برعکس ہی برآمد ہوتا تھا۔ بہرحال، جامی شاہ کے گھورنے نے قوبا کو اچھا خاصا نروس کر دیا۔ اس پر ردا چڑھاتے ہوئے میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"شاہ جی! زندہ لوگوں کو قتل کر کے لاش میں بدلنا تو ایک عام سی بات ہے۔ میں ایک صحت مند لاش تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ تم اپنا ہنر آزماؤ اور اسے زندہ کر کے دکھا دو۔ ایسا زندہ کہ اس کی زبان کھل جائے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

وہ قوبا کو شکاری "نظر" سے تاڑتے ہوئے بولا۔ "آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب! میں اس لاش کو نہ صرف زندہ کر دکھاؤں گا بلکہ اس کی زبان کو بھی ایسا رواں کر دوں گا جیسے کوئی برساتی پرنالہ جاری ہوتا ہے۔" پھر وہ کسی قصائی کی طرح بڑے ماہرانہ انداز میں قوبا پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

"آ وَ لاش جی! آپ کا پیارا پیارا سا پوست ماتم کرتے ہیں۔"

"اس سے کچھ نہیں پوچھنا......ایک سوال بھی نہیں کرنا۔" میں نے تاکیدی لہجے میں جامی شاہ سے کہا۔ "صرف اسے اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ یہ میرے پوچھے ہوئے سوالات کے جوابات دینے کے لئے تیار ہو جائے!"

"او کے ملک صاحب! اس کا پوست ماتم آپ کی ہدایت کے مطابق ہوگا۔"

حوالدار جامی شاہ نے "پوست ماتم" کی ترکیب خود ہی بنا رکھی تھی اور اس کا مفہوم تھا، ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی تفتیش......جس کے دوران میں وہ ملزم کی پوست کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا کہ اس کا حشر دیکھ کر ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اس تفتیشی پوچھ گچھ کو اس نے "پوست ماتم" کا نام دے رکھا تھا۔ ویسے یہ ترکیب بڑی دلچسپ اور برمحل بھی تھی۔

جامی شاہ ملزم یعقوب عرف قوبا کو اپنے ساتھ ٹرائل روم کی طرف لے گیا تو میں نے اے ایس آئی شہزاد کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

"میں آرام کرنے کے لئے اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں یہ تھانہ تمہارے حوالے ہے۔ اگر کوئی اہم بات ہو تو مجھے بلا لینا ورنہ خود ہی تھانے داری کرتے رہنا۔"

وہ تشکر آمیز نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! اس اعتماد کا بہت بہت شکریہ۔ آپ بہت ہی اچھے انسان ہیں۔"

اگر میں اس کی اصلیت سے واقف نہ ہو چکا ہوتا تو اس کی مکارانہ اداکاری کو حقیقت سمجھ بیٹھتا۔ میں نے اعتماد اور بھروسے والی باتیں ایک خاص مقصد کے تحت اس سے کی تھیں تاکہ اسے اندازہ نہ ہو سکے کہ میں اسے کون سا ہاتھ دکھانے والا ہوں۔ اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لئے یہ اعتبار بازی ضروری تھی

میں نے اسے پکا کرنے کی غرض سے کہا۔ "میں نے ابھی ایک ملزم جامی شاہ کے حوالے کیا ہے۔ اس کی طرف سے ذرا ہوشیار رہنا۔ مجھے پتہ چلا ہے، قوبا چودھری دلدار کا آدمی ہے۔ تم جانتے ہو، اس تھانے میں چودھری کے وفادار بھی موجود ہیں۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کئے۔ چودھری کے وفاداروں کے ذکر پر اس کی

آنکھوں میں ایک معنی خیز رنگ سا اُبھرا تھا میں اس رنگ کی تفصیل تک پہنچ گیا اور معتدل انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ حوالدار جامی شاہ میری نظر میں بھروسے کا بندہ نہیں۔تم اس پر گہری نگاہ رکھنا۔ مجھے شک ہے یہ چودھری دلدار کے لئے اپنے دل میں بڑی گنجائش رکھتا ہے۔کہیں یہ خاموشی سے قوبا کو حوالات سے فرار نہ کروا دے......تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔''قوبا کو آپ میرے ہی حوالے سمجھیں۔ میں ملزم اور حوالدار دونوں پر کڑی نظر رکھوں گا۔صبح آپ کو ملزم اسی حوالات میں موجود ملے گا۔''

میرا مقصد پورا ہو گیا۔اب مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ قوبا واقعی کہیں نہیں جائے گا۔اگر اپنے محلے یا علاقے کو چوریوں اور ڈکیتیوں سے محفوظ رکھنا ہو تو اس علاقے کے چوروں اور ڈکیتوں کو چوکیداری کے فرائض سونپ دینے چاہئیں۔ مجھے یہ تو امید تھی شہزاد، قوبا کی گرفتاری کی خبر کسی بھی ذرائع سے چودھری تک ضرور پہنچائے گا لیکن اب یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ اسے فرار میں کوئی مدد نہیں دے گا۔

میں اپنی سیٹ سے اٹھا تو شہزاد نے پوچھ لیا۔''ویسے ملک صاحب! قوبا کو آپ نے کس چکر میں گرفتار کیا ہے؟''

یہ سوال کرتے ہوئے اس نے بڑا محتاط انداز اختیار کیا تھا۔ میں نے سرسری لہجے میں کہہ دیا۔''چکر کوئی خاص نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے، وہ چودھری کے علم میں لائے بغیر جرائم پیشہ افراد کو ڈیرے پر پناہ دیتا ہے۔بس اسی سلسلے میں اسے تھوڑی تفتیش سے گزارنا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات سامنے آ جائے۔''

وہ پُرمعنی انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے اپنی الماری کھولی اور فائلوں کا پلندا باہر نکال لیا پھر الماری کو تالا لگانے کے بعد میں اپنے کوارٹر کی جانب چل پڑا۔ یہ فائلیں میں کل رات بھی اپنے ساتھ لایا تھا لیکن نوری کی آمد نے مجھے اس طرف توجہ دینے کا موقع نہ دیا اور یہ سوچ کر میں انہیں تھانے سے اٹھا لایا تھا کہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کروں گا۔مگر آج کا دن اتنا ہنگامہ پرور گزرا تھا کہ فائلوں کا مطالعہ تو کیا، مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت میسر نہیں آ سکی تھی۔

میں اس عزم کے ساتھ انہیں ایک مرتبہ پھر کوارٹر لے آیا کہ آج کی رات میں ضرور ان کا جائزہ لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا!



بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ انسان انہیں کرنے کی مضبوط نیت رکھتا ہے لیکن وہ کسی نہ کسی وجہ سے التوا کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ فائلوں والا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ یہ تھانے سے کوارٹر میں اور کوارٹر سے تھانے آ جا رہی تھیں لیکن انہیں کھول کر دیکھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ یہ تمام نہایت ہی اہم معاملات سے متعلق فائلیں تھیں۔ اس رات میں نے ہر صورت انہیں کھول کر دیکھنے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن میں جیسے ہی رات کے کھانے سے فارغ ہوا، ایک نئی مصروفیت میری منتظر تھی۔

میں عموماً رات کو کھانا عشاء کی نماز سے تھوڑا پہلے کھاتا تھا اور نماز کی ادائیگی کے بعد اگر ہنگامی کام نہ ہوتا تو میں سونے کے لئے بستر پر لیٹ جاتا تھا۔ اس رات خاصی تاخیر سے کھانا کھایا تھا لہٰذا نماز سے فارغ ہونے میں بھی اچھی خاصی دیر ہو گئی۔ لگ بھگ گیارہ بجے رات میں اپنی چارپائی پر آیا۔ اب میں تسلی سے ان اہم فائلوں کو دیکھنا چاہتا تھا جو چارپائی کے قریب چھوٹی میز پر رکھی تھیں۔ اسی لمحے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔

میں صحن میں چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ چونک کر بیرونی دروازے کی طرف دیکھا اور زیر لب بڑبڑایا۔''اس وقت کون آ گیا؟''

دستک سن کر خود بخود میرا دھیان مقتولہ نوری کی طرف چلا گیا تھا۔گزشتہ رات وہ مجھ سے ملنے کوارٹر پر آئی تھی اور اپنے دُکھوں کی ایک جھوٹی کہانی سنا کر چلی گئی تھی۔ میں اس کی اس حرکت کو ابھی تک کسی خانے میں فٹ نہیں کر سکا تھا۔ اس نے بلا مقصد تو اتنا بڑا قدم نہیں اٹھایا ہو گا۔لیکن مقصد واضح ہونے سے پہلے وہ اپنے حسرت ناک انجام سے دوچار ہو گئی تھی۔

اب اس کے قاتل ہی سے ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ شخص اگر ہاتھ آ جاتا تو بہت سے سربستہ راز افشا ہو سکتے تھے۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے کوارٹر کا دروازہ کھول دیا کہ شاید تھانے میں کوئی ایمرجنسی پیش آ گئی ہے اور کوئی مجھے بلانے کے لئے آیا ہے لیکن کھلے ہوئے دروازے میں کانسٹیبل مصطفیٰ کی صورت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا اور پوچھا۔

''خیریت تو ہے نا مصطفیٰ! تم اس وقت؟''

''بالکل خیریت ہے جناب۔'' اس نے کوارٹر کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔''میں آپ کے پاس سے جانے کے بعد سیدھا امتیاز کے گھر گیا تھا تاکہ قوبا کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔

امتیاز تو گھر پر نہیں مل سکا۔ اس کی بیوی نغمہ سے میں نے تفصیلی بات کی ہے۔ اس نے چند اہم باتیں اُگلی ہیں۔ میں نے سوچا، فوراً آپ کے علم میں لے آؤں۔ اسی لئے اتنی رات کو زحمت دے رہا ہوں۔''

''زحمت کی کیا بات ہے۔'' میں نے بیرونی دروازہ بند کر کے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''اہم کام کے لئے تو تم مجھے رات کے کسی بھی پہر اٹھا سکتے ہو۔ ویسے میں ابھی تک جاگ ہی رہا تھا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''نغمہ نے کون سی کام کی باتیں بتائی ہیں؟ میں محسوس کر رہا ہوں، ان باتوں کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے نوری مرڈر کیس سے ہوگا۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''قوبا نے سراسر غلط بیانی سے کام لے کر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس پر سختی کی جائے تو مجھے یقین ہے، ہم نوری کے قتل والا معمہ حل کر سکتے ہیں۔''

''قوبا کی تو تم فکر نہ کرو۔ میں نے اسے جامی شاہ کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ اس کے گوشت پوست کا ماتم خاتم بڑے تسلی بخش انداز میں کر لے گا۔ تم سناؤ، نغمہ نے امتیاز کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''پہلی بات تو یہ کہ نغمہ پچھلے دو مہینوں سے ذرا سی بھی بیمار نہیں ہوئی۔'' مصطفیٰ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''قوبا نے اس کی بیماری کے سلسلے میں جھوٹ بولا ہے۔ دوسرے امتیاز کے بارے میں بھی قوبا کی دروغ گوئی پکڑی گئی ہے۔ نغمہ کے مطابق امتیاز، چودھری دلدار کے کسی ضروری کام سے کل صبح موضع جنڈیالہ کلاں گیا تھا اور بیوی کو بتایا تھا کہ دو دن کے بعد واپس آئے گا یعنی اس کی واپسی کل ہوگی۔ بس، یہ ہے ساری کہانی جناب!''

مصطفیٰ کی بات سن کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ قوبا نے ہم سے ایک کھلا جھوٹ بولا تھا۔ جب بھی کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے، وہ کوئی خاص بات چھپانا چاہتا ہے۔ قوبا نے امتیاز کے حوالے سے غلط بیانی کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا، وہ نہیں چاہتا کہ ہم امتیاز کے غیاب کے بارے میں حقائق تک پہنچ سکیں۔ اب ایک ہی طرف دھیان جاتا تھا، جو دو گھڑ سوار نوری کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچے تھے ان میں ایک یقینی طور پر امتیاز ہی تھا۔

میں نے مصطفیٰ سے پوچھا۔ ''یہ موضع جنڈیالہ کلاں کس طرف واقع ہے؟''

''جناب! یہ گاؤں یہاں سے انتہائی جنوب میں واقع ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہاں

تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ سیدھی پختہ سڑک ہے۔ اس پر جنوب کی سمت سفر کریں تو ایک چھوٹا سا قصبہ فیض آباد آتا ہے۔ فیض آباد سے یہ سڑک تھوڑی سی مغرب کی جانب گھوم جاتی ہے۔ اسی گھماؤ کے مقام سے ایک کچی سڑک نکل کر قدرے مشرق کی طرف بڑھتی ہے جو سیدھی موضع جنڈیالہ کلاں تک پہنچتی ہے۔ جنڈیالہ کلاں ایک خاصا بڑا گاؤں ہے۔''

''اور دوسرا راستہ؟'' مصطفیٰ رکا تو میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ ''دوسرا راستہ جنگل میں سے گزرتا ہے۔''

''جنگل میں سے؟'' میں چونک اٹھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! جائے وقوعہ کی جانب سے اگر جنگل میں داخل ہوا جائے تو جنوب مشرق کی سمت میں سفر کرتے ہوئے جب جنگل سے باہر نکلیں تو سامنے کھیتوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ملتا ہے۔ یہ کھیت دراصل جنڈیالہ کلاں ہی کی حدود میں آتے ہیں۔ ان کھیتوں کے جنوب میں موضع جنڈیالہ کلاں واقع ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جنڈیالہ کلاں سے اگر پانچ میل مشرق کی طرف جائیں تو ایک چھوٹا سا گاؤں جنڈیالہ خورد واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہ دونوں گاؤں ایک ہی چودھری خاندان کی عمل داری میں تھے اس لئے ان کے نام بھی ایک جیسے تھے۔ چھوٹے بڑے کے فرق کو واضح کرنے کے لئے ساتھ ''کلاں'' اور ''خورد'' لگا دیا گیا تھا...... پھر زمین و جائیداد کی طرح خاندان کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔ اب ان دونوں گاؤں میں دو مختلف خاندان اپنی اپنی چودھراہٹ جمائے بیٹھے ہیں۔ اگرچہ نام اب بھی جنڈیالہ خورد اور جنڈیالہ کلاں ہی ہے۔''

مصطفیٰ گاؤں کے فرق کو واضح کر رہا تھا اور جنگل کے حوالے سے میرا ذہن نوری کے قاتل کے تعاقب میں دوڑ رہا تھا۔ کھوجی تاج دین کے مطابق دونوں گھڑ سوار ایک خاص مقام سے گھنے جنگل میں داخل ہوئے تھے۔ اگر وہ مصطفیٰ کے بیان کردہ راستے پر سفر کرتے تو سیدھے جنڈیالہ کلاں پہنچ جاتے۔ امتیاز کی بیوی نغمہ نے بتایا تھا کہ چودھری دلدار نے کسی ضروری کام سے امتیاز کو جنڈیالہ کلاں بھیج رکھا تھا۔ ہمیں یہ شک تھا کہ قوبا کے ڈیرے سے روانہ ہونے والے دو گھڑ سواروں میں سے ایک امتیاز تھا۔ یہ تمام کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک زنجیر کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ میں انہی خیالوں میں مستغرق تھا کہ مصطفیٰ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

وہ پوچھ رہا تھا۔ ''ملک صاحب!...... میرے لئے کیا حکم ہے؟ اگر میری ضرورت ہو تو میں

ادھر ہی رک جاتا ہوں۔ نغمہ کے انکشاف نے حالات میں خاصی سنسنی دوڑا دی ہے۔ امتیاز کی ذات بہت زیادہ مشکوک نظر آنے لگی ہے۔''

''ہاں، صورتِ حال تو کچھ ایسی ہی ہے مصطفیٰ! لیکن تمہیں یہاں رکنے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''امتیاز کے حوالے سے میں بھی اس انداز میں سوچ رہا ہوں جیسا کہ تم۔ بہرحال صبح تک قوبا کی زبان بھی کھل جائے گی۔ میں ذرا اس کی کہانی بھی سن لوں پھر آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کریں گے۔'' میں سانس لینے کے لئے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے نغمہ کے مطابق امتیاز بھی کل ہی جنڈیالہ کلاں سے واپس آئے گا۔ وہ ہاتھ آ جائے تو اس کیس کی کڑیاں سیدھی طرح بیٹھ جائیں گی۔ تم پروگرام کے مطابق صبح آٹھ بجے جنگل کے اس حصے میں پہنچو جہاں سے تم نے کھوجی تاج دین کے ساتھ مل کر کھرے کا کام مکمل کرنا ہے اور اگر واقعی ان دو گھڑ سواروں کا کھرا تم لوگوں کو موضع جنڈیالہ کلاں تک لے جاتا ہے تو پھر گاؤں میں گھوم پھر کر امتیاز کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا!''

مصطفیٰ نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایت کے عین مطابق عمل کرے گا۔ پھر وہ میرے کوارٹر سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں حالاتِ حاضرہ پر غور کرتا رہا۔ پھر ان فائلوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو ایک چھوٹی سی میز پر رکھی تھیں اور انہیں کھول کر دیکھنے کا موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے لیکن میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا شائبہ تک نہیں تھا لہٰذا میں نے یہی سوچا کہ فائلوں کو دیکھنے کا اس سے زیادہ مناسب موقع نہیں ملے گا۔ میں محسوس کر رہا تھا، آنے والا دن آج کے دن سے بھی کہیں زیادہ ٹف اور مصروف ثابت ہوگا۔

وہ کُل چار فائلیں تھیں لیکن جب میں نے ان کی طرف ''توجہ'' کی تو وہ تین ہو چکی تھیں۔ ان میں اس وقت سرخ کور والی ایک فائل مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، گزشتہ رات جب میں ان فائلوں کو الماری سے نکال کر کوارٹر میں لایا تھا تو مذکورہ سرخ کور والی فائل ان میں موجود تھی۔ آج صبح جب میں انہیں اپنے ساتھ تھانے لے کر گیا تو میں نے اس طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا...... اور اب بھی میں انہیں ایسے ہی اٹھا لایا تھا۔ آج کا دن اتنی افراتفری اور ہنگامہ خیزی میں گزرا تھا کہ مجھے کسی اور طرف دھیان دینے کا موقع نہ مل سکا۔

میں نے چند لمحات تک اس سرخ کور والی فائل کے بارے میں سوچا۔ جب کچھ یاد نہ آیا تو

میں نے یہی فرض کر لیا کہ الماری میں سے فائلیں نکالتے ہوئے وہ وہیں رہ گئی ہوگی۔ جی میں آیا کہ اس فائل کو صبح چیک کر لوں گا، جو موجود ہیں ذرا ان کا مطالعہ کر لوں لیکن پاسبانِ عقل نے مجھے فوراً چوکنا کر دیا اور ذہن میں یہ معقولہ (مقولہ) گردش کرنے لگا...... آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہئے!

ابھی تک میں نے ان فائلوں کو کھول کر نہیں دیکھا تھا اس لئے میں نہیں جانتا تھا، ان میں کون کون سے راز محفوظ ہیں۔ میری چھٹی حِس پکار پکار کر کہنے لگی، پہلے مجھے سرخ کور والی فائل کے بارے میں اطمینان کر لینا چاہئے کہ وہ میرے کمرے والی الماری میں موجود ہے یا نہیں اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھنا چاہئے۔ فائلوں کو کھول کر ان کا مطالعہ کرنا بعد کی باتیں ہیں۔

میں نے چھٹی حِس کی پکار کو لائق توجہ جانا کیونکہ اس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ میں اپنے کوارٹر کا داخلی دروازہ بند کر کے تھانے کی طرف آ گیا۔ میں نے عمارت والے حصے میں قدم رکھا تو میری سماعت تک ایک ایسی آواز نے رسائی حاصل کی جس کو سن کر یوں محسوس ہوا جیسے کسی جانور کو بڑی بے دردی سے ذبح کیا جا رہا ہو۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ مجرموں کا سرجن جامی شاہ ایک زندہ لاش کے ''پوست ماتم'' میں مصروف تھا!

میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور جیب سے چابی نکال کر اس آہنی الماری کو کھولنے لگا جس میں مذکورہ فائلوں کو رکھا جاتا تھا۔ میں نے اس الماری کے بیضی قفل میں ابھی چابی داخل ہی کی تھی اور اسے گھمانے کا ارادہ رکھتا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے تالا کھولنے کے ارادے کو موقوف کر کے فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

میرے کمرے میں اے ایس آئی شہزاد کھڑا تھا۔ مجھ سے نظریں ملیں تو وہ سنجیدگی سے بولا۔''ملک صاحب! خیریت تو ہے...... اس وقت اچانک آپ تھانے میں؟''

''بس، ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں؟'' وہ ہمدردانہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے کہا۔''تمہیں جاگتے ہوئے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ ایسے ذمہ دار اور فرض شناس نوجوانوں کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے، تم ایک روز ضرور تھانہ انچارج بنو گے!''

میں نے دانستہ اس کے سامنے ریڈ فائل کا تذکرہ گول کر دیا تھا اور تعریفی جملے میں نے محض اسے مزید خوش فہمی میں مبتلا رکھنے کے لئے ادا کئے تھے۔ میں اس شخص کو بڑی احتیاط اور

خوبصورتی سے شکار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے کہے کو راست جانا اور ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب! اگر مجھے ترقی پا کر کسی تھانے کا چارج مل جائے تو میں اسے اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھوں گا۔''

میں الماری کھولنے کا ارادہ فی الحال ترک کر کے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور سٹولنے والے انداز میں شہزاد سے استفسار کیا۔

''قوبا کا کیا حال احوال ہے؟ میں نے ٹرائل روم کی طرف سے بڑی دردناک آوازیں ابھرتی سنی ہیں؟''

''جناب! قوبا اس وقت اپنے حوالدار کے قبضے میں ہے۔ اس جلاد کے شکنجے میں پھنسا ہوا بندہ اب قہقہے لگانے سے تو رہا!''

میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ قوبا سنا ہے چودھری دلدار کا خاص بندہ ہے۔ لیکن ابھی تک چودھری کی طرف سے کوئی ہلچل نظر نہیں آئی۔ اپنے بندے کی گرفتاری پر اسے یوں خاموش ہو کر تو نہیں بیٹھنا چاہئے!''

یہ بات کرتے ہوئے میں براہِ راست اس کی آنکھوں میں بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایسے تاثرات نظر آئے جیسے وہ اپنے دلی جذبات کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ لمحاتی تامل کے بعد اس نے کہا۔

''ممکن ہے، چودھری صاحب کو ابھی قوبا کی گرفتاری کا علم نہ ہوا ہو۔''

''ہاں، یہی بات ہو گی۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ جزبز ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''شہزاد! قوبا کے ساتھ ہی ڈیرے پر امتیاز نامی ایک شخص بھی ہوتا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے، چودھری دلدار نے اسے موضع جنڈیالہ کلاں کسی ضروری کام سے بھیج رکھا ہے۔ وہ کل وہاں سے واپس آئے گا۔ میں چاہتا ہوں وہ جیسے ہی احمد نگر شالی میں قدم رکھے، تم اسے پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ یہ کام تمہارے لئے زیادہ مشکل تو نہیں ہو گا؟''

''نہیں جناب! آپ کا حکم ہو تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم کل صبح اس وقت تک تھانے سے جانا نہیں جب تک میں اپنی سیٹ پر نہ پہنچ جاؤں۔ میں امتیاز کے سلسلے میں تمہیں چند ضروری ہدایات دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے یہ کام میری مرضی کے عین مطابق کر لیا تو پھر میں تمہیں اس سے بھی بڑا کام سونپوں

گا۔ اس کام کی تکمیل کے ساتھ ہی چاروں طرف تمہاری شہرت پھیل جائے گی۔ تم ایک دم سے مشہور ہو جاؤ گے۔''

وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سنتا رہا۔ ان باتوں میں اس کی ترقی اور شہرت کا پیغام چھپا ہوا تھا لہٰذا ظاہر ہے، اسے پسند بھی آ رہی ہوں گی۔ وہ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھا رہا پھر یہ کہہ کر اٹھ گیا۔

''میں ذرا ایک راؤنڈ لگا لوں۔ پھر آتا ہوں۔''

میں نے اس کی فرض شناسی اور مستعدی کو ایک مرتبہ پھر سراہا اور جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے جانے کے بعد میں دوبارہ آہنی الماری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے اس الماری کو کھول کر اندر سے باہر اور اوپر سے نیچے تک اس کا کونا کونا جھانک لیا لیکن میری مطلوبہ ریڈ فائل کہیں دکھائی نہ دی۔ اس بات پر میں الجھنے کے ساتھ ساتھ بے حد حیران بھی ہوا۔ میں نے کوارٹر سے لانے کے بعد تمام فائلیں اسی الماری میں لاک کی تھیں اور یہیں سے تالا کھول کر میں انہیں نکال کر لے گیا تھا۔ اس دوران میں نے ایک لمحے کے لئے بھی ریڈ فائل یا کسی بھی فائل کو اپنی میز پر نہیں رکھا تھا بلکہ تھانے میں تو مجھے انہیں ہاتھ لگانے کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی۔ پھر میری مطلوبہ فائل کہاں چلی گئی؟ میں اس مسئلے پر جتنا سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ میری غیر موجودگی میں اے ایس آئی شہزاد تھانے میں موجود رہا تھا۔ حالانکہ اس آہنی الماری کی چابی صرف میرے پاس ہوتی تھی اس کے باوجود بھی میں نے ایک لمحے کے لئے یہ ضرور سوچا کہ کہیں یہ شہزاد کی کوئی شرارت نہ ہو۔ اس کا پس منظر جو میرے سامنے آیا تھا اس کو دیکھتے ہوئے شہزاد سے ایسی کسی شیطانی کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔

اس آہنی الماری میں ان فائلوں کے علاوہ بھی بہت سارے کاغذات رکھے ہوئے تھے جو یقیناً سب کے سب اہم اور ضروری تھے۔ ایک لمحے کے لئے میرے جی میں آئی کہ میں الماری کے تمام تر موجودات کو باہر نکال کر میز پر ڈھیر کر دوں۔ اس کے بعد ایک ایک چیز کو خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر اندر رکھنا شروع کر دوں۔ اس طرح مطلوبہ فائل اگر اس الماری میں ہوتی تو مجھے ضرور مل جاتی۔ یہ ایک دقت طلب کام تھا لیکن میں نے اس کی تکمیل کے لئے ہمت باندھ ہی لی۔

اسی وقت حوالدار حامی شاہ میرے پاس آ گیا اور ایک مرتبہ پھر مجھے اپنے ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ حوالدار نے آدھی رات کو تھانے میں میری موجودگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں

کیا اور خالصتاً پیشہ وارانہ انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! میں نے ایک مشکل اور کامیاب آپریشن کر کے ''لاش'' کے دہانے میں زبان نامی ''آلہ'' فٹ کر دیا ہے۔ اب اس لاش کو بولنا آ گیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسی وقت اس کا کلام سن سکتے ہیں۔'' بات ختم کرتے ہی وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

یہ ایک خوش آئند اطلاع تھی۔ میں جامی شاہ کے ایک ایک لفظ کی معنی آفرینی کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا۔ الماری کے ''مشن'' کو ایک مرتبہ پھر پس پشت ڈال کر میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

''نیکی کے ایسے کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی جامی شاہ! لے آؤ اس حیوانِ ناطق کو۔''

وہ اٹھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے الماری کو تالا لگایا اور اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد حوالدار جامی شاہ، قوبا کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ قوبا کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا، جامی شاہ نے بڑی بے دردی سے اس کا ''پوست ماتم'' کیا تھا۔ وہ خاصا قابلِ رحم نظر آ رہا تھا۔ حوالدار نے اسے میرے سامنے کھڑا کیا اور پھر تن کر اس کے پہلو میں جم کر کھڑا ہو گیا۔

''ملک صاحب تم سے جو بھی پوچھیں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا'' حوالدار نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے کسی چکر بازی سے کام لینے کی کوشش کی تو سمجھ لینا، ابھی آدھی رات باقی ہے۔ میں تمہیں دوبارہ اسی ''آپریشن تھیٹر'' میں لے جاؤں گا جہاں ابھی ابھی تمہارا پوست ماتم (پوسٹ مارٹم) ہوا ہے۔ باقی کی آدھی رات تمہارا ''پوست خاتم'' ہو گا جس کے بعد نہ تم نظر آؤ گے اور نہ ہی تمہاری پوست۔ بولو، کیا ارادہ ہے؟''

''تھانے دار صاحب!'' قوبا میری طرف دیکھتے ہوئے گھگھیایا۔ ''خدا کے لئے مجھے حوالدار صاحب کے حوالے نہ کریں۔ یہ تو مار مار کر مجھے دنبہ ہی بنا دیں گے۔ پہلے ہی میرے ساتھ بہت زیادہ زیادتی ہو چکی ہے۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے سراسیمہ نظر سے حوالدار کی طرف دیکھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قوبا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سفاکی سے کہا۔ ''اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو پھر میرا یہ وعدہ ہے کہ تمہیں مزید ٹرائل سے نہیں گزرنا پڑے گا۔ بہ صورتِ دیگر......!''

میں نے دھمکی آمیز اور معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ مضطرب لہجے میں جلدی

سے بولا۔ ''نہیں، نہیں ...... تھانے دار صاحب! میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔ آپ جو پوچھیں گے، میں بتاؤں گا اور جو نہیں پوچھیں گے وہ بھی بتا دوں گا۔''

''بس اتنا ہی کافی ہے کہ میں جو پوچھوں، تم شرافت سے بتاؤ۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جناب! آپ پوچھیں۔'' اس کی جان میں جان آئی۔

میں نے پوچھا اور اس نے بتایا ...... اور ایسا بتایا کہ انکشافات کی بارش سی ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، اس کیس کی تمام گم شدہ کڑیاں چھم اور چھن سے میری میز پر آ گری ہوں۔ حوالدار جامی شاہ نے واقعی اس مجرم شخص کے دہانے میں سچ بولنے والی زبان فٹ کر دی تھی۔ پتہ نہیں، یہ پوست ماتم کا کمال تھا یا پیوند کاری کا کرشمہ! بہرحال، یہ ثابت ہو گیا، جیسا کہ ایک طویل عرصے سے ثابت ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی ثابت ہوتا رہے گا کہ خطرناک مجرموں کی زبان کھلوانے کے لئے ٹرائل روم اور وہاں کی جانے والی تفتیشی کارروائی کس قدر ضروری ہے!

آئندہ چند منٹ میں بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یعقوب عرف قوبا نے میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ بھی بتایا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اس میں میرے لئے بھی حیرت اور تشویش کے کئی پہلو موجود تھے۔

جو عورت نوری کے نام سے مجھ سے ملنے رات کو میرے کوارٹر پر آئی تھی اور مجھے مصطفیٰ کے بارے میں الٹی سیدھی کہانی سنا کر چلی گئی تھی اس کا اصل نام خدیجہ تھا۔ خدیجہ ملک غفار کی معتوب تھی اور معافی تلافی کے بعد دوبارہ اس کے زیر سایہ آنا چاہتی تھی۔ ملک غفار موضع جنڈیالہ کلاں کا چودھری تھا۔ خدیجہ کس سلسلے میں ملک غفار کی معتوب تھی، یہ ایک دراز قصہ ہے اور چونکہ موجودہ کیس سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس لئے میں اس کا ذکر گول کر رہا ہوں۔

ملک غفار نے اس سے کہا کہ اگر وہ اس کا ایک اہم کام کر دکھائے تو وہ اپنی ناراضگی کو بھول کر بالکل ویسا ہی ہو جائے گا جیسا خفگی سے پہلے تھا۔ خدیجہ ملک صاحب کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کو بھی داؤ پر لگانے کے لئے تیار تھی۔ ملک غفار نے خدیجہ کو اپنے ایک بندے مشتاق عرف مشتاقا کے ساتھ احمد نگر شالی بھیج دیا اور خدیجہ سے کہا کہ وہ مشتاقا کی ہدایت پر عمل کرے گی۔ اس اہم مشن کے سلسلے میں ملک غفار نے احمد نگر کے چودھری دلدار سے تفصیلی بات کر لی تھی۔ ملک اور چودھری میں دانت کاٹے کی دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ہر عیب فعل میں شریک رہا کرتے تھے۔ یہ ملک کا ایک نہایت ہی ضروری کام تھا

جس کے لئے چودھری نے اس سے تعاون کرنا تھا۔ چودھری نے اس سلسلے میں اپنے بندوں قوبا اور امتیاز کو خصوصی ہدایات دے دی تھیں۔

خدیجہ مشتاقا کے ساتھ شام کے وقت چودھری دلدار کے ڈیرے پر پہنچی۔ وہاں قوبا اور امتیاز ان کے استقبال اور مدد کے لئے موجود تھے اسی رات امتیاز، خدیجہ کو اپنے ساتھ لے کر تھانے کی طرف چلا آیا۔ وہ خود تو بڑے میدان کے دوسرے کنارے پر رک گیا اور خدیجہ کو میرے کوارٹر کی طرف روانہ کر دیا۔

خدیجہ کو بڑی اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ اس نے بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کون سا کارنامہ انجام دینا ہے۔ وہ سرتاپا چادر میں لپٹی ہوئی رات دس بجے میرے کوارٹر میں آ گئی۔ میں نے اس کی دکھ بھری کہانی سنی اور تسلی دلاسا دے کر اسے رخصت کر دیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ خدیجہ نے اپنی مظلومیت کا رونا رو کر مجھے کون سا ہاتھ دکھا دیا تھا۔ جب میں اسے چارپائی پر بٹھا کر اپنے لئے کرسی لینے کے لئے کمرے میں گیا تھا تو اسے ''کام'' دکھانے کا موقع مل گیا۔ میری چارپائی کے نزدیک چھوٹی میز پر وہ چاروں فائلیں رکھی تھیں جنہیں مطالعے کی غرض سے میں اٹھا لایا تھا۔ خدیجہ نے نہایت صفائی کے ساتھ سرخ جلد والی فائل کو میز سے اٹھایا اور اپنی چادر کے اندر غائب کر دیا۔ یہی وہ مشن تھا جو ملک غفار نے اسے سونپا تھا۔ اس نے اپنے ''آقا'' ملک غفار کے سامنے سرخرو ہونے کا بندوبست کر لیا تھا۔

میری ہمدردیاں سمیٹ کر وہ کوارٹر سے چلی گئی۔ اس دوران میں اس کی الم ناک داستانِ حیات سننے میں اس قدر محو رہا کہ ایک لمحے کے لئے بھی میرا دھیان میز والی فائلوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ اور بعد میں بھی ایسی افراتفری رہی کہ مجھے فائلوں کو ہاتھ لگانے کا موقع نہ مل سکا اور جب آج رات موقع ملا تو میں نے ریڈ فائل کو غائب پایا اور...... اب قوبا اسی ریڈ فائل کے حوالے سے سنسنی خیز انکشاف کر رہا تھا۔

اس کے مطابق، میرے کوارٹر سے نکلنے کے بعد خدیجہ بڑے میدان کے دوسرے کنارے پر پہنچی جہاں امتیاز اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ دونوں احتیاط سے چلتے ہوئے کسی کی نگاہ میں آئے بغیر محفوظ راستے سے ڈیرے پر پہنچ گئے۔

یہاں سے مشتاقا اور امتیاز گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ خدیجہ، مشتاقا کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھی اور وہ لوگ موضع جنڈیالہ کلاں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ریڈ فائل کو مشتاقا نے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ امتیاز کو محض ان کے ساتھ اور مدد کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔ یہ چودھری دلدار کا حکم تھا۔ امتیاز نے انہیں بہ حفاظت جنڈیالہ کلاں پہنچا کر واپس احمد نگر آ جانا تھا۔ قوبا کی معلومات بس یہیں تک محدود تھیں۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

''خدیجہ کو امتیاز نے قتل کیا ہے یا مشتاقا نے؟''

''جناب! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر معلوم ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔ امتیاز واپس آ جائے تو پھر ہی اس راز سے پردہ اٹھے گا۔''

میری تجربہ کار اور مجرم شناس نظر نے بہ خوبی اندازہ لگا لیا کہ قوبا غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''امتیاز سے تو میں پوچھ ہی لوں گا لیکن اگر تمہارے بیان میں کوئی گڑبڑ نکلی تو میں تمہاری کھال کھنچوا دوں گا۔ یہ بات ذہن میں رکھنا۔''

''جناب...... میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

''اب آپ کی مرضی ہے، یقین کریں یا نہ کریں۔''

میرے ذہن میں ریڈ فائل کے حوالے سے کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ میں ابھی تک اس فائل کا مطالعہ نہیں کر سکا تھا۔ میں نے کڑے لہجے میں قوبا سے استفسار کیا۔ ''جو فائل میرے کوارٹر سے اُڑائی گئی تھی اس میں کون سا راز بند تھا؟''

لمحے بھر کو وہ مجھے متذبذب نظر آیا...... یوں محسوس ہوا وہ کوئی بات چھپانے یا بات کو مروڑ کر پیش کرنا چاہتا ہے۔ میں نے جارحانہ انداز میں جامی شاہ سے کہا۔

''شاہ جی! لگتا ہے تمہاری خدمات کی اور ضرورت پڑے گی!''

میرے لہجے میں اس قدر سنگینی اور سفاکی شامل تھی کہ قوبا لرز کر رہ گیا، جلدی سے بولا۔

''تھانے دار صاحب! آپ میری خاموشی کا غلط مطلب نہ نکالیں۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا، آپ کو کہاں سے بتانا شروع کروں۔''

جامی شاہ کے ٹریٹ منٹ نے اسے اچھا خاصا سدھار دیا تھا۔ اس کا ذکر سنتے ہی وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا اور چپکے چپکے کن آنکھیوں سے حوالدار کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ میں نے گرج دار آواز میں کہا۔

''اگر تم نے سوچ لیا ہے تو فوراً میرے سوال کا جواب دے دو۔''

اس نے جواب میں ٹھہر ٹھہر کر بتایا کہ سابق تھانہ انچارج نے ملک غفار کے خلاف کچھ ایسے شواہد اور ثبوت جمع کر لئے تھے کہ ملک ڈاکوؤں کے ایک گروہ کی پشت پناہی کرتا تھا۔ یہ گروہ اس جنگل اور آس پاس کے علاقوں میں بڑی بڑی وارداتیں کرتا اور اپنی ''آمدنی'' کا

نصف حصہ وہ لوگ ملک غفار کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ڈاکوؤں اور ملک غفار کی اس منافع بخش ''رشتے داری'' کے کاغذی ثبوت ریڈ فائل میں محفوظ تھے اور وہ ریڈ فائل سابق تھانہ انچارج رفیق سیال کے قبضے میں تھی۔

رفیق سیال، چودھری دلدار سے گہری دوستی رکھتا تھا اور چودھری دلدار، ملک غفار کا لنگوٹیا یار تھا۔ چودھری نے پوری کوشش کر لی کہ وہ فائل تھانہ انچارج یا تو ان کے حوالے کر دے یا پھر ان تمام ثبوتوں کو تلف کر دے لیکن تھانہ انچارج ان دونوں سے زیادہ کائیاں، سیانا اور گرگ باراں دیدہ تھا۔ جب بھی چودھری اس فائل کا ذکر کرتا، وہ مسکرا کر کہہ دیتا...... چودھری صاحب! میرے ہوتے ہوئے آپ کو اور ملک صاحب کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں۔ اپنے ملک صاحب سے کہو کہ میرا حصہ پابندی سے مجھے ملنا چاہئے۔ باقی سب ٹھیک ہے۔ میں یہاں تھانے میں بیٹھا ہوں ناں...... یہ تمام علاقہ جات اسی تھانے کی حدود میں آتے ہیں۔ کسی مائی کے لعل کی جرأت نہیں کہ ملک صاحب کی طرف یا پھر ان کے ڈاکوؤں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے!

اس طرح یہ سلسلہ کافی عرصے سے چلا آ رہا تھا۔ پھر رفیق سیال کو بدعنوانی اور رشوت ستانی کی بناء پر اچانک معطل کر دیا گیا۔ اس افتاد نے اسے ریڈ فائل سے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کی مہلت نہ دی۔ اس طرح دیگر فائلوں کے ساتھ ہی وہ فائل میرے حوالے میں آ گئی۔ رفیق سیال کے ساتھ تو ملک غفار کا گٹھ جوڑ چل رہا تھا لیکن نئے تھانہ انچارج ملک صفدر حیات...... یعنی مجھ سے اسے کوئی توقع نہیں تھی۔ ملک نے کسی طرح سابق تھانہ انچارج کو اپروچ کیا اور یہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کے خلاف تمام تر مواد کس فائل میں موجود ہے۔ چنانچہ ملک غفار نے خدیجہ اور مشتاقا کو بھیج کر، چودھری دلدار کے بندوں کے تعاون سے مذکورہ فائل حاصل کر لی۔

ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی اور وہ یہ کہ ملک غفار کو کیسے معلوم ہوا، اس کے ''کیس'' والی ریڈ فائل میں کس وقت تھانے والی الماری سے نکال کر اپنے کوارٹر میں لے جاؤں گا۔ میں نے یہی سوال قوبا سے کیا تو اس نے بتایا۔

''تھانے دار صاحب! میں تو اب دھوبی کا کتا ہو کر رہ گیا ہوں۔ آپ اور چودھری دلدار جو چاہیں، میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہیں۔ میں اس وقت آپ کو چودھری صاحب اور ملک صاحب کے بارے میں معلومات دے رہا ہوں۔ آپ کے قبضے میں میرا کیا حشر ہو گا اس کا اندازہ حوالدار کے ''رویے'' سے میں لگا سکتا ہوں۔ لیکن چودھری صاحب میرا کیا حشر کریں

گے اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔ میں آپ......''

میں نے اس کی طولانی تمہید کو قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے چودھری اور ملک کو تو میں ایسا سیدھا کروں گا کہ وہ کسی کی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کو بھی نہیں اُڑا سکیں گے۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ قانون کے ساتھ تعاون کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس تعاون کے بدلے میں، میں چودھری اور ملک کی طرف سے تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

''میں محسوس کر رہا ہوں، آپ ہی کے سائے میں مجھے پناہ مل سکتی ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''پھر فوراً میرے سوال کا جواب دے دو۔''

اس نے جواب دے دیا۔ قوبا کے مطابق، چودھری دلدار کا ایک وفادار میرے تھانے میں موجود تھا جو یہاں کی اہم خبریں چودھری تک پہنچاتا رہتا تھا۔ پہلے پروگرام یہ تھا کہ وہ ''کالی بھیڑ'' میری نگاہ بچا کر کسی طرح ریڈ فائل الماری میں سے نکال کر ڈیرے تک پہنچائے گی لیکن پھر اسی شخص نے اطلاع دی کہ تھانے دار صاحب دوسری فائلوں کے ساتھ مطلوبہ فائل کو بھی اپنے کوارٹر پر لے گئے ہیں۔ اس دوران خدیجہ اور مشتاقا ڈیرے پر پہنچ گئے تھے لہٰذا فائل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے فوری منصوبہ بندی کی گئی۔ خدیجہ کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ اس نے کس طرح بھرپور اداکاری کر کے میرے کوارٹر میں سے وہ فائل چرانی ہے۔ خدیجہ کو مصطفیٰ کی بیوی کا رول ادا کرنے کے لئے امتیاز نے کہا تھا۔ اس کی نظر میں یہ ایک طرح کی تفریح تھی۔ اسے یقین تھا، میں چونکہ اس تھانے میں نیا نیا تعینات ہوا ہوں۔ اس لئے مجھے خدیجہ (نوری) کے بیان پر کسی قسم کا شک نہیں ہو گا...... اور ایسا ہی ہوا بھی تھا!

قوبا یہ تفصیل بیان کر چکا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''قوبا! تم نے چودھری دلدار کے جس وفادار کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس تھانے کا اے ایس آئی شہزاد تو نہیں؟''

اس نے چوکنا نظر سے دائیں بائیں دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شہزاد اس وقت تھانے میں موجود ہے۔''

حوالدار جامی شاہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں موجود حیرت اور استعجاب سے میں اندازہ نہ لگا سکا کہ یہ انکشاف سن کر اسے یقین آیا یا نہیں مگر مجھے یقین کرنا پڑا۔ کیونکہ میں اے ایس آئی کے بارے میں پہلے ہی ایک خاص زاویے سے خود کو تیار کر چکا تھا۔ میں نے قوبا سے پوچھا۔

"تمہاری گرفتاری کے فوراً بعد شہزاد کو اس واقعے کی خبر ہو گئی تھی اور یقیناً اس نے اس بارے میں چودھری دلدار کو اطلاع پہنچا دی ہو گی۔ پھر ابھی تک چودھری تھانے کیوں نہیں پہنچا؟"

"چودھری صاحب صبح سے چک چھبیس گئے ہوئے ہیں۔ وہ احمد نگر میں نہیں ہیں۔" قوبا نے جواب دیا۔

"اوہ......" میں نے ایک طویل سانس خارج کی۔ "اب بات آ گئی سمجھ میں۔ میں بھی کہوں، اے ایس آئی اتنا مضطرب کیوں ہے؟"

حوالدار جامی شاہ نے شوخ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "ملک صاحب! میرے لئے کیا حکم ہے؟"

میں نے اس کی نگاہ میں پوشیدہ مہم جوئی کی خواہش کو فوراً پڑھ لیا اور کہا۔

"تم اے ایس آئی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ملک صاحب نے بلایا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے تم بھی آ جانا۔ پھر دیکھتے ہیں، اس غدار کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے!"

حوالدار جیسے ہی جانے کے لئے مڑا، کمرے کے باہر ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی تیزی کے ساتھ وہاں سے ہٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میری چھٹی حس نے فوراً خبردار کیا کہ دروازے کے قریب چھپ کر کوئی شخص ہماری باتیں سن رہا تھا اور وہ شخص میرے خیال میں اے ایس آئی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا!

حوالدار نے دروازے سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ وہاں سے فرار ہونے والا شخص بوکھلاہٹ میں کسی شے سے ٹکرایا اور خاصی بلند آواز ابھری۔ میں نے اپنی سیٹ چھوڑی اور تیزی سے باہر کی سمت لپکا۔ اگر وہ شہزاد ہی تھا تو اسے فرار نہیں ہونا چاہئے تھا۔

باہر کے منظر نے میری توقعات کو پورا کرتے ہوئے دل خوش کر دیا۔ حوالدار کو میں نے اے ایس آئی کے ساتھ گتھم گتھا پایا۔ میں نے چشم زدن میں اپنا سروس ریوالور نکال لیا اور کرخت لہجے میں کہا۔

"شہزاد! تمہاری اصلیت ظاہر ہو گئی ہے۔ کوئی "مستعدی" دکھانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تم خود کو زیرِ حراست سمجھو!" پھر میں نے تحکمانہ انداز میں حوالدار سے کہا۔

"جامی شاہ! اس بدبخت کو گرفتار کر کے حوالات میں پہنچا دو۔"

اس اٹھا پٹخ کی آوازیں سن کر تھانے کا تمام تر شبینہ عملہ موقع پر جمع ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اے ایس آئی شہزاد کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا جا چکا تھا۔ میں نے جامی شاہ کو

ہدایت کی کہ وہ قوبا کو حوالات کے دوسرے کمرے میں بند کر دے۔ میں واپس آ کر سب کا حساب کتاب کروں گا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں ملک صاحب؟" جامی شاہ نے چونک کر مجھ سے پوچھا۔

"ایک انتہائی ضروری کام کرنے۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "اور اس دوران یہ تھانہ تم سنبھالو۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

✽✽✽

ریڈ فائل میری کسٹڈی سے چوری ہوئی تھی اور اسے واپس لانے کا فرض بھی مجھ پر ہی عائد ہوتا تھا۔ اگر ملک غفار اس فائل کو تلف کر دیتا تو یہ میری نالائقی اور فرائض سے غفلت میں شمار ہوتا۔ مجھے یہ کسی بھی قیمت پر منظور نہیں تھا کہ میرے ریکارڈ پر ایسا کوئی بدنما دھبہ نمودار ہو۔ ایک بات یقینی تھی کہ مشتاقا نے مذکورہ فائل ملک غفار تک پہنچا دی ہو گی۔ میں نے احمد نگر شمالی سے روانہ ہوتے وقت کانسٹیبل مصطفیٰ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا اور اس وقت رات کے آخری پہر میں ہم دو گھوڑوں پر سوار ہو کر موضع جنڈیالہ کلاں کی طرف رواں دواں تھے۔ راستے میں، میں نے مصطفیٰ کو تھانے میں پیش آنے والے تمام سنسنی خیز واقعات سے آگاہ کر دیا تھا۔

اذانِ فجر سے پہلے ہم موضع جنڈیالہ کلاں پہنچ گئے۔ ملک غفار کو قابو کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن قوبا اور اے ایس آئی شہزاد کی صورت میں اس کے خلاف میرے قبضے میں دو ایسے افراد موجود تھے کہ اس کی پیش نہ چل سکی۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے میں ملک غفار کو پوری طرح "رام" کر چکا تھا۔ ملک ہی کی نشان دہی پر مشتاقا اور امتیاز کو بھی ڈیرے سے گرفتار کر لیا گیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ریڈ فائل ابھی تک محفوظ تھی جس کے حصول کے لئے میں نے یہ کٹھنائی اٹھائی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اسی فائل کو قبضے میں لے کر دیکھ ڈالا۔

ملک کی بدقسمتی کہ اس نے ابھی تک فائل کو ضائع نہیں کیا تھا۔ مزید بدقسمتی یہ کہ مشتاقا کی صورت میں ملک کے ایک اور سنگین جرم کا ثبوت میرے ہاتھ لگ گیا۔ ملک کی معتوب خدیجہ کو مشتاقا نے ملک ہی کے حکم پر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں تمام متعلقہ جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ ملک غفار اتنا بے حس اور سفاک شخص تھا کہ اس نے خدیجہ کو "سزائے موت" دینے کے ساتھ ہی بہلا کر اس سے فائل کی چوری جیسا مشکل اور خطرناک

کام بھی لے لیا تھا۔

ملک غفار کو جب اندازہ ہو گیا کہ وہ بری طرح قانونی شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے اور میں کسی بھی طور پر اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں تو وہ مجھے بڑے بڑے افسروں سے اپنے تعلقات کی دھمکیاں دینے لگا۔ لیکن میں اس کی کسی دھونس یا دھمکی میں نہ آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے ایک دم نرم پڑ گیا اور لجاجت سے بولا۔

''ملک صاحب! اپنے خاندان اور ذات برادری ہی کی لاج رکھ لیں۔ میں بھی ملک ہوں اور آپ......''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے درشتی سے کہا۔

''مجھے گالی نہ دو غفار! تمہارے کالے کرتوتوں کو دیکھ اور سن کر بہت سے ملکوں کی گردنیں ندامت سے جھک جائیں گی۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''عدالت تو تمہیں بعد میں سزا دے گی لیکن اگر تم نے میرے ساتھ اپنے خاندان کو ملانے کی کوشش کی تو تمہاری تشریف مبارک پر اتنے جوتے برساؤں گا کہ تم بے دُم کا بندر نظر آؤ گے۔''

وہ ویران ویران سی نظروں سے یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''غفار! تمہارے جیسے کردار کے مالک لوگوں کا کوئی خاندان، ذات یا برادری نہیں ہوتی۔ تم ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے کرتے انہی کے خاندان، ذات اور برادری میں شامل ہو چکے ہو۔ میری نگاہ میں تم ملک غفار آف جنڈیالہ کلاں نہیں، بلکہ معزز ڈاکو آف گھنے جنگلات ہو۔ تمہیں میں کس طرح چھوڑ دوں۔ تمہاری انگلی پکڑ کر ہی تو میں نے ڈاکوؤں کے اس گروہ کو حوالات میں بند کرنا ہے جن کی کمائی کھا کھا کر تم اینٹھتے اور اینڈتے رہے ہو۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے ناں معزز ڈاکو؟''

میرے اس استفسار کا اس کے پاس جواب موجود تھا لیکن وہ لاجواب سا ہو کر ایسی بے یقینی سے مجھے دیکھتا چلا گیا جیسے اس کے سامنے کوئی تھانہ انچارج نہ ہو، کوئی نہایت ہی خوف زدہ کر دینے والی شے ہو۔

ہو سکتا ہے اسے میری یعنی ملک صفدر حیات کی صورت میں ملک الموت کی شبیہہ دکھائی دے رہی ہو!

(ختم شد)